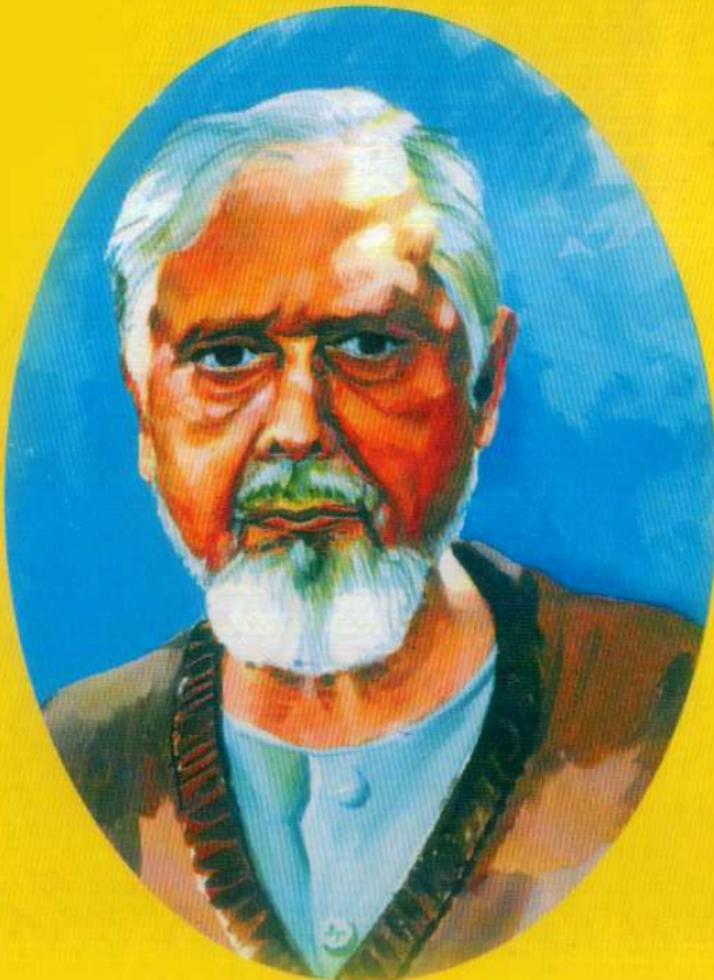


# سُرخ فیتہ

یا خدا، ماں جی، نفسانے، سرخ فیتہ

قدرت اللہ شہاب



## ترتیب

|     |   |
|-----|---|
|     | <u>اس کہانی کی کہانی</u>  |
| ۱۱  | جو قدرت اللہ شہاب سے خاص اس بیویوں کیلئے کہی ہے<br><u>یا خدا</u>  |
| ۱۶  | <u>رب المشرقین</u><br>تری دنیا میں میں حکوم و مجبور               |
| ۳۱  | <u>رب المغاربین</u><br>مری دنیا میں تیری پادشاہی                  |
| ۵۵  | <u>رب العالمین</u><br>محظی فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا، |
| ۷۳  | دیساپرہ (مال جی)  |
| ۸۱  | مال جی  |
| ۱۰۷ | اقبال کی فریاد  |

|     |                   |
|-----|-------------------|
| ۱۱۳ | آثارِ قدیمیہ      |
| ۱۱۹ | اسے بنی اسرائیل   |
| ۱۳۳ | ایک پندرہ         |
| ۱۳۴ | ثیر بیلینز        |
| ۱۵۳ | پکے پکے آم        |
| ۱۶۳ | چھوڑ سے والی ناہگ |
| ۱۶۹ | سینو گرافر        |
| ۱۹۱ | شلوار             |
| ۱۹۹ | چک چک             |
| ۲۰۹ | آپا               |
| ۲۱۶ | تماش              |
| ۲۲۶ | دوزنگا            |
| ۲۲۶ | جلتہنگ            |
| ۲۲۵ | لے دے             |
| ۲۵۳ | کراچی             |
| ۲۵۹ | پشاور پیک         |
| ۲۶۱ | آپ نیتی           |
| ۲۶۹ | اور عائشہ آگئی    |
| ۲۹۳ | غم جانان          |

ریلوے جنگش

سردار جہونت سنگھ

سرخ فینہ

ایک ڈسیچ

۲۹۹

۳۰۶

۳۱۶

۳۲۹

# مہاجرین کے نام

جو ابھی بقیہ حیات ہیں  
لیکن تمہان کی زندگی کا شعور نہیں رکھتے

## اس کہانی کی کہانی

ستمبر، ۱۹۶۴ء کا مہینہ تھا اور ہندوستان سے ٹوٹ پڑ کر آنے والے مجرد حفاظوں کا تابندھا ہوا تھا جو پہلے آگئے تھے وہ بعد میں آئے والوں کے انتظار میں ہزاروں کی تعداد میں ولگہ بارڈ پر کھڑے رہتے تھے کسی کی ماں، کسی کا باپ، کسی کا جانی اور کسی کا بیٹا، ولگہ پارکی بے کار پینٹانی میں گھر تھا۔ اکثر کایہ انتظار موہوم ثابت ہوتا۔ بعضوں کو فقط اپنے پیار دل کے جانکروں انجام کی خبر ملتی۔ کچھ خوش قسمت ایسے بھی تھے کہ خستہ و خراب عوریزوں کو پالیتے تھے لیکن کم۔ یا وہ دنامرا منتظرین کے چہروں کی خستگی دیکھنے کی ہوتی تھی۔

یہ بھی انتظار کرنے والوں میں تھا۔ اپنے چھاناد بھائی نعمت اللہ شہزاد کا انتظار کرتے کرتے ہیری آنکھیں پھر رگنی تھیں۔ نعمت اللہ ہیری چھاناد بھائی ہی نہ تھا، ولگو شیادوست بھی تھا جس کے ساتھ چکور کے سکول میں میں نے کیا کیا دھو میں نہ مچائی تھیں۔ اب وہ ایک دیرہ میں سکول میں انگریزی کام اٹھاتھا اور اپنی سبک نیں لفتشے والی ہیوی کے ہمراہ کہیں پھر کے رو گیا تھا۔ وہ زندہ تھا یا کشتوں میں شامل ہو گیا تھا یا کسی کمپ میں پڑا ایڑیاں رگڑ رہا تھا، مجھے کچھ خبر نہ تھی۔ بہر حال مجھے اس کا انتظار تھا۔ یہ اس کا رشتہ بھی خوب ہے۔ ٹوٹ کر بھی نہیں ٹوٹتا۔ آخر وہ ایک

روز آیا، لیکن میں اُس سے نہ پوچھانا۔ لوگوں کو تجسس دیکھنا ہوا میں اس کے پاس سے دو تین بالگز رکیا، آخر اُس نے خود مجھے قدرت کہہ کر آواز دی۔

یہ نعمت اللہ کوئی اور نہ تھا، اس بیش مکملہ الجیلیے حیان کی جگہ ایک صدیوں کا ماندہ ٹبلیوں کا ڈھانچہ، بس خون آلو و چہرہ غبار آلو۔ میں نے پوچھا۔ «نعمت! بھائی کہاں ہے؟» وہ رو ویا اور اپنے پاس پہنچی عورت کی طرف اشارہ کیا۔ اس عورت کا چہرہ داغ داغ تھا، صبح چھوڑ کی کھال جیسے جلتی ہوئی آہنی سلاخی سے داغ دی گئی ہو، جو ابھی میں تھا۔ اس ہمت اور غیرت والی خاتلوں نے اپنا چہرہ خود داغا تھا تاکہ کمیپ میں آنے والے شکاریوں کی نظر جو سے محفوظ رہے۔ وہ چہرہ نہ داغتی تو اس وقت ولگ کے اس پارندہ ہوتی اور اب تک غالباً اس کا سلا جسم داغ چکا ہوتا۔ نعمت اللہ کا یہ عالم اس طرح ہوا کہ چند سو رواؤں نے کمیپ کے کنوئیں میں نیلا نہتوں تھاں مول دیا تھا۔ بعضے اس آب حیات کوئی کمیپوں میں زندہ جاوید ہو گئے نعمت اللہ ان میں سے تھا جن کی آنتیں اس مشروب سے کٹ کر گئیں۔ نعمت اللہ اسی روز اس ارض میوندو میں پہنچنے کے چند گھنٹے بعد باری حیات آتا کہ بس کار ہو گیا۔ وہ عفیفہ، اس کی بیوی تیسرے روز چل بسی اور میں جو اتنے دنوں سے منتظر تھا، غالباً تھک لاچی والپیں آگیا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں لارنس روڈ کے ایک بنگلے میں رہتا تھا لاتھریں کی روشنیاں جلتی رہیں اور رات بھر فیض بیٹھا یہ کمانی لکھتا رہا۔ نعمت اللہ کی کمانی۔ اپنے گاؤں چکلور کی کمانی۔ اپنے گاؤں کے ملاعلی بخش کی بیٹی دشاد کی کمانی کمیپوں کا حال جو میں نے لکھا ہے، لاہور میں دیکھا۔ مہاجر بہنوں کا شکار کرنے والے بہت سے بھائی جن کے چہرے یا خدا میں نظر آئیں گے۔ مولوی، خدامِ خلق، قوم کے لیڈر اور سیاست دان، بھی اصل کردار میں۔ میں نے ان کے نام نہیں لکھتے۔ ان میں ایک صاحب کو ترددانے وزیرِ ملکت بھی بنایا۔ خدا جس سے چاہے ہو عزت دے دے اس کی مصلحتیں وہی جانے۔

اس کمانی کا انجام بھی میرے ذہن نے نہیں سوچا۔ اسے میری گنگا رائے کھوں نے۔

کراچی کے عیدگاہ میدان میں دیکھا جہاں بے خانمانوں نے ڈیرے ڈال رکھتے تھے۔ یہیں دلشاو، یا اس نام کی عورتیں مجھے پکوڑے تلقیٰ ہیچتی نظر آئیں۔ ساتھ والی سے کہا ہے ہم ذرا میرے پختے کا دھیان رکھنا، میں میں لے آؤں؟ اور کسی کے ساتھ میں لینے چل دیں۔ یہ پکوڑے برسوں تک جلتے رہے اور کتنے رہے، شاید اب بھی ان میں سے باقی ہوں۔ یہ پختے اب تیرہ چودہ برس کے چونہار قلیٰ، مزدُور یا بھک منگے، اس ارضِ موعود کے شہر یوں میں شامل ہیں۔

۳۴۹ ادا بھی ختم نہیں ہوا۔

اس کہانی کی کہانی بھی ختم نہیں ہوتی۔

کراچی کے بعد میرا تقریباً ہور میں محکم صنعت کے ڈائرکٹر کے طور پر ہوا۔ ایک روز ڈاک میں ایک پھٹا پڑانا پیلا لفافِ مجھے ملا۔ سواد تحریر قطعی طور پر اجنبی تھا۔ میں نے کھولا، یہ ایک لڑکی کی داستان تھی جو یہ دنہا بے یار و دکارا چھرو کے قریب ہمارجن کی جھونپڑیوں میں رہتی تھی۔ اس نے لکھا کہ میرا جسم و اغائلیاں میں اس پار پہنچ گئی۔ یہ دھرمی میرے سے یہے فروع کی نہیں اور یہاں مسلمان مجھے شفیق بھائی دکھانی دیتا تھا لیکن یہ بھائی ہوں ناک شکاری نکلے۔ انہوں نے میری جو خاطر مدارت کی ہے، اس کے طفیل میں تپ دق کی مریض ہوں اور میرے بہت دل باقی نہیں تھوڑا پڑھی نکھلی ہوں۔ یا خدا، کہیں سے مل گئی تھی میں نے پڑھی مجھے یہ کہنا ہے کہ میں دلشاو بن کر بھی دلشاو نہ بن سکی۔ تیراں مجبوروں میں سے ہوں جو ہنسی خوشی پکوڑے نہیں تل سکتیں۔ بیس نہیں لاسکتیں اور اس پاک سرزی میں سینکڑوں شاید ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔

میرے پاس ایک لمبی سی شورایستہ کار تھی۔ اُن دنوں اس کی قیمت سنتی اور شان زیادہ تھی..... اس سے میں نے ان جھونپڑیوں سے دُور ٹرک پر چھوڑا، اور لوچھتا پچھا ناٹھونڈا۔ ایک ٹاٹ کی جھگی میں پہنچا دہاں ایک دیرانہ بکھوں والی، میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس تھی۔

تھی۔ لڑکی کیا تھی را کہ کاٹھیر پا چوبی شکھ سحر۔ لگ کے ال جسے کارروائی روائہ ہوا۔  
 راستے میں کوئی زیادہ باتیں نہیں ہوتیں۔ ایک بار اس لڑکی نے لمبی آہ بھری، اور کہا  
 شہاب صاحب۔ میں اس سے زیادہ لمبی اور بیکھیل کارروائی میں سوار ہو چکی ہوں جن دنوں یہاں  
 کیمپ میں تھی اور انھی کارروائیں والپس کیمپ میں سنبھ جاتی تھیں۔  
 اس لڑکی کا علاج ہو گیا۔ اسے ایک چھوٹا سامان کا ان بھی مل گیا اور تھوڑا بہت روزی کا  
 دسیلہ بھی ہو گیا اور میرے ذہن سے یہ واقعہ نکل گیا اور میں ایک بار پھر کریمی میں ایک لوگوں  
 پر چلا گیا۔

ایک روز میرے چھپر اسی نے ایک کاغذ کا پر زہ لا کر دیا کہ ایک صاحب آپ سے بلنا  
 چاہتے ہیں، ان کے ساتھ ایک بر قدر پوش خاتون بھی ہیں۔ نام ان صاحب کا میرے لیے اچھی  
 تھا۔ میں نے انھیں اندر بلایا اور کہا معاشر کیمپ میں آپ کو ہبھانا نہیں۔ ان صاحب نے سکرا  
 کراس بر قدر پوش خاتون کی طرف اشارہ کیا جس نے اب نقاب الٹ دیا تھا۔ یہ ایک چمپتی  
 رنگ کی شعلہ رنسار خاتون تھی۔ اس نے کہا، میں اچھوڑ کی جگہ میں رہنے والی دشاد ہوں ہو دشا  
 نہ بن سکی۔ یہ میرے میاں ہیں۔ اور میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں کیون کہ میں پھر زندوں  
 میں ہوں۔

رات کو یہ لوگ میرے بار کھانے پہنچے۔ دوسرا روز پھر دس کروڑ آبادی میں گم  
 ہو گئے اور اس پر کئی سال گز رگئے۔

پہچلنے دنوں۔۔۔ ابھی چند ماہ پہلے کی بات ہے کہ میں صدر پاکستان کے ہمراہ مشرق  
 وسطی کے دورے کی ایک منزل وہران میں آتیا۔ یتنیل کام کرنے ہے اور امریکہ کا ایک اہم فوجی  
 اڈہ ایمان حسبِ رسم چارا تعارف مقامی عہدہ داروں اور معززین سے کلایا۔ انہی میں

ایک صاحب پاکستانی تھے، ریشمی صافہ باندھے ہوئے، انھوں نے کہا شہاب صاحب آپ مجھے پہچانے؟ میں نادم ہوا تو بولے میں آپ سے کراچی میں ملاحتا اور یہ میری بیوی ہیں۔ انھیں آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔

یہ وہی خالون تھی لیکن اب پہچان نہیں جاتی تھی۔ چھر سے پر جوان کے علاوہ خوشحالی کی اسودگی اور طلائیت کا نور تھا اس نے بتایا کہ اب ہمارا تین سال کا ایک بچہ بھی ہے۔ اس کتاب کے لکھنے جانے کے چودہ سال بعد مجھے یقین ہو گیا کہ مت کے بعد تو نہیں البتہ اس ارضی زندگی میں آؤ گوں کا چکر ہڑد رچلتا ہے۔ زندہ انسان آخری موت سے پہلے کتنی مرتبہ مرتا اور کتنی بار نیا جنم لیتا ہے۔

**کشتگار خجڑ سلیم را** ہر زمان از غیب جلنے دیگر است  
 جب میں دشاد کی زندگی کو خانقاہِ تنقیدوں کے پشتارے کے سامنے تو لٹا ہوں جاس کتاب پر چھپیں تو مجھے یہی زندگی بھاری نظر آتی ہے۔ بہت لوگ اس کتاب کے چھپنے پر مجھے ناخوش ہوئے اور مجھے بہت سے طعن سننے پڑے لیکن اس روشن پیشان اور صبغ چھر سے کے مقابلے میں جو مجھے وہر ان میں نظر آیا۔ ان کی کیا حقیقت ہے۔ اگر چہاں نتیجے کو بھی میں ضمنی سبی مجھتا ہوں۔ مجھے تو فقط اپنے یار جانی اللہ اور اس کی شبک چھرو بیوی کی کمانی لکھنی تھی جن کے انتظار میں میں ہفتلوں والگر کے بارڈر پر کھڑا رہا۔ اور جن کی تلاش میں میں نے وہ سب کچھ دیکھا جو ہزار کوشش کے باوجود بھی میرا قلم پوزی طرح لکھنے سے قاصر رہا۔

قدرت اللہ شہاب  
 ستمبر ۱۹۶۱ء

رَبُّ الْمَشْرِقِينَ

تری دُنیا میں میں مُحکوم و محبور

”اُس طرف کیا تھتی ہے، سالی؟ تیرا کوئی خصم ہے اور صریح؟“ —

امریکہ سنگھنے کرپان کی نوک سے دشاد کی پسلیوں کو گردگدا یا، اور بایان گال کھینچ کر اس کا مسئلہ پھرم سے پُرب کی طرف گھما دیا۔

دشاد مسکرا دی۔ یہ مسکرا ہٹ، اُس کا خاصہ بن گئی تھی۔ پچھیں میں اس کا کامیاب تین ہتھیار اس کا رونا تھا۔ ایک دراسی بینیں، ران ران کر کے وہ ماں کے سینے میں چھپائے ہوئے دودھ سے لے کر الماری میں رکھی ہوئی ترقی نہک ہر چیز کو مصالح کر لیا کرتی تھی۔ اب جوان نے اس کی مسکرا ہٹ میں اڑ پیدا کر دیا تھا۔ اس نئے جادو کا علم اس کو اس وقت ہوا جب اس کی ایک مسکرا ہٹ پر شادر ہو کر رحیم خاں نے قسم کھائی تھی کہ اگر چاند یا سورج یا تارے بھی اسے اٹھلے جائیں تو وہ ارض و سماں و سعین پھاند کر اسے چھین لائے گا۔

رحیم خاں جھوٹا تھا۔ مکار کہیں کا۔ آسمانوں کی بات تو قدر کی بات تھی وہ تو اسے نہیں ہی پکھو بیٹھا۔ دشاد اندر بچلے چاکر قبلہ رو ہو بیٹھتی تھی اور خیال ہی خیال میں اپنی جبیں کو اس آستن نے پر جھکا دیا کرتی تھی، جس کے دامن میں حمتلوں اور حمتتوں کی ایک بے کلام دنیا پوشیعہ

بتانی جاتی تھی۔ مغرب کی طرف کعہ تھا۔ کعبہ اللہ میاں کا اپنا گھر تھا۔ اس گھر کا تصدیق دشاد کے ذلیل میں عقیدت اور امید کا ایک تابناک چراغ روشن کروتا تھا۔ لیکن امریک سنگھ کو پچھم سے بے حد چڑھتی۔ یوں بھی سکھوں کی اس بستی میں چند رواج بڑے طیار ہتھے، ایک کریلا دوسرے نیم چڑھا۔ پارہ سے بارہ بجتے تک آن کے اعصاب کمان کی طرح تھے رہتے تھے اور یوں معلوم ہوتا تھا کویا کسی نے بستی بھر کے پھول، جوانوں اور بُوڑھوں کو سمجھی کے تاریخ پر وکر بر قا دیا ہے۔

امریک سنگھ کا گھر مسجد کے عقب میں واقع تھا۔ اس مسجد کے دامن میں ایک بھی انہک ساواہ پرورش پارہ تھا۔ گاؤں بھر میں یہ بات بھیل، ہی تھی کہ سر رشام ہی مسجد کے کنوئیں سے عجیب عجیب ڈرائقی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں۔ — جیسے دو چار بکریوں کو بیکت ذبح کیا جا رہا ہو۔

”سالا حرام“ امریک سنگھ کا کرتا تھا۔ ”مرنے کے بعد بھی فکر رہا ہے، بھینے کی طرح۔ ڈال دو پکھڑ کرے کوڑے کے کنوئیں میں“  
”ارے چھوڑ دبھی“ امریک سنگھ کا بھائی ترلوک سنگھ مذاق اڑاتا تھا۔ ”بائگ دے لے ہے ملا بانگ“  
دریا ر سنگھ بھڑے پھاڑ کر ہنستا۔

لیکن امریک سنگھ کی بیوی ڈرتی تھی۔ رات کو سنائے میں جب مسجد کا کنوں ملا جاڑ کر چکھاڑتا، تو اس کا قن بدن ٹھنڈے پیسٹے میں شرلوور ہو جاتا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ملاعل بخش کی تصویر آجائی، جو مسجد کے چھرے میں رہا کرتا تھا، بخیف بدن، دوڑ تھی کی لمبی رعنی، آنکھوں پر موٹے گلاس کا چشمہ، سر پر سینہ ملک کی بے ڈھب سی پیڑھی، ہاتھوں میں رعشہ، گردن میں ابھری ہوئی لگن۔ لیکن جب وہ صحن میں کھڑا ہو کے پرانج وقت اذان دیتا

تو مسجد کے گیند گونج اٹھتے اور علی بخش کے شیف و نذر حال گھکھ سے وہ زناٹ کی آواز لختی چیسے بہت سی آبشاریں دست بدماں ہو گر گونج رہی ہوں۔ اذان کی آواز سے امریکہ سنگھ کی ہیوی کوہنی کوفت ہوتی تھی، ایک وقت یادو وقت کی بات ہوتی تو خیر لیکن جب دن بھر میں پانچ بار اُسے ہی بول سنتا پڑتے تو وہ مجرما جاتی۔ اس نے بڑے بڑے گوں سے من رکھا تھا کہ اذان میں کامے جادو کے بول ہوتے ہیں اور جو ان عورتیں اسے من کر، باہمی جاتی ہیں۔ اگر بن بیا ہی نو خیر لڑکی باہمی جاتے تو اُس کے باخچے ہونے کا ذریحہ۔ اگر بیا ہی ہوئی ہیوی باہمی جاتے تو اُس کے حل گرنے لگتے تھے اچانچہ امریکہ سنگھ کے گھر میں پشت ہالپشت سے یہ رسم تھی کہ ادھر افان کی آواز فضائیں لمبائی اُدھر کسی نے کٹوارے کو چھپے سے بجانا شروع کیا۔ کسی نے چھپتے سے لڑایا۔ کوئی کانوں میں انگلیاں ٹھوں کر پیٹھ کئی، کوئی چھاگل کر بھل کوڑھی میں جا گھسی۔ اور اس طرح بہاء خاندان اپنی لاٹلیوں کی کوکھ کو کامے جادو کے اثر سے بچا کر ہر بھرا رکھتا آیا تھا۔

امریکہ سنگھ کی ہیوی کے بطن میں سوالا کھ خالصے پرورش پار ہے تھے۔ سکھوں کی گنتی میں ایک سکھ سوالا کھ انسانوں کے برابر شمار ہوتا تھا۔ آدھی رات گئے جب مسجد کا کنوں امریکہ سنگھ کی ہیوی کے تصور میں بھیانک اور جو ناک گونج بن کر ڈکاتا تا تو اس کے پیٹ میں خالصوں کی یہ بہادر فوج ہٹرلوگ میانے لگتی۔ کبھی اس کے کانوں میں کنوں کی چنگھاڑیں جگر خراش انداز سے گونجتیں۔ کبھی اس کے تصور میں کنوں کا دہانہ جبڑے بھڑا کر اس کی طرف پیکتا اور ہر وقت اسے یہ دھڑکا ساگھا رہتا کہ ماعلی بخش کنوں کی دیوار کے ساتھ رینگتا ہوا باہر کل رہا ہے اور چشم زدن میں کنوں کی منڈی پر کھڑا ہو کر نہ جانے کس وقت اسے "ہانگ" کے رکھ دے گا۔

امریکہ سنگھ کی بہن کے بطن میں تو بھی کسی خالصے نے اپنالھر نہیں جایا تھا۔ کیونکہ ابھی وہ بن بیا ہی تھی، لیکن اس کے دل پر سوالا کھ کا قبضہ تھا رات کو جب وہ اپنی چار پانی

پر لبیت کر ان میٹھی میٹھی گدگدیوں کریا درتی جو مکنی کے کھیتوں کی اڈت میں سوا لاکھوں کی بھوکی  
انگلیاں اُس کے تن بدن کو چھلنی بنائے رکھ دیتی تھیں تو اس سکینے میں ارمانوں کا ایک  
ہجوم سا آمد آتا اور وہ تصویر میں اپنے جسم کو جوان جوان، قوی قوی خالصوں کے وجود  
سے آباد کر دیتی — لیکن پھر سجد والے کنوں کی دل دوز چنگھاڑا اس کے الیوان  
تصویر کو مسماڑ کر کے رکھ دیتی اور معاً اُس سے محسوس ہوتا کہ کنوں کی عینیگ گھرائی سے بھی ملا  
علیٰ بخش کا لے جادو کے بول پکار پکار کر اس کے پیٹ سے چلنے والی نسلوں کے ناکے  
بند کر رہا ہے۔

امریک سنگھ کو اپنی بیوی اور بیٹن دونوں پر ختمہ آتا تھا۔ بزرگی کی بھیاں ملائی بخش  
تو کب سے ورد فان ہو چکا تھا۔ جس روز وہ کنوں کی منڈیر پر بیٹھا وضو کر رہا تھا امریک سنگھ  
نے خود اُسے نیزے کی نوک پر اچھا لایا تھا لیکن اُس کو اپنی تلوار پر آزما یا گلیا دربار  
سنگھ نے اُس کے جھنجھناتے ہوئے خون آلود جسم کو تراخ سے کنوں میں بھینک ڈالا۔  
ایک ملائی بخش ہی پر کیا سخت تھا۔ اب تو چکور کا سارا گاؤں صاف ہو چکا تھا باس  
دیتے اور سنتے والوں کا وجود ناپید ہو گیا تھا۔ کچھ بھاگ گئے تھے، کچھ مر گئے تھے اور ہتھ  
کی گردن پر خالصوں کی مقدس کپڑائیں سمجھہ ریز ہو چکی تھیں — لیکن یہ ڈرپوک  
حرام زادیاں تھیں کہ اب جھی وہی بانگوں کے ڈر سے اپنے بچہ والوں کو چھپائے چھپلے کے  
پھرتی تھیں۔ چنانچہ جب امریک سنگھ کی بیوی اور بیٹن سوتے سوتے چیخ کر چھاتیاں  
پیٹنے لگتیں تو اس کا دل طیش سے جل کر کباب ہو جاتا اور وہ چھٹا اٹھا کر انہیں مار مار کر  
لوہا مان کر دیتا۔ مارتے اس کے ہاتھ شل ہو جاتے، بازوؤں میں تھکن آجائی،  
رگیں بچوں جاتیں اور وہ اپنی گنجان دار طبی سے پسینے کے قطوفوں کو جھاڑتا ہوا دیلوں  
کی طرح لپک کر دشاد کے پاس چلا جاتا۔ جس طرح دامی رکام کا مریض دماغ کی بریش  
کو بلکا کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً نسوار سونگھ لیا کرتا ہے، اسی طرح گاؤں بھر کے

خالصہ اپنی وہم آؤ دیوں اور بہنوں سے بھاگ کر اپنے بدن کا فشارِ خون دھیکرنے کے لیے دشاد کے پاس چلے جایا کرتے تھے۔

دشاد کو مسجد میں رکھا گیا تھا کیونکہ جھجڑے کی چھت جمل جلا کر گھپلی تھی۔ یوں قماں کے سرما نے میں حبسم بھی تھا اور جان بھی۔ لیکن اُس کا عزیز ترین سرمایہ اس کے آبا کی تسبیح تھی۔ ملا علی بن خش کے ہاتھ اسی تسبیح پر گھومتے گھومتے اڑ رہے ہو گئے تھے۔ پتھر کے گول گول دانوں پر اس کی انگلیوں کے نشان نقش فریادی کی طرح پیوست تھے۔ سالہ ماں کے گرینیم شیمی اور فقانِ محرومی کے آنسو اس تسبیح میں موڑتیوں کی نظر پر دئے ہوئے تھے۔ یہی چند موئی تھے جن کے وجود سے دشاد کا ٹھاہوا صدقہ اپنے بنا کا بادھتا۔ — وہ دن بھر اس تسبیح کی گلے میں ڈال کر قیض کے نیچے چھپائے رہتی تھی لیکن شام پڑتے ہی اسے کسی دیران کرنے میں وبارتی تھی، کیونکہ اُسے ڈر تھا کہ کہیں بھٹک اور شراب میں سموئی ہوتی زبانیں اس کے آبا کی انگلیوں کے نقوش کو بھی بچاٹ چاٹ کر ناپاک نکر دیں۔

اُدھی آدھی رات گئے وہ مسجد والے کنوں کی منڈپ پر بیداری کرنی تھی۔ اس کی انگلیوں میں ٹھنکی لگاتے پک جاتی تھیں کہ شاید کبھی اس کے آبا کی تیرتی ہوئی پچڑی کی ایک جھلک اُسے دکھاتی دے، اسی کے کان کنوں کی طرف لگنے لگے تھک جاتے تھے کہ شاید کبھی اُس کے آبا کی آخری سسکی اُسے ایک بار پھر شانی دے یا وہ خوفناک چنگھاڑیں جھوٹے نے گاؤں بھر کی عورتیوں کو پریشان کر رکھا تھا، شاید اس کے منتظر کافنوں کو بھی نوازیں — لیکن کنوں تاریک تھا اور قبر کی طرح خاموش۔ جب کوئی آوارہ چمگا دڑاں میں پر پھر پھر لٹھتا تو۔۔۔ ہر پھر پھر لٹھتا کے ساتھ بدبواد تھعن کے تیز تیز چھپکے فضایں منشر ہو جلتے تھے۔ کیونکہ سوالا کھڑہ بہادروں نے ملائی خش کھلما رنے کے بعد بھی بند رکھنے کے لیے کنوں کو غلط اور کوڑے کر کٹ سے اٹاٹی بھردیا تھا۔

دشاد کا وجود ایک ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح تھا کہ جس کے ٹھنکے احسان کے

ویرا ازوں میں اکیلے ہی اکیلے بھٹک رہے ہوں۔ آسمان کی بساط اُنٹ چکی تھی۔ سورج اور چاند چھپ گئے تھے۔ تاروں کے چراغ بُجھ گئے تھے اور وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ بے بار و مددگار۔ مسجد کے دروازے کے ساتھ لگی ہوئی، سمی ہوئی، حیران...۔۔۔ بلکن اس کے درمیں سجد پھر آباد ہو گئی تھی۔ لوگ باریاں باندھ باندھ کر وہاں آتے تھے اور جب وہ بہادر خالصے محارب کے اپنے بیٹھ کر شراب کا دھیا کھولتے اور دشاد کی بڑیں کو تجوڑو چھوڑ کر کھانے کی گوشش کرتے تو گویا انھیں یہ فخر ہوتا کہ وہ گن گن کر ساڑھے تیرہ سو برس کی اذالوں اور نمازوں کا بدلہ چکا ہے ہیں۔ چکور کی مسجد گور دواروں سے بھی زیادہ آباد ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ گاؤں کی بیانی ہوئی اور بن بیان ہی ماڈن کو یہ احساس ترانے لگا کہ مٹا علی بخش کے بعد ملا علی بخش کی بیٹی ان کی کوکھڑو مٹنے پر مٹی ہوئی ہے۔ وہ تو چھپتے کھا کھا کر اپنی چار پائیوں سے لگا کر سو جانی تھیں لیکن ان کے بہادر خالصے رات رات بھرو شارکے ساتھ اپنی آنے والی نسلوں کا سودا لیا کرتے تھے۔

امریک سنگھ، امریک سنگھ کا باپ، امریک سنگھ کا بھانی۔ ایک خالصے کے بعد دوسرا خالصہ، دوسرا خالصے کے بعد تیسرا خالصہ۔۔۔ رات بھرو نظریں پچاپا کر، موقع جا پنچ جا پنچ کر مسجد کے آتلے نے پر حاضری دیتے تھے۔ بھنی ہوئی ٹیکھی اور گردے اُتھے۔ تئے بھوئے کبابوں کا دو رچلتا۔ شراب اور بھنگ کی بالیاں مٹیں اور اپنی نسل بندی کے وہ یونج جن کوہرا بھرا رکھنے کے لیے ان کی بیویاں سو سو طرح کے جتنی کرتی تھیں، وہ بلا دریغ مسجد کی چار دیواری میں بھیرتا۔۔۔ اور ایک دن بیٹھے بھٹلتے یکاکی دشاد مرسوں کی طرح پھوٹوں اٹھی۔ جب یہ خبر پھیلی تو گاؤں میں اُنگ سی لگا گئی۔ بیویوں نے یعنی یونج کا پناہ سر پیٹ لیا۔ کنواری اٹکیوں نے رو رو کرائیں سچالیں اور کمٹی کے کھیتوں میں چھپ چھپ کر اپنے خالصوں سے مٹا چھوڑ دیا۔ کنوبیں کی چنگھاڑیں تیز تر ہوئے لگیں۔ گھروں میں فٹ پڑت آنے لگے۔ چھپتے پر چھپتے چلنے لگے، ایک کہرام سامچ گیا۔

پہلے تو سب کی یہ راستے ہوئی تک پیدا ہونے سے پہلے ہی دشاد کو مار کے کنوبیں

میں پہنچنے کا بھروسہ تھا جو اس کے لئے مفید تجویز سمجھی۔ اُم کے آگم گھنٹیوں کے دام، ایک روز صبح سویرے وہ اسے اپنی بیل گاڑی پر بھڑک کے پاس کے تھانے میں لے گیا اور اغوا شدہ مسلمان عورتوں کی برآمدگی کے سلسلہ میں اپنی گوششوں کا عملی ثبوت فینے کے لیے دشاد کو پیش کر دیا۔

خنا نیدار الجھورا م نے امریک سنگھ کی کارگرداریوں کو خوب سراہا۔ پولیس کی طرف سے شکریہ کا ایک پرواز اسے عطا کیا اور ٹپی کشہر بہادر سے بھی سند و لوانے کا وعدہ فرمایا۔ پھر خنا نیدار صاحب نے عینک اٹھا کر دشاد کا جائزہ لیا۔ قبل صورت اجوان اور اپنی سی، یکن گرم گرم، گدراز۔ یکن جب اس کی نظر دشاد کے پیٹ پر ٹپی۔ تو ان کی بھروسی ہوئی اسی دست و دست دھکا لگا۔ پہلے تو انھوں نے سوچا کہ اگر دس میں دن کی بات جو تو وہ اسے ابھی تھا نہ ہی میں رکھ لیں۔ یکن جب ہیڈ کا نشیپر دریو دھن سنگھ نے جوڑ توڑ کے حساب لگایا کہ ابھی "خلاص" ہوتے میں ساڑھے تین مہینے باقی ہیں تو خنا نیدار الجھورا م کو ٹپی مالیو سی ہوئی۔ پھر بھی رات کو کھانا کھا کر جب وہ ایک پتلی سی بنیان اور جان گنجیہ پس کر چاہ پاتی پر لیتے تو انھوں نے دشاد کو پاؤں دلانے کے لیے اپنے پاس بلا یا۔ جاتے چور کی لنگھنی ہی سی۔ خنا نیدار صاحب کے پاؤں کا درد بڑھتے بڑھتے پنڈلیوں میں آگیا پھر گھنٹوں میں۔ پھر انہوں کے اندر، پھر کوہلوں کے آس پاس اور وہ دشاد کا ہاتھ پکڑ کر اپنی دلختی ہوئی رگوں کا درد دیواتے رہے۔ خنا نیدار الجھورا م کے نزدیک خواہش کا دوسرا نام تسلیم تھا۔ چنان ہوا تو کیا، چنیں ہوا تو کیا؟

دشاد کے لیے یہ کوئی تھی بات نہ تھی۔ پچھلے چند مہینوں میں اس نے زندگ کی تینچھی پچھا اس طرح کھوئے تھے کہ اس کے بدن کی بولی بولی گویا مرہم کا پھاہابن کر رہ گئی تھی جو کوئی اسے جہاں سے جی چاہتا کا لیتا اور اس کے جسم کا ہر خفتہ جھوڑکتے ہوئے، ہانپتے ہوئے، بے چین انسانوں کو چند ہی لمحوں میں تسلیم کا جام پلا دیتا تھا۔ لیکن اس کی اپنی لگنگ

بیں کتنے پھوٹے سے تھے، کتنی طیسیں تھیں، کتنے رستے ہوتے زخم تھے، کاش بِ رحیم خاں  
ہوتا تو دیکھتا۔

دشاد کو اپنے آپ پر بھی غصہ آنا تھا کہ اس نے بچارے رحیم خاں کو اتنی بارنا حق  
مالیوس کیا تھا۔ ایک روز جب اس نے اُسے زبردستی چمنے کی گوشش کی تھی تو دشاد نے  
غضہ سے اس کے سر پر ایسا دھڑکا رکھا کہ اُس کی چڑیاں ٹوٹ کر رحیم خاں کے مانچے  
میں گڑا گئی تھیں، اور وہ خود ساری رات انگاروں پر بوٹی رہی تھی کہ نہ جانے خدا اور رسول  
رحیم خاں کو اس گناہ کی کیا سزا دیں گے؟ بچارا رحیم خاں!

پندرہ بیس دن کے بعد جب تھانیہار لمحوار کے گھٹنوں اور کولہوں اور کمر کا درد  
ذرا کم ہوا تو انہوں نے دشاد کو چھپتی دی اور ہسید کا نشیل وریو و صن سنگھ کے سامنے اسے  
انبار کیمپ بیچ دیا گیا۔ راستے میں ہسید کا نشیل وریو و صن سنگھ کے کولہوں اور گھٹنوں میں  
بھی کتنی بار درد اُٹھا۔ لیکن دشاد بڑی تندی سے اس کے درکاما دا اکرنگی اور اس  
گھٹنے کی مسافت انہوں نے دس بارہ دنوں میں بخیر و عافیت طے کر لی۔

انبالہ کیمپ میں بہت سی لکھیاں تھیں، بہت سی عورتیں۔ جوان بھی، خواجہ صدیت  
بھی، لیکن ٹوٹے ہوئے تاروں کی طرح، کہ جن کے شرز بچھ گئے ہوں، جن کی کہکشاں ٹوٹ  
گئی ہو، جن کی تنوریوں پر کچڑا مل دیا گیا ہو۔

ہر روز فرج کے ڈک آتے تھے اور نئی نئی لکھیوں، نئی نئی عورتوں کو انبالہ کیمپ  
میں پھوڑ جاتے تھے۔ ناموس اور تقدس کی تسبیع کے یہ بھرے ہوئے انمول سوتی پھرائیے  
مرکز کی طرف جمع ہو رہے تھے۔ لیکن ابھی اُن پر اپنے درسجان، اپنے "عفرو الرحیم" اپنے  
"پاک پروردگار" اپنے در قادر مطلق" کی حمد کا وظیفہ شروع نہ ہوا تھا۔ بلکہ کیمپ کا نئا نہج بر  
پرستیم سنگھ اور اس کے جوانوں دیسا ہی ابھی تک ان پر کردگی کی بانی جیتے تھے۔ خیر دشاد کو ب  
ایک قسم کی چھپتی تھی۔ یوں تو نیکے اولاد ہمیشہ اپنے ماں باپ کا سہما رہو تی ہے لیکن

ویشاد کو اپنے ہونے والے بچے پر بڑا ہی بھروسہ تھا کہ اس نے پیدا ہونے سے پہلے ہی اپنی مجبوریاں کو اپنی حفاظت میں لے رکھا تھا۔

انبار کمپس کے پہلو میں ریلوے لائن تھی۔ سورج کی روشنی میں ریل کی پٹریاں چاند کے تاریں کر چکتی تھیں اور دُور، بہت دُو مغرب کی طرف ان کی نظری لٹیاں خوابوں کے سماں جزیروں میں گم ہو جاتی تھیں کہ ان کا دوسرا سر امشرقی پنجاب میں نہیں مغرب پنجاب میں ہے! مغرب کا خیال آتے ہی دلشاد کی راکھ میں ایک تھسا چرانغ ٹھٹھا اُھتا۔

مغرب میں کعبہ ہے۔ کعبہ اللہ میاں کا اپنا گھر ہے۔ لیکن کمپس کی دوسری عورتیں کہتی تھیں کہ مغرب میں اور بھی بہت کچھ ہے۔ وہاں ہمارے بھائی ہیں، چاری ہمیں ہیں، ہمارے ماں باپ ہیں۔ وہاں عزت ہے۔ وہاں آرام ہے۔ — دلشاد سوچتی تھی کہ شاید وہاں رحیم نہ بھی ہو! یخیال آتے ہی اس کے جسم کا روان روان مچل اُھتا اور وہ بے چین ہو جاتی کہ پُرگاکار بُجاتے اور اپنے ٹھکے ہوئے، دُکھوئے جسم پر اس ارضِ مقدس کی خاکِ مل لے۔

چھتہ، دو بھتے، مہینہ، دو مہینے — دن گزرتے گئے۔ راتیں بیتی گئیں، اور مغرب کا خوش آئند تصور دلشاد کے سینے میں آمدیوں کا نذر پھیلا تارہ۔ انبار کمپس کی آبادی بڑھتی گئی اور جب میجرور یتم سنگھ اور اس کے جوانوں کا دل اچھی طرح سیر چوگیا تو ایک دن وہ ریل بھی اگئی جس کے انتظار میں آمدیوں کے چرانغ ابھی تک بدل رہے تھے جب وہ ریل کے ڈبے میں سوار ہوئی، تو دلشاد کو ملا علی بخش کی یاد آئی وہ بھی اسی طرح ریل میں بیٹھ کر ج کور دانہ ہوا تھا۔ گلے میں ہار تھے، کپڑوں پر عطر تھا اور گاؤں کے لوگ باجا بجا تے ہوئے اس کے ساتھ اسٹیشن سک ائے تھے۔ —!

ریل کے ہر فرائی کے ساتھ عورتوں کے ٹوٹے ہوئے ایگنے بھجننا اُٹھتے تھے۔

پہینوں کی ہر گردش کے ساتھ ان کے جسم اور روح کا ایک بل نکل جاتا تھا۔ جب وہ کھڑک سے جھانک جھانک کرتا رکھ کر جہاں کو دیکھتیں جو بڑی سرعت کے ساتھ پیچے کی طرف بھاگ رہے ہوتے تو انھیں یقین سا ہو جاتا کہ وہ آگے ہی کی طرف جا رہی ہیں۔ زمین کا جو چھپتے چھپتے ان کے پیچے سے نکلتا وہ انھیں شرقی پنجاب سے اٹھا کر مغربی پنجاب کے قریب تر لے جاتا۔ اگر کہیں گاڑی رکھتی تو ساری کائنات دم سادھیتی۔ وقت کی رفتار ساقطہ ہے جاتی اور انھیں یہ ڈر لگتا کہ شاید ابھن کے سامنے اپنا نکاح بڑے بڑے پھاڑا گئے ہیں۔ جب گاڑی دوبارہ چلتی تو دل کی دھڑکنیں جاگ اٹھتیں، سینوں کے ارمان تازہ ہو جاتے اور وہ کھڑک سے ہاتھ باہر نکال نکال کر اس ہوا کو چھوٹے کی گوشش کرتیں، ہومغرب کی سمت سے آرہی تھی!

لہیاں، پھلوں، جالندھر — امرتسر — ہر منزل پر عورتوں کی ننگ کے بندھلاتے گئے۔ ان کی خاک میں سوئے ہوئے تھے بیدار ہونے لگے۔ وہ گلنگانے لگیں۔ وہ جسکرانے لگیں۔ وہ انھیں مل کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ جیسے کسی بھی انکھ خواب کو جھلانے کی گوشش کر رہی ہوں۔ کبھی نے بالوں میں کنگھمی کی۔ کسی نے دو پڑھ کے ساتھ دانتوں کی میل اٹھا رہی۔ کوئی کپڑے جھاڑنے لگی۔ کوئی بیچول کو دیا رہا۔ سُنٹنے لگی۔ کچھ عورتوں نے صرستے سر جوڑ کر گیت گائے۔ پیارے پیارے رُس بھرے، دل بیاگیت، کہ ”اے کمالی کملی والے۔ میں تیری یثرب نگری میں آئی ہوں“۔ مجھے اپنی کملی میں چھپا لے۔ مجھے اپنے پاؤں کی خاک بنالے —

جب امرتسر کے اٹیشن سے نکلی، تو کسی نے کہا کہ اب صرف ڈبڑھ گھنٹے کا سفر اور ہے۔ بن ڈبڑھ گھنٹے اور اساتھ اور تیس، نو تے منٹ! یہ ناقابل یقین خیال عورتوں کے تن بدن پر شراب کے تیر و تند نشے کی طرح چھاگیا۔ اپنی منزل کو اتنا قریب پا کر وہ شدت احساس سے مفلوج سی ہو گئیں۔ پھر بھی انہیں کیا دزہر ان کو

اُن کے سینے میں عورت کی اُنی - ساضنی کی ہولناک حقیقت مستقبل کے سلسلے ارمانوں پر غالب اگنی بیجا یک اُن کو اپنے شاداب گاؤں یاد آنے لگے۔ اپنے جوان جوان بھانی اپنے خیف خیف مال باپ، جن کے بے گور و گفن لاشتے گلیوں میں پڑتے مرد رہے تھے۔ اپنی آداس آداس بہنیں ہو کمپوں میں بیجھتی فرشتوں کا استظار کر رہی تھیں کہ وہ انھیں اپنے نوری پروں میں چھپا کر لے جائیں۔ دُور، کہیں بہت دُور، مغرب کی طرف —  
وہ روئے لگیں۔ اُن کے گاؤں پر آنسوؤں کے پرانے بننے لگے۔ دشاد بھی رودھی تھی، بلک بلک کر سسک کر اور آنسوؤں کا نکین پانی اس کے ہونٹوں پر پھاڑی چشمیوں کی طرح ابل رہا تھا۔ وہ روئی گئی اور اشکوں کی دبیز چادر نے اُس کی پلکوں کو اپنے دامن میں چھالیا۔ ایک عجیب سی غنورگی، ایک عجیب ساخا ر اس کے روئیں روئیں پر چھا گیا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ وہ سندر کی احتکاہ اہروں میں غوطے کھا رہی ہے اور بے شمار سنپولیے اُس کے تن بدن پر رینگ رہے ہیں۔  
رینگ رہے ہیں !!

رَبُّ الْمُغْرِبَيْنَ

مری دُنیا میں تیری پادشاہی

جب اس کی آنکھ کھلی تو ریل کا ڈبہ خالی ہو چکا تھا۔ اسٹیشن کی ایک مہترانی ڈبے کے فرش کو پانی سے دھو رہی تھی۔ داشاد کے پلو میں ایک شخص سی پتھی رورہی تھی۔ صبح کی فضاسورج کی نواری کرنوں میں نہارہی تھی دنختوں پر چڑیاں پھٹک رہی تھیں گھل پر شہنم کے مرقی چمک رہے تھے، اسٹیشن پر چل پہل تھی۔ ایک گرم چاۓ والا کھڑکی کے پاس خواں پچ لگاتے دودھا بال رہا تھا۔

داشاد انہ کھڑک کے سہارے بیٹھ گئی۔ اس نے نقاہت سے چلتے والے سے پوچھا: ”کیا یہ مغرب ہے جمال؟“

چلتے والا اپنے پیلے سیلے کریہ المظراحت نکال کر جنسا درکیوں ہے کیا نماز پڑھو گی اس وقت؟“

اسٹیشن کی مہترانی جب ڈبے کے فرش کو دھو چکی تو اس نے اپنی محنت کے صلے میں داشاد سے ایک چونی مانگی۔ پھر یا وہ جو کہ اس نے داشاد کو چند غلیظ گالیاں دیں۔ مسالا ڈبہ پید کر دیا را مڈنے، ذرا صبر نہ ہو سکا ہے راستے ہی میں جن بیٹھی۔ — اسٹیشن

شیش کی مہترانی جاکر ایک مضبوط سے مہتر کو اپنے ساتھ لے آئی اور دونوں نے بل کر داشاد کو ڈبے سے منکل دیا۔

پلیٹ فارم پر ایک سلامان لادنے والا بھیلا کھڑا تھا۔ دشا داس کے ساتھ پیٹھیں لگا کر بیٹھ گئی۔ سامنے چائے کا شال تھا۔ تابنے کے چکدار سماوار سے ابلتے ہوتے ہوئے چائے کے پیٹھے پیچ و پیچ شکل رہے تھے جیسے کسی نازین کے گیسو جو اس کے دوش پر لہرا رہے ہوں۔ اس کے آگے چھپوں کی دوکان تھی۔ رنگ بربگ کاغذوں پر کندن کی طرح دکھتے ہوئے کیلے سنگتے اور مالٹے سمجھتے رکھتے تھے۔ ایک کٹا بٹا اسرخ انار چھاپڑی میں ڈالا تھا۔ چھت کے ساتھ انگوڈیں کے بڑے بڑے خوشے لگک رہے تھے دشا دکا گلا کا نشے کی طرح خفک تھا۔ اس کی زبان پر گدے گدے، میلے میلے لعاب کی پیڑیاں جبی ہوئی تھیں۔ اس کے پیٹ میں ایک عجیب سا بخار سلگ رہا تھا۔ اس کی کمریں درد کی تیسیں انھری ہی تھیں اور اس کا سارا بدن ایک دکھتے ہونے پھوڑے کی طرح چُرم کر رہا تھا۔

داشاد نے اپنی خشک زبان ہونٹوں پر بھیری۔ اس کنھی سی بھی چھیبا کی طرح اس کے سینے سے چھپتی ہوئی تھیں جس دودھ پر رہی تھی۔ کبھی وہ سوچتی تھی کہ شاید وہ رات بھر سوئی ہی رہی اور مغرب کی شہانی منزل قصموں کو پیچھے چھوڑ آئی۔ کبھی اسے خیال آتا کہ شاید اسی شیش کی فلک بوس عمارت کے پیچے اس کا رحیم خان اس کے انتظار میں کھڑا ہو یا شاید وہ لوگوں کے ان جگھٹوں میں کھویا ہوا اُس سے تلاش کر رہا ہو جو پلیٹ فارم میں پر اور ہر دھر گھوم رہے تھے۔

وہ گوشش کر کے اٹھی، کہ لوگوں کے بھرہ کے قریب ہو جائے لیکن اس کے گھٹن کٹاک سے بچ کر رہ گئے۔ اس کی پیٹلیوں میں رعنہ سا آگیا اور وہ سر خام کر بھیلے کے سارے بھر بیٹھ گئی۔

دو خوش پوش خوش شکل جوان رٹکے ہاتھ میں ہاتھ دیے پلیٹ فارم پر پھل رہے

تھے۔ ایک سگریٹ پلی رہا تھا۔ دوسرا سے کے پاس سگار متعاقب وہ دلشاہ کے سامنے سے گزرتے تو دوسرے سکر پیچھے مڑ مڑ کر اسے دیکھتے رہتے۔ رفتہ رفتہ ان کے پیکن کی طوالت کم ہوتی گئی اور بالآخر وہ دلشاہ کے عین سامنے کھڑے ہو گئے۔ دلشاہ کا دل زور زور سے پسلیوں کے ساتھ ٹکرانے لگا یہیم درجا کا ایک عجیب ساتانا ہانا اُس کے دماغ پر چھا گیا۔

چمکوں کی مسجدیں اگر کوئی اُسے گھور کر دیکھتا، تو وہ بے لبی کے عالم میں اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ کے بیٹھ جاتی تھی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اگلے لمحے سے گھورنے والے کے پاتھ اُس کا گوشہ نوجہ کھسوٹ کر کر کھدیں گے۔ لیکن یہیں بیٹھ جانے کے بعد اس نے ان خوشگوار توقعات کا سہارا پکڑ لیا تھا جو مغرب کے تصور سے اس کے دل اور دل غمیں بسی ہوئی تھیں۔ اس لیے وہ سوچنے لگی، کہ شاید یہ تصورت جوان وہ مہربان بھائی ہوں، جن کے خون کی کشش انبار کی پکی عورتوں کو ہر لمحہ اپنی طرف کھینچا کر تھی۔ اس خیال سے دلشاہ کے دل میں خوشی کی ایک احری ناچی۔ وہ تو مسکرا ابا بھی چاہتی تھی۔ بلیکن اس کے بعد میں دو دلگی ٹیسوں کا طوفان سا اٹھا ہوا تھا اس لیے وہ با وجود گوشہ کے بناؤٹی طور پر بھی مسکرا رہ سکی۔ پھر بھی محبت کا جتنا لوح اس کا دکھتا ہوا، رستا ہوا جسم کاٹھا کر سکتا تھا، اس نے اپنی آنکھوں میں سیمیٹ کر اُن نوجوانوں کی طرف بڑے پیار سے دیکھا۔

”الورا!“ ایک نوجوان سگریٹ کا دھواں دوسرا سے کے منہ پر چھوڑ کر گرم جوشی سے مسکرا یا۔

”رشید“ دوسرا نوجوان نے گرم جوشی کا جواب گرم جوشی سے دیا۔  
الورا! رشید! دلشاہ گویا سرشار ہو گئی۔ یہ دوناں اس کے کانوں میں آبِ حیات سا پڑ کا گئے۔ مہینوں سے وہ ایسے مالوس نام سننے کے لیے ترس گئی تھی۔ اس کے گاؤں کے الورا! رشید، محمود، نسیم، خالد، جاوید تو ندت سے مت گئے تھے۔ ان کی جگہ اس کے

تصور میں اب شمشیر سنگھ، امریکہ سنگھ، کرتار سنگھ، ترکوں سنگھ، پنجاب سنگھ، سو و مکھ سنگھ اور دربار سنگھ کے نام اڑد جوں کی طرح لہراتے تھے۔ ان ناموں کا زہراں کی رگ رگ میں خون کی طرح سراہت کرچکا تھا۔ ان کی سڑانہ اس کے روپیں روپیں میں بسی جوئی تھی۔ ان کا وحشی اب اس کی ٹہیوں میں دردبن کر چاہوا تھا لیکن اب جو اس کے کافوں نے رشید اور انور کے نام منئے تو اسے یوں محسوس ہوا، جیسے وہ آب کوثر سے نہار ہی ہو۔ جیسے وہ پاک و مصفا پانی اُس کے گلے ہوتے، رہتے ہوتے جسم پر گلاب اور کافور کی خوشیوں پھر کر رہا ہو۔ — ان کی گری ہوئی گردن میں افتخار کا اجھار آگیا۔ اس کے مایوس اور غم دیدہ بینے میں اُبید و مستر کی کریں بھوٹ اٹھیں اور اس نے با تھک کے لاشارہ سے اُن دوجا انوں کو اپنے قریب بلایا۔

”دیکھا جگہ ہے بھائی؟“ دلشاہ نے پوچھا۔

”لا ہو رہے ہے“ انور نے کہا۔

”تم کہاں جاؤ گی؟“ رشید نے پوچھا۔

”جہاں قسمت لے جاتے؟“

”باب رے باب؟“ انور نے رشید سے مرگوشی کی۔

”بڑی سپورٹ ہے بھائی!“ رشید نے انور کو آنکھ ماری۔

”آدم بہن، تم ہمارے ساتھ چلو!“ دونوں ہمزبان ہو کر ہوئے۔

جب دلشاہ تھیڈ کا سہارا لے کر اُنھی تو اس کے بھائیوں کو پہلی بار اپنی تنقی سی بھانجی کی جھلک دکھانی دی۔

”مارے“ انور حیرانی سے اچھلا۔

”دیکھا بلاء ہے؟“ رشید نے پوچھا۔

صلوکی ہے جی،“ دلشاہ کچھ بچکھا، کچھ شرماتی۔

”بڑی چھوٹی سی ہے؟“ انور نے جائزہ لیا۔

”ایک ہی دن کی بھے جی؟“ دلشااد آخربھائیوں سے کیا کہے، کیا زکے۔

”آخ سخو، انور کو ابھائی سی آتی۔“

”لاحل ولاقوة،“ رشید کا بھج مبتدا۔

وہ دونوں بھائی تھے کرتے کرتے بچے، اور تیرتیز قدم دہان سے چلے گئے۔ مسلمان والے پلیٹ فارم پر ایک خوبصورت عورت بھر کیلی سی شکوار اور قیضن پہنے جا رہی تھی۔ اس کا دھانی دوپٹہ اس کے سڈھل شانوں پر لہرا رہا تھا۔ رشید اور انور نے چھلانگیں مار کر دیں کی طنزی کو عبور کیا اور ہاتھوں میں ہاتھ دیئے اس خوبصورت عورت کے تعاقب میں حلیں کھڑے ہوئے۔

دوسروں وقت شیش کی روشن ذرا دھل گئی۔ دھوپ میں تمازت کا اثر بڑھ گیا اور مہریاں سورج کی کنیں دلشااد کے دکھنے ہوئے جسم کی شکور کرنے لگیں۔

ایک انگریز اپنی میم کے ساتھ پلیٹ فارم پر دھوپ سینک رہا تھا ان کا پھوٹا سالا کا دلشااد کے قریب اپنے کٹتے سے کھیل رہا تھا۔ جب اُس نے دلشااد کی نفحی سی لٹکی کو دھوپ میں لیٹے ہوئے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں مارتے دیکھا، تو اس کی آنکھیں فرطہ حیرت سے بھیل گئیں اور وہ خوشی سے چیختا ہوا بھاگا اور اپنی ماں کو یہ عجوبہ دکھانے کے لیے گھسیٹ کر لے آیا۔

”ہاؤ وندرفل ہمتی، ہاؤ وندرفل!“ بچہ چیخ رہا تھا اور حیرت اور مسترت سے اس کی آنکھیں بھٹی جاتی تھیں۔

دلشااد کی بیٹی ایک بھٹی سی چادر میں بیٹی ہوتی اپنے نہفے نہفے گھونسے تان کر رہا ان کو دکھار رہی تھی اور اس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں ارض و سماں کوئی کوئی محدودی سے دھنڈ کار رہے تھے۔ انگریز کا بچہ اس نفحی سی چیز کو دیکھ دیکھ کر تالیاں بھاگتا تھا۔

ناچتا تھا اور ہر لمحہ کو شش کرتا تھا کہ وہ اچک کر اس جاندار کھلونے کو اپنے ہاتھوں میں اٹھلے۔ اُس کی ماں نے اُسے ڈانٹا کر دوسرا کے کی چیز کو لمبا تھا نہیں لگایا کرتے۔ رکا پھل گیا۔

”ہم تم کو ایسا ہی کھلونا لادیں گے“ رُک کے کے باپ نے اُسے چکارا۔  
”جھوٹ“ رُک کا رد ہوا تھا۔

”ہاں، ہاں بچھے، ہم ضرور تم کو ایسا ہی کھلونا لادیں گے“ رُک کے کی ماں نے وعدہ کیا۔

”تم کب مجھے ایسا ہی کھلونا لادو گے؟“ رُک کا بات پکی کرنا پاہتا تھا۔

”بہت جلد میرے بیٹے، بہت جلد“ باپ نے اپنی بیوی کے گاؤں کا جائزہ لیا۔ جس کی گولائی پیٹ کے اوپر بہت پھیلی ہوئی تھی۔ بیوی نے شرما کر منہ پھیر لیا۔

”میں اس کھلونے کو پاکیت دو!“

”نہیں بیٹے، یہ چاکیت نہیں کھاسکتی“

”اچھا تو می، اسے ایک عمدہ ساسوٹ دو!“

”ہاں میرے ڈارٹنگ، ہم اسے کپڑا دیں گے!“

”اور پیسے بھی، میری می!“

”ہاں، پیسے بھی میرے ڈارٹنگ!“

رُک کا خوشی سیخنے لیج کر پھرتا یاں بجانے لگا اور جب اس کا جی اس کھیل سے ہر گیا تو اُس کی ماں نے دلشاہ کو اونی کپڑے کا ایک ٹکڑا اور پانچ روپے دیے۔ جب وہ جائے تو دلشاہ نے دل میں اس پچھے کو دعا دی، جو پہلی بار اُس کی زندگی میں رحمت کا فرشتہ بن کر نازل ہوا تھا۔

جب دلشاہ کے ہاتھ میں پیسے آگئے، قو دنیا کے ساتھ اس کا رشتہ از سر زوف انم

ہو گی۔ ایک چائے والے نے اس کے پاس آکر گرم چائے کی ہاتھ کلکانی۔ ایک گوشت روٹی، والا بھی اس کے نزدیک اپنا خواپنچے لے آیا۔ اور جب داشادروٹی کھلنے لگی تو ایک کشنا بھی زبان نکال اس کے سامنے آبیٹھا۔

قریب ہی ایک بچ پر دبزرگ بیٹھے رائے زندی فرمائے تھے۔ ایک کی داڑھی سفید تھی، دوسرا کی حنانی۔ دونوں کچھ دیرستے انگریز اس کی میم اور نیچے کی حرکات پر ناک بھਊں چڑھا رہے تھے۔ جب میم نے داشادروٹی کیڑا اور پانچ روپے خیرات دیے، تو ان دونوں بزرگوں کو یہ محسوس ہوا کہ اس فرنگن نے ان داڑھیوں کو پکڑ کر زدہ سے جھٹک دیا تھا۔

”علاجول ولادوتہ“ ایک حضرت شناخت ہوئے یہ یہ حرامی اب تک سمجھتے ہیں کہ یہ شخصیں کے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں؟

”ارے میاں قصور ان کا نہیں“ دوسرا صاحب نے فیصلہ صادر کیا۔ وکیوں نہیں اس کم بخت عورت نے ایسی ذیلی خیرات کو نفرت سے ٹھکرایا؟

”اللہ افتد آزادی تو ملی، لیکن خلامی کا چسکانہ گیا۔“

”جانے کیسے میرے بھائی، جانے کیسے؟ جب ایسے آقاؤں کی جو تمیں کے صدقے مفت کی گوشت روٹی ملے تو آزادی کی محنت کا باکوں امتحانے ہے؟“

”اے طائیلا ہوتی اس رزق سے موت اچھی

”جس رزق سے آتی ہو پر داڑ میں کوتا ہی؟“

پہلے والے بزرگ نے رفت سے الایا۔

دوسرا صاحب نے بھی آزادی اور خودی کی عظمت میں کچھ مصروفے ارشاد فرمائے۔ جب داشاد چار آنے کے گوشت، تین آنے کی روٹی اور دو آنے کی چائے سے اپنے دونوں ٹکڑکم کو ایندھن دے چکی تو وہ دونوں بزرگ جنبش فرمائکر اس کے پاس آئے۔

”اے عورت کیا تم مہاجر ہو؟“ ایک نے خشمگیں انداز سے پوچھا، جیسے زمانہ سلف کا قاضی کسی زانیہ عورت سے خطاب کر رہا ہو۔

”جی نہیں، میرا نام دشاد ہے؛“

دارے ہو گا، لاحدل ولاقوة۔ ہم پوچھتے ہیں تم کہاں سے آئی ہو؟ کہاں جاؤ گی اور یہاں پر تھارا کیا کام ہے؟ دوسرے حضرت نے ہماری کی۔

اے کاش دشاد کو معلوم ہوتا کہ اس کی منزل مقصود کا نشان — کس شاہراہ پر ملے گا۔ اس کے تختیل میں تو مغرب کی ساری کائنات اس کی منزل تھی۔ وہ تو ایک ایسی فیض بود رہی میں شامل ہونے والی تھی جس میں اسے سارے اپنے ہی اپنے نظر آتے ہوں۔ لیکن یہاں کی اینٹ، اینٹ اُس سے پوچھتی تھی کہ تم کون ہو؟ تم کیا ہو؟ تھاری جیب میں پیسے ہیں۔ تھارے جسم میں تازگی ہے؟

”تم مہاجر ہو؟“ ایک بزرگ نے فتوی دیا۔ ”تم مہاجر خانے چل جاؤ۔“

”ازاد قوم کی بیٹیاں بھیک کے ٹکڑوں پر نہیں بلتنیں ہائیں۔“

”و تم کوئی بچہ نہیں ہو۔ تھیس خود شرم آئی چاہیے؟“

دشاد دیر تک بیٹھی سوچتی رہی کہ شاید وہ بزرگ مہاجر نام کی رٹکی کی تلاش میں تھے۔ جو کون گناہ کبیر و سرزد کر کے گھر سے بھاگ گئی تھی۔ لیکن شام تک بہت سے لوگوں نے اسے ہی پکارا اور سب نے اُسے مہاجر خانے میں چلے جانے کی تلقین کی۔

مہاجر خانہ ————— مسافر خانے کے وزن پر۔ ایک دفعہ جب دشاد اپنے

ایک ساتھ شہر گئی تھی تو وہ دونوں حاجی مومنی کے مسافر خانے میں ٹھہرے تھے۔

مسافر خانے میں چھوٹی ٹھوٹی گوٹھریاں تھیں ایک بھٹیاں اولپوں کی اُنگ پر ماش کی دال پکار ہی تھی جب دشاد اس کے پاس چنانی پر کھانا کھانے بیٹھی، تو بھٹیاں نے

بہت ساگھی پیاز کے ساتھ بچمار کر اس کی والی میں طالا اور گرم گرم روٹیوں پر تمازہ بخشن رکھ کر کھانے کو دیا۔ رات کو جب ملاٹی علی بخش عشاں کی نماز پڑھنے لگا، تو بھیساں دلشاد کی چارپائی کے ساتھ اپنی چارپائی لگا کے لیٹ گئی اور دیرینک اسے ضریباً کہانیاں سناتی رہی۔ کبھی سات بیٹیوں والے راجح کا قصہ، کبھی پریلوں کی بادشاہزادی کا افسانہ۔ کبھی اپنے بھیساں کی جیون کہانی بھیساں کئی دفعہ روئی، کئی دفعہ بہنسی۔ اور آج تک جب دلشاد شہر کی بارونٹی سڑکوں کا تختیل باندھتی، تو اس کے پردہ خیال پر حاجی موسنی کی سرائے کا عکس اُبھر آتا اور اس بھیساں کی تصویر بھی جو کبھی روئی تھی، کبھی ہنسنی تھی، اور کبھی دلشاد کو گرم گرم چپا تیوں پر بخشن کے پیڑیے رکھ کر کھانے کو دیتی تھی۔

**مهاجر خانہ** — شاید مسافر خانہ کا بگڑا چو انام ہو، جیسے کا دل والے سپتال کو ڈال خانہ کہتے ہیں۔ شاید شہر والے مسافر خانہ کو مهاجر خانہ کہتے ہوں — لیکن اس کو اپنا نیا نام کچھ زیادہ پسند نہ آیا۔ مهاجر بھی کوئی نام سانام ہے جعلہ؟ دلشاد تو بڑا رسیلا نام تھا۔ اس نام کے ساتھ ملاٹی بخش کی یاد وابستہ تھی جس نے قرآن شریف سے فیال نکال کر اس سے پہنام دیا تھا۔ اسی ایک نام میں رحیم خان کا افسانہ محبت بھی منظوم تھا۔ دلشاد کے ساتھ آباد، بیداد، صیاد کے قلیلے باندھ کر بڑے رس بھرے دو ہے گایا کرتا تھا۔

**مهاجر خانہ** — جب وہ مهاجر خانے پہنچی تو لا ہور کے شالوں پر رات کے گیسو پھیل رہے تھے۔ مهاجر خانے کا افسر ایک چھوپلداری میں رجسٹر کھو لے بیٹھا تھا۔ پچھو دیر کے بعد دلشاد کی باری آئی۔

دنام بھا افسر نے طوطے کی طرح رضا ہوا سوال دہرا دیا۔

دلشاد

در عمر

”بیس سال“  
 ”باب پ کا نام؟“  
 ”ملائی خشیں“  
 ”درزندہ ہے یا مرگیا؟“  
 ”مارڈ والا گیا“  
 ”کاؤن؟“  
 ”چمکوں“  
 ”وصلع ہے؟“  
 ”انبارہ“  
 ”شاہی شدہ ہے؟“  
 ”وجی نہیں“  
 مہاجر خانے کے افسر نے قلم روکا اور شکمیں بگاہوں سے دلشاہ کو گھوڑا بیٹھا کر کیس کی ہے؟  
 ”جی یہ میری لٹکی ہے“ دلشاہ ہکلانے لگی۔ میری شادی ہو گئی ہے جی، میں سمجھوں گئی جی۔  
 افسر کا قلم مشین کی طرح پھر دوات کی طرف گھوم گیا۔  
 ”سوچ کے بولو، خاوند کام ہے؟“  
 ”رجیم خان“  
 ”درزندہ ہے یا مرگیا؟“  
 ”جی — پتہ نہیں۔ خدا کرے زندہ ہو۔ خدا کرے میری عمر بھی اتنے  
 لگ جائے جی۔

مہاجر خانے کا رقبہ کافی وسیع تھا۔ کوئی آٹھ سو فٹ لمبا، پانچ سو فٹ چوڑا۔ ایک گھلہ میدان۔ جس کے چاروں طرف کامتوں والی تار کا احاطہ باندھا ہوا تھا۔ چھت کے لیے آسمان کا لا جو دی سائبان تھا روشنی کے لیے ماہتاب کی قندیل اور تاروں کے ٹھٹھاتے ہوتے چراغ تھے۔ ایک کونے میں باورچی خانہ تھا۔ زین میں کھودے ہوتے عین چولوں پروال اور گوشت کی بڑی بڑی پیشکس پک رہی تھیں۔ رات کے اندرھیرے میں چولوں کی الگ دیگوں کے گرد اگر دیلوں بھڑکتی تھی، جیسے چتاوں کے شعلوں میں دیوتاوں کے لاشے جل رہے ہوں۔ الگ کی روشنی میں مہاجر خلنے کا وسیع میدان بھر گیا تھا، جس طرح شفق شام میں نہترے ہوتے اب پاروں کی سرخی کسی قبرستان پر غبارہ خون کی طرح چھا جائے۔ ساری فضنا میں ایک غناک ساٹھراہ تھا۔ ایک ہنکاسا، ایک غیر محسوس سارتعاش جس میں لاکھوں سینے کے کچلے ہوتے ارمان اور ٹوٹے دلوں کی معصوم دھڑکنیں لکپاڑتی ہی تھیں، تھر تھر اجی تھیں اور ہر لمحہ یہ ڈر لگتا تھا کہ کسی وقت سکون و جمود کا یہ صنوعی طلسم یا کیا کیا ٹوٹ جائے گا اور ایک زبردست طوفان، ایک بے پناہ نزلہ، ایک ہولناک چنگھاڑ زین و آسمان کے نفلم کو درہم بہم کر کے رکھ دے گی۔

دلشاو اپنی بیچی کو سینے سے لگانے قدم چپونک چپونک کر جلتی تھی۔ جس طرح قبرستان میں بچا بچا کر پاؤں رکھا جاتا ہے کہ کہیں کسی مقدس مزار کو مشکور نہ لگ جاتے۔ کچھ مہاجروں منے بانسوں پر چادریں تان کر چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنالی ہیں۔ کچھ مہاجر بیچی قبور کی طرح یوں ہی آسمان تک مبیٹھے ہوئے تھے — آسمان تیری لمحہ پہشم افشا نی کرے — کسی کے پاس چادر تھی، کسی کے پاس مکبل، کسی کے پاس لمحاف، دلشاو کے پاس نہ چادر تھی، نہ مکبل تھا، نہ لمحاف۔ وہ خود ایک چیخڑا تھی۔ ایک بو سیدہ سا، ایک فرسودہ سامنگڑا، جو اس کے لباس وہ شیرگی کی یاد میں باقی رہ گیا تھا — مہاجر خانے میں ایسے سینکڑوں چینقرے سے بھرے پڑے تھے۔ سب کے ول میں امتیز کی نوجگی ہوتی تھی کتاب وہ اپنی

پیاری سرز میں پاگئے ہیں۔ اب اس ارض مقدس کی خاک ان کے گفتے ہوئے ناسوروں پر سرہم بن کر لگ جائے گی۔ اب یہاں کامنبر ک پانی آن کے رستے ہوئے زخمیں کو دھو دیا لے گا۔ اب یہاں کے سورج اور چاند کی تنبیہیں ان کے چاک و امنوں کو رفوکر دیں گی۔

ایک خالی سی جگہ دیکھ کر دلشا دلٹھر گئی۔ کچھ دُور آگے ایک کہنہ سال ضعیف آدمی ڈیرہ ڈالے بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ دو پتھے تھے، ایک آٹھو سال کا رکھا محمود، ایک گیارہ بارہ برس کی لڑکی زبیدہ، وہ تینوں ایک بیٹی کے پیالے پر بجکے ہوئے روٹھا رہے تھے۔ محمود پوچھتا تھا کہ دادا آج سال میں بونی کیوں نہیں؟ زبیدہ اپنے دادا کی وکالت کرنے تھی اور کہتی تھی کہ ہر روز گوشت نہیں کھایا کرتے، اس سے پیٹ خراب ہو جاتا ہے، دانفل کو کیڑا لگ جاتا ہے۔ — لیکن محمود مچل رہا تھا۔ دادا سے چمکارتا تھا۔ زبیدہ اپنے ڈانٹیں بھی۔ مذکیا بیس تجھے اپنی بوشیاں کاٹ کر دے دوں۔“ وہ چھوٹی سی بہن اپنے چھوٹے سے بھانگ کو بزرگوں کی طرح ڈانٹتی تھی اور دیکھنے والے کو یہ محسوس ہتا تھا کہ اس مختصر سے خاندان کا لگبھان دادا نہیں، زبیدہ ہے۔ اس لڑکی کا شور اس قدر حساس اور بیدار تھا کہ وہ بیک وقت ایک بھتی سی بہن، ایک بھتی سی بیٹی، ایک بھتی سی بیٹا کے فرائض انجام دے رہی تھی۔

”بہیں بیٹھ جاؤ بیٹی۔ تمہارے ساتھ کوئی اور ہے؟“ بُڑھے دادا نے دلشاو سے پوچھا۔

”جی نہیں۔ میرے ساتھ اور کوئی نہیں۔“  
”دجاو روٹی لے آؤ بادرچی خلفے سے۔ تمہارے پاس کوئی پیالہ ہے؟“  
”جی نہیں۔ میرے پاس کوئی برتن نہیں۔“  
دادا نے اپنا ایک خالی پیارا اسے دے دیا۔

”پالا بھی بہت ہے بیٹی۔ تمہارے پاس کوئی بستر ہے؟“

”وچی نہیں، میرے پاس کوئی بستر بھی نہیں؟“

وادا نے اس دیران ہستی پر جمروہی کی ایک بھر لپڑنگاہ ڈالی۔ وہ بھی بالکل اسی  
حالت میں یہاں آیا تھا۔

”باورچی خانے کے پاس کپڑوں کا دفتر ہے۔ کبمل ہاگ لینا دہاں سے؟“ پھر وادا نے  
ستاروں کو دیکھ کر وقت کا حساب لگایا۔ ”نونج رہے ہیں۔ شاید سٹور بابو جاگتا ہو۔“  
باورچی نے دلشاڈ کو درود بیاں اور پیار بھرداں دے دی۔ کپڑوں کے دفتر میں ایک مدھم  
سی لائین بل رہی تھی۔ خیسے میں رضا یوں کے انبار لگے ہوتے تھے۔ سرخ سرخ، بھورے  
بھورے، کالے کالے کبلوں کی تھوں پر تمیں جبی جوئی تھیں۔ ایک کونے میں گرم کپڑوں  
کے ڈھیر تھے۔ اونی سوٹر پٹو کے کوٹ، گرم چادریں۔ — سٹور بابو سرخ و سفید  
چھینٹ کی رضاۓ اور حصے چار پانی پر لیٹا چوا اقبال کا شکوہ گارہ تھا۔

رحمتیں ہیں ترسی اغیار کے کاش انوں پر

برق گرتی ہے توبے چار سے ستمانوں پر

جب اُس نے دلشاڈ کو خیسے کے دروازے میں کھڑا ہوا پایا تو اس کے تنم کی لے  
شست پر گئی اور اُس نے نہایت خشکیں انداز سے دلشاڈ کو گھورا۔

”و دفتر بند ہے جی اس وقت۔ صبح آٹھ بنجے آنا۔“

”دھارے پاس کوئی کپڑا نہیں ہے۔ ہم پاس سے مر جائیں گے؟“

”و کوئی نہیں مرتے صبح آٹھ بنجے آنا، ہاں۔ دفتر بند ہے اس وقت؟“

دلشاڈ نے ایک بار پھر انجاکی سٹور بابو جن جھلکا گیا۔

”یہ کہتا ہوں چلی جاؤ سید صی طرح، یہی بھی آخر انسان ہوں۔ مشین نہیں ہوں،“

ہاں صبح آٹھ بنجے آنا۔ اور پھر وہ اپنے نرم و گرم لحاف میں سکوڑ کر شکوہ گانے لگا۔

آئے عشقانگئے وعدہ فدا لے کر

اب انھیں ڈھونڈ چڑا غریب زیما لے کر

جوں جوں رات بھیگتی گئی، سردی میں اضافہ ہوتا گیا اور فترفتہ یوں محسوس ہونے لگا جیسے ساری کائنات تباخ بستہ ہو گئی ہو۔ سرد ہوا کے جھونکے ہیر و نشتر کی طرح بدن میں لگتے تھے اور زین کی نمی زہر آلو دکانٹوں کی طرح جسم میں چھپتی تھی۔ وادا کے پاس ایک مکبل تھا۔ اس نے اسے آدھا نیچے پھجا کر محمود اور زیدہ کو سلا دیا تھا اور آدھا مکبل ان کے اوپر ڈال دیا تھا۔ وہ خود ایک پتلی سی چادر اوڑھے زین پر لیٹا ہوا کر دہمیں بدلتا تھا۔ دلشاو کے دانت کٹ کٹ بخ رہے تھے۔ وہ اپنی بیٹی کو اونی کپڑے میں لپیٹ کر اپنے سینے سے چھپٹا رے میٹھی تھی۔ کبھی وہ لیٹ جاتی تھی کبھی اُنھوں نے بیٹھتی تھی۔ کبھی کھڑی ہو کر گھومنے لگتی تھی۔ لیکن ہر کروڑ، ہر پہلو سردی کا اثر سانپ کے زہر کی طرح اس کی ہڈیوں میں سرسر اٹا ہوا بڑھ رہا تھا اور اسے ڈر لگتا تھا کہ شاید اگلے لمحے وہ برف کے ٹکڑے کی طرح جم کر گر جائے گی۔

کچھ دُوراگے ایک جوان عورت اپنے جسم کی گرمی ہر میکن طریقے سے اپنی چار سالہ لڑکی کے جسم میں منتقل کرنے کی گوشش کر رہی تھی۔ ان کے پاس بھی نہ مکبل تھا، نہ لحاف، نچادر، لڑکی کا سانس اکھڑا اکھڑا ساختا۔ اس کے سینے میں گھٹیاں سی بخ رہی تھیں۔ جیسے بہت دُور افقی لکیر سے پرسے، اونٹوں کا ایک کار داں کسی جذبے کی نیلاش میں چلا جا رہا ہو، چلا جا رہا ہو، روان روان، دوان دوان..... جیسے جیسے سردی بڑھتی گئی، لڑکی کے سینے کی گھٹیاں تیز تر ہوتی گئیں۔ اس کے سانس میں ایک زبردست تناول گیا جیسے زندگی اور موت کے فرشتے اس کے سانس کی لڑی تھام کر آپس میں رسکشی کر رہے ہوں۔

اس کی ماں گھبرا گئی۔ بے بیس ہو گئی، لاچار ہو گئی۔ اس نے کھڑے ہو کر گرد و پیش کا

چاند بھی اپنے لحافوں پر اندھیرے کا سیاہ کفن چڑھا ہوا تھا۔ کبھی کبھی چاند بھی اپنے لحافوں کی اوٹ سے جھلک کر دیکھ لیتا تھا۔ چاروں طرف سکوت پاکردہ عورت سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اس نے چوروں کی طرح دزدیدہ بگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اور ہولے ہولے بھجھتے ہوئے شرماتے شرماتے اس نے اپنے کپڑے کھول کر اپنی مٹھھری ہوئی بیمار بیجی کو ان میں پیسٹے لیا۔ اندھیرے میں ایک بجلی سی لہانی اور اس جوان عورت کا بہمنہ جسم کامنات کے ذریعے کو لا کارنے لگا کہ دیکھو دیکھو یہ لا جواب ساعت بیت نہ جا۔ تم نے ارض و سما کے بہت سے راز دیکھے ہوں گے۔ لیکن تم اس ماں کے بہمنہ جسم کو زمبوول سکو گے جس کے کپڑوں میں اس کی سرتی ہوئی بیٹھی پیشی پڑی ہوا اور بڑا سخت پالا پڑتا ہوا اور سٹور میں گرم کمبل اور لحافوں کے ڈھیر ہوں۔ اور سٹور بابورضا تی میں پیٹا ہوا دشکوہ کارہ ہوا اور ————— عورت کا غریبان جسم ایک غلیظ گالی بن کر چاروں طرف چھاگیا۔ رات کی خلمت میں رو سیاہی کی کاکاں اور بھی زیادہ گہری ہو گئی۔ آسمان پر جو ستائیں ٹھیکار ہے تھے آنکھیں مند کر بادلوں کی اوٹ میں چھپ گئے۔ چاند بھی اپنے لحافوں کے تیز سے جھلک کر یہ نظارہ دیکھنے کی تاب نلا سکا۔ ایک گھنگھور گھٹا جو آسمان پر بے پرواہی سے بکھری ہوئی تھی، سمٹ سمٹ کر اکٹھی ہو گئی۔ اور بادلوں کی پلکوں سے موٹے موٹے آنسو گزے لگے۔

عینہ کی بوندیں دلشاہ کے بدن میں بندوق کے چھپروں کی طرح پیوست ہوئی تھیں۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جنے امریک سنجھ، از توک سنگھ، سور کوک سنگھ دربارگاندھ

کی کرپانیں اس کے جسم کو چھید رہی ہیں۔ بارش کا پانی فلاںیں کے گرم ٹکڑے میں بھی نفوڈ کرتا گیا اور اس میں لیٹی ہوئی سخنی سی جان سردی سے لکپیا نے لگی۔ دلشا دنے سوچا کہ اگر وہ وادا سے پوچھ کر اپنی لٹکی کو مجود اور زیبیدہ کے قبل میں لشادے تو شاید اس غریب کی جان کو کچھ سہما رامل جائے۔ اس نے وادا کے گھٹتے کو بلایا، وہ اپنی میلی سی چادر اور ڈھنڈے لیٹا ہوا تھا۔ دلشا دنے اُس سے شانوں سے بلایا، بانشوں سے بلایا۔ گردن سے چھبوڑا، ہاتھ کھینچے، لیکن وادا کا خاکی جسم سردی اور گرمی کے احساس سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ زندگی کا خون اس کی رگوں میں جنم کے روک گیا تھا۔ اور اس کی ٹہریاں سردی سے اکٹکر ٹوہنے کی سلاخی کی طرح تن گئی تھیں۔

جب صبح صادق کی پوچھٹی تو مہاجر خانے کے میدان میں ایک مرمری مجسمہ چاندی کی طرح جعلدا یا۔۔۔ اس بجان عورت کا بزہرہ جسم تھا۔ جس نے اپنے کپڑوں میں اپنی صرفی ہولن پتھی کو پیٹ لیا تھا۔ اس کے بے جان سینے سے اس کی پتھی کی لاش یوں پتھی ہوئی تھی جیسے ابھی ابھی دودھ بیٹنے لگی ہو معلوم ہوتا تھا کہ کسی بڑے فن کا رنے مرمر کو نراش کر بیخ صورت بنتتا ہے ہیں۔ عورت کے کسے ہوتے دودھیا بدن پر بارش کے قدرے متبوتوں کی طرح جگہ کارہے تھے۔ اس کی گھنی زلفیں کالے ناگوں کی طرح بھری پڑی تھیں۔ اس کی نیم با آنکھوں میں پانی کی ایک تہ سی محجی ہوئی تھی، جیسے اُس کے خون کے ساتھ ساتھ اس کے آنسو بھی منجھ ہو کے رہ گئے ہوں۔

مہاجر خانے کے کچھ مہتر کمبلوں کا پاندا اٹھا کر لے آئے۔ ایک کمبل انھوں نے وادا پر ڈال دیا۔ دوسرا عورت کے ننگے بدن پر، تیرسا اس کی پتھی پر چڑھا۔ اور اسی طرح وہ میدان میں بھری ہوئی لاشوں پر نرم نرم کمبلوں کے کفن ڈالتے گئے جو لوگ زندہ تھے وہ جست بھری لٹھا ہوں سے اپنے مردہ ساتھیوں کی طرف دیکھتے تھے اور رشک کرتے تھے کہ اگر موٹ کے نصوتوں میں ایک آن دیکھی آن جانی آن سمجھی حقیقت کا خوف نہ ہوتا۔ تو وہ سب

بڑنا درغبت وہیں مر جاتے تاکہ مهاجر خانے کے مہر ان پر بھی ادنیٰ کمبل ڈالتے جائیں اور ان کے لپکپتے ہوتے گوشت اور مصطفیٰ ہوئی ٹھیکیں کو ذرا ساسکوں، ذرا سی گرمی، ذرا سا آرام میتر آتے۔

محمود ملی رہا تھا کہ دادا کو وہ لوگ اٹھا کر کہاں لے گئے؟ زبیدہ اُسے سمجھاتی تھی کہ دادا، ابا اور اتمی کو بلانے کہتے ہیں — وہ کب آئیں گے؟ — وہ ہست جلد آجائیں گے، میرے محمود، وہ تو بس آتے ہی ہوں گے۔ ابا اور اتمی کہاں گئے ہیں؟ وہ مخنوڑی دیر کے لیے اندھیاں سے ملتے گئے ہیں۔ وہ اس کے دربار سے تھارے یا یہ عمدہ عمدہ کھلونے لائیں گے شیشے کا المٹو، رجھنی گیند، چابی والی موڑ نہیں بولٹ، تلے دار لپنی — محمود کا تختیل طرح طرح کے سوال ایجاد کرتا تھا۔ زبیدہ طرح طرح کے جواب گھر کلاس سے ٹھانتی تھی اور جب کبھی محمود ادھر ادھر حکیل میں لگ جاتا تو وہ نظر چاکر منہ چھپا کر اپنے دل کا غبار نکال لیتی تھی۔

مهاجر خانے کی مشین بائیسکوپ کی طرح چل رہی تھی۔ صبح سے شام تک اس کے پردے پر بھانت بھانت کے سین آتے تھے اور نکل جاتے تھے۔

باز پکڑ اطفال ہے دنیا مرے آگے

ہوتا ہے شب درور تماشہ نمرے آگے

بڑے بڑے دبدبے والے رنیس اور نواب آتے تھے۔ اونچی اونچی کرسیوں والے حکام آتے تھے۔ سربراہ ہوتے ریشم و کخواب میں بلبوس کلیوں کی طرح کھلے ہوتے حسن میں سرشار گلاب اور چنیلی کے عطر میں ملکی ہوئی بیگمات آتی تھیں وہ سب پتوں کے سر پشفقت کا ہاتھ پھیرتے تھے۔ عورتوں کے پاس کھڑے ہو کر ان کی اشک شوئی کرتے تھے۔ بڑھوں اور جانلوں کی بیچھے ٹھوک کر ان کی ٹوٹی ہوئی کمر کو سہارا دیتے تھے اور پھر سبکسار موڑیں انھیں مهاجر خانے سے والپس سے جاتی تھیں۔ کوئی مٹھائی لاتا تھا کوئی پیٹے

باندھتا تھا، کوئی پلاڑا در قدر سے کی بیکیں تقسیم کرتا تھا اور جب کوئی اس کا رنجیر میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتا تو اس کے چہرے پر فخر و مشرت کی سُرخی پھیل جاتی اور وہ دل ہی دل میں اپنے رحمان اور رحیم کا شکریہ ادا کرتا کہ اس نے اپنی قدرت کامل سے ایسے سامان پیدا کر دیے ہیں کہ طفیل اس ناچیز کو بھی مقدور بھر خیرات کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ داشاد سوچتی تھی کہ جب کوئی جوان سرخمودا اور زبیدہ کا فقصہ نے گا تو سور باپو کو کان سے پکڑ گولی سے اڑا دے گا کہ اس نے اس کو اکے کی سردی میں بھی دادا کو صرف ایک بھی کمبیل دیا۔ وہ ڈرتی تھی کہ جب کوئی دب دیے والے، طنطہ والے بلند اقبال لوگ اس کی اپنی رام کہانی سنیں گے تو ان کا خون کھول اٹھئے گا۔ ان کی غیرت کو شدید چوٹ لگ کے گی۔ اور وہ اپنی بندوقیں اٹھا کر امریکہ سنگھ، ترکوں سنگھ، کوتار سنگھ، دربار سنگھ کی تلاش میں چل بکھیں گے — لیکن سنتے والے سنتے گئے، سنانے والے سنانے گئے دن میں مٹھائی اور پلاو بیٹھتا گیا رات کو زمستانی ہوا کی شمشیر اپنےوار کرنی لگی اور جا جرخانہ کا بائیکلو پلستور چلتا گیا۔ ایک سین کے بعد دوسرا سین، دوسرا سین کے بعد تیسرا سین — تہ آغاز نہ انجام، ایک مسلسل اور یہ بچیدہ نظام ترجم کہ جس میں انسان، انسان کا رازق بنتے کے بیٹے بے قرار ہو، بے چین ہوا در اس بازی میں دوسروں پر سبقت لے جانے کے لیے ہر قسم کا دوسرہ قسم کا پیچ کھیلنے پر تلا ہوا ہو۔

ایک صاحب بڑے مخیر تھے، بدن پر خوشنا سوت، سر بر ترچھی ٹوپی آنکھوں پر سونے کے فریم والی سینہ عینک، اگلے دانتوں میں سنہری کیلیں، منہ میں پاپ، انگلیوں میں لعل اور یاقوت کی بیش بہما انگوٹھیاں — وہ گھنٹوں جا جرخانہ میں گھومتے تھے۔ ایک ایک کی داستان سنتے تھے۔ کسی کو پیسے دیتے تھے۔ کسی کو مٹھائی کی گولیاں۔ کسی کو چالکڑتے — داشاد پر بھی ان کی خاص نظر عنایت تھی۔ ایک روز وہ اس کی بیکی کے لیے مُرخ اُون کا دیدہ زبیب سو نظر لاتے۔ دوسرے روز انھوں نے رحیم خان کی تلاش کرنے کا

وعددہ فرمایا اور کچھ دلنوں کے بعد وہ داشاد کے لیے ایک جانفرا عبید کا پیغام لے کر آئے کہ رحیم خاں کا پتہ مل گیا ہے۔ بچارا بے حد کمزور ہے۔ چلنے پھرنے سے معدود رہیں لیکن داشاد کی یاد کے سماں سے وہ ابھی تک بارزیست اٹھاتے بیٹھتا ہے۔ داشاد کی نظر ہیں قُنیا گُنار ہو گئی۔ جہاں جہاں کی زمین پر پھول جی پھول اُگ آتے۔ اس کے بدن میں سُلْٹنے والا زبر کافور کی طرح مشکبار جو گیا اور وہ اپنے دھڑکتے ہو کر سیستے میں ارمانوں کا بے پناہ بجوم چھپاتے مسٹر مصطفیٰ خاں سیماں کی موڑیں آبیٹھی۔ کار فراٹے بھرتی جا رہی تھی۔ لاہور کی سڑکیں رنگین سانپوں کی طرح لہرا لہرا کر گز رہی تھیں۔ یہ باشع جناح ہے؛ یہ گلستان فاطمہ کی چار دیواری ہے۔ یہ مکہم عظیمہ کا ہاتھ ہے۔ یہ مال روڈ کے رنگین دیستروں میں یہ نیلا گنبد کا چوک ہے۔ اس گلی میں انار کلی کا مقبرہ ہے۔ یہ گر جا ہے، وہ مسجد ہے۔۔۔۔۔ یہ مصطفیٰ خاں سیماں کا مقابلہ بن گلکر ہے۔ نوکر دوں کے کمرے میں گراموفون بج رہا ہے۔

آج کر لے جی بھر کے سنگار، تو ہے جاتا ہے

آج کر لے جی بھر کے سنگار،

داشاد کا دل دھک دھک بج رہا تھا۔ اس دھک دھک میں ایک انوکھے رُور کا ترجم تھا۔ وہ برآمدے میں بیٹھے بیٹھے سوچ رہی تھی کہ شاید اس زمین پر رحیم خاں کے قدم پڑے ہوں۔ شاید اس بنگلہ کی بہرامیں اس کی دلاؤر سانس بھی ہوئی جو۔۔۔ داشاد کی نظر عقیدت میں بنگلہ کی زمین کا ذرہ ذرہ مکہ اور مدینہ کی خاک بن گیا۔ بنگلہ کی اینٹ اینٹ پر مسجدوں کے مقدس منارے تعمیر ہو گئے۔۔۔۔۔ ایک نوکرنے اسے ایک پلیٹ میں پلاو، ایک میں پاک اور گوشت، ایک میں مٹرا اور قیمه، ایک میں کبودر سے میں رکائی جوئی فرنی لا کر دی۔ معلوم نہیں وہ کیا کھا گئی اور کب کھا گئی۔۔۔۔۔ وہ دنیا و ماہیما سے بے خبر تھی۔ اس کی رُوح اپنے رحیم خاں کے استقبال کے لیے سریا انتظار رہی تھیں لیکن اس کے جسم کو ابھی تک کتنے چھوڑ رہے تھے۔۔۔۔۔ مصطفیٰ خاں سیماں ڈرینگ

گاؤں پہنے اس کے سامنے بھجو کے گدھ کی طرح مٹلا رہا تھا۔ میر پر سکاچ و سکی کی بوتل جگہ کارہی تھی۔ وہ اپنی پانہ میں چیل پھیلا کر کہتا تھا، کہ میری جان، اگر میرے سینے سے لگ جاؤ۔ تم بڑی مظلوم ہو۔ — تم بڑی غریب ہو لیکن میں ایک امیر انسان ہوں میں کچھ روز کے لیے تمھیں ملکہ بنائے رکھوں گا۔ تمھارا رحیم خاں معلوم نہیں کہاں کھو گیا۔ شاید وہ کسی دیرافے میں مرا پڑا ہو۔ لیکن تم اس فرضی ہستی کی یادیں اپنی جوانی نہ گنواد! میری جان، آؤ۔ میرے سینے سے لگ جاؤ۔ اب تم اپنے آزاد وطن میں آگئی ہو۔ — اب تمھیں کسی بات کا ڈر نہیں۔ یہ ہمارا وطن ہے — یہ ہمارا آزاد وطن ہے۔ پاکستان زندہ باد! پاکستان پاٹندہ باد!

— دشاد کے لگے میں ملا علی بخش کی تسبیح لکھ رہی تھی۔ جب مصطفیٰ خاں سیماں کی زبان لپک کر تسبیح کے دالوں کو چوتھی تود دشاد کو یہ محبوس ہوتا کہ ایک مسلمان سجاں سنگ اسود کو بوسہ دے رہا ہے —

دو چار دن میں جب مصطفیٰ خاں سیماں نے اپنے حج کے ارکان پورے کر لیے تو دشاد پھر مہاجر خانے والیس آگئی۔ سخفا محمود شیشه کا لٹو چلا سڑھتا۔ اس نے ستلا ستلا کر، تالیاں، سچا بچا کر دشاد کو سمجھایا کہ زہیدہ باجی بھی موڑ میں بیٹھ کر دادا میاں کے پاس گئی تھی۔ — دادا میاں نے شیشه کا یہ لٹو بھیجا ہے۔ یہ رہبر کی گیند، یہ زنگ دار مٹھائی، آج وہ پھر موڑ میں بیٹھ کر دادا میاں کے پاس گئی ہے۔ موڑ بُلوں پُلوں کرتی جا رہی ہے۔ اب وہ پھر دادا میاں سے پیسے لائے گی۔ نئے نئے بوٹ لائے گی — تلے دار ٹوپی لائے گی —

لاہور، لاہور نہ تھا، مدینہ تھا۔ لاہور والے، لاہور والے نہ تھے۔

انصار تھے ————— نہیں ! وہ تو شاید انصارِ مدینہ سے بھی کچھ درجہ افضل تر  
 تھے۔ یہاں دشاد کے لیے ہر روز ایک نیا جسم خار پیدا ہو جاتا تھا —————  
 زبیدہ کے لیے ہر روز ایک نیا دادا جنم لیتا تھا۔ بیٹیوں کے لیے، نئے نئے باپ  
 تھے۔ بہنوں کے لیے نئے نئے بھائی ————— جسم کا رشتہ جسم سے ملتا تھا،  
 خون کا رشتہ خون سے ————— )

رَبُّ الْعَالَمِينَ

مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیر ہے یا میر

### کراچی

دیشاد نے کھڑکی سے منہ نکال کر دیکھا۔ صدر کے اسٹیشن پر گہا آئی تھی۔ ریفیو جی سپیشل کی مخلوق گاڑی سے نکل نکل کر پلیٹ فارم پر جمع ہو رہی تھی۔ سلا اسٹیشن کچھ بھر ہوا تھا۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے بھیر بادلوں کی طرح چھٹ گئی۔ پلیٹ فارم پر چھٹلی، کچھ باہر جانے والے مسافر اور کچھ ٹکٹ چیکر باقی رہ گئے۔ آن کی آن میں ریفیو جیوں کا جنم غیرہ بے ما یہ قطروں کی طرح کراچی کے محیط بے کل میں غرق ہو گیا، جیسے سندھ کی تیز و تند لہر ساحل کے خس و خاشک کو اپنے توج میں بھا لے جائے یا جیسے سورج کی کرنیں شہر کے موتویوں کو اپنے دامن میں چھپا لیں یا جیسے شراب کا نشہ دل کے گوشے میں لرزنده انڈیشوں کو اپنے خمار کی آغوش میں سلا دے یا جیسے کسی گلتی ہوئی۔ مرٹی ہجومی لاش کا تعفن گلاب اور مرتیں کی شہر کو اپنے سینے کے اندر جذب کر لے،

منظر آئی لینڈ تیر تیر قمقوں کی روشنی میں جگمگ کر رہا ہے — کلفٹن بیچ  
 چودھویں رات کی چاندنی میں نہایا ہوا ہے۔ سمندر کی لمبیں ساحل کو پھیپھی کر ایک  
 مدھوش سارباب سجا رہی ہیں۔ لہروں کا پانی ریتے ٹیلوں سے ٹکرا کر فضا میں نقری  
 فواروں کی طرح جھملتا رہا ہے۔ ہوا میں ایک نازک سی خنکی ایک نرم سی ملامت  
 ہے۔ زندگی کی ایک میٹھی سی تڑپ بیچ پر محمود سانپوں کی طرح لہرا رہی ہے۔  
 چار جوان دسکل کے جام بھر کر سوڈا ملار ہے میں۔ ہاتے ہاتے دلی: ایک  
 نیشنے پر ہاتھ مار کے آہ بھری۔

عدسوار دمۃ الکبری میں دلی یاد آتی ہے۔ ہاتے ری دلی "دوسرے نے  
 واپیلا کیا۔

"کون جاتے ذوق یہ دلی کی گلیاں پھوڑ کر  
 ہاتے دلی، تیری خاک پاک کی کشش  
 تیسرا انوں پر پھیپھی مار کے ماتم کرنے لگا۔

چوتھا جوان سخیدہ رہا۔ وہ دسکل کا جام ہونٹوں سے چپکائے مرتقبے میں گیا  
 ہوا تھا۔ جب اس کے ساتھیوں نے ذرا زد شور سے دلی کی نوح خوانی شروع کی،  
 تو وہ چونکا ————— ایں؟ یہ تو وہی سالی کرایجی رہی۔ والش خواب تھا  
 جو کچھ کر دیکھا جو سنا انسان تھا، کیا دیکھتا ہوں کہ چاؤڑی بازار میں چہل پہل ہے۔  
 بی چاند جان کا بالا خانہ ہے اور وہ ساتی موش اپنی حناتی انگلیوں میں ساغر اٹھائے آ  
 رہا ہے، لارہا ہے، آرہا ہے، لارہا ہے۔"

ہاتے ہاتے دلی! ہاتے ہاتے دلی! ہاتے بی چاند جان، ہاتے بی چاند جان۔  
 وہ چاروں ایک فضیح دلیغ مرثیے کی دھن میں کھو گئے اور ٹھنڈی  
 ریت پر لوث لوث کر اپنی جنت گم کر دے کا ماتم کرنے لگے۔

کچھ فور پرے ایک مقطع و قشیر ع بزرگ پان چبار ہے تھے۔

ان کے آگے چند عقیدت مند دو زانو بیٹھے تھے۔

”دلی گئی، دلی والے گئے، سب کچھ گیا لیکن کچھ نہ گیا؛“

”پان لاو“ بزرگ نے فرمایا۔

اُن کی خدمت میں پان بیٹھ کیا گیا۔

ستبا کو تو اچھا ہے بھتی،—— بزرگ نے راتے دی۔ ”کہاں سے لائے؟“

کسی نے عرض کیا، ۲۹ روپے سیرے ہے، لکھنؤ سے منگوایا تھا۔

”لماں، تو میں کہہ رہا تھا کہ دلی گئی،“ بزرگ نے اپنی ٹوپی ہٹوئی تماں کو از سر نو پکڑا۔

”در دلی والے گئے، کیوں؟ جانتے ہو جعلہ کیوں؟“

عقیدت مند سوچنے لگے کہ کیوں؟ ان کے چھوٹوں پر کیوں کی سوالیہ علامت

محضیہ بن کر لگ کر گئی۔

بزرگ نے خود ہی جواب دیا یہ وہ لال قلعہ، وہ جامع مسجد، وہ قطب میناڑوہ

قبیل جن میں بزرگوں کی شاک دو بول دعا سنتے کے لیے ترس رہی ہے۔ غالبت کا مزار،

شیخ المشائخ حضرت نظام الدین اولیا مکا مرقد نور—— سب چلے گئے۔

سب ہاتھوں سے بکھر گئے۔ تم کو گے اپنے نصیب، میں کہتا ہوں، اپنے اعمال،

ہمارے اپنے ناگفتہ بے اعمال، میں تم کو بتاتا ہوں تقدیر اُتم کیا ہے؟——

”پان لاو“

پان حاضر کیا گیا۔

”دیمین تم کو بتاتا ہوں تقدیر اُتم کیا ہے

شمشیر و سنان اقل طاؤس و باب آخر“

”دھرت تیرے کی؟“ وسکی والی پارٹی کا ایک جوان اپنے ساتھی پر گرج رہا تھا۔

”چاند چان میری تھی، وہ مجھ پر عاشق تھی۔ وہ تیرے سے منہ پر تھوکتی بھی نہ تھی۔ ہاں۔“  
دوسرے جوان سوڈے کی تعلیم اور غالی گلاس جمع کر کے ایک عملی ساجواب  
دیتے کی تیاری کر رہا تھا۔

ان کے باقی دوسرا تھی ایک دوسرے کے سر پر اکٹا کھڑے ہوئے کی مشق فرا  
رہے تھے۔ ایک پارسن لڑکی ان کی حرکات پر قمیٹے لگا کر فضا میں ایک لذینہ ساتھ،  
ایک پیارا سار تعالیٰ پیدا کر رہی تھی۔ اس نے نہانے کا رنگیں بیاس پہنچا ہوا تھا اس  
بینگ کا سیویم میں اس کا پھرہ را بدن قوس کی طرح تناہوا تھا۔ — بزرگ ذمہ بہے  
تھے — پان لاو۔

چیف گورٹ اور اسمبلی ہاں کے درمیان مہاتما گاندھی کا بہت پھرے پرچکس  
کھڑا ہے کہ کبیں انصاف اور سیاست ایک دوسرے کے قریب نہ آنے پائیں۔ دو  
سائیکل سوار ٹھہر کر اس کا جائزہ لیتے گے۔ ایک نے اس کی لادھی چھیننے کی گوشش کی  
دوسرے نے اس کی عنیک کو اڑانا پا لام۔ جب وہ دونوں اس گوشش میں ناکام  
ہوئے تو ایک نے اپنی رومی ٹوپی اتار کر بنت کے سر پر کھدی اور وہ خوش خوش ہاں  
سے چل دیئے کہ انہوں نے چکر چکپے اس بنت کو مسلمان کر لیا۔

ایک ہندو خاندان ہجرت کر رہا تھا۔ ان کی خوشناکوٹی کے سامنے چار اونٹ گاڑیاں  
سامان سے لدی کھڑی ہیں۔ لوہے کے ٹنک بچڑے کے سوٹ کیس، لکڑی کی  
پیٹیاں — سامان میں ایک طوٹے کا پنجھرہ بھی ہے۔ طوٹا مٹر کی سچلیاں  
کھارہا ہے۔ جب کوئی اس کے پاس سے گزرتا ہے، تو وہ نیم بازاً نہوں سے اس  
کی طرف یوں دیکھتا ہے گویا کہ رہ ہو کر نوسالو امیں بھی چلا۔ — اب میں دیکھوں۔

گاہ تم اپنا پاکستان کیسے بناتے ہو ۔۔۔

قصروہ ہوٹل کی رقص گاہ میں اُنکسٹراچ رہا ہے۔ ہوٹل کے میجر نے سٹچ پر  
اُنکے اعلان کیا کہ آج رات کی نصف آمدی قائدِ اعظم ریلیف فنڈ میں دی جاتے گی۔  
لوگوں نے گرجوشی سے تالیاں بھایاں۔

”میراجی کراچی سے آگاہیا ہے“، ایک دیدہ زیب بیگم نے شیری کا گلاس سس  
لیب لیعن سے لٹکا کر کہا ”محلڈیز کچھ روز کے لیے بمبئی گھوم آئیں“،  
اس کا ساتھی شپین پی رہا تھا یہ اب تو بمبئی بھی مرحوم ہو گئی بیگم — سالی کا لگرس  
اس پریس صفرتی کو راہب خانہ بنانے پر تلقی ہوئی ہے، زوکی، نشیری، نجن، شپین  
— اب مستتا ہوں کہ بیس پر بھی بندش لگانے کی سازش ہو رہی ہے؟“  
”ارے ماں“ بیگم کو ایکا ایکی یاد آیا۔ ”ابھی اگلے روز پروفیسر گفتاشام کا خط آیا تھا۔  
پرہیش کے ہاتھوں بے چارہ محروم ہو گیا ہے۔ ایک کیس و سکی منگوانی ہے، کسی طرح  
بچھاؤ، ڈیر“

ایک غیر ملکی سفیر کا سیکرٹری دوسرے غیر ملکی سفیر کے سیکرٹری سے سرگوشی کر رہا  
تھا۔ مجھے کہا جی میں دوچینوں بہت پسند ہیں۔“

”مجھے تین“ دوسرے نے کہا۔

”دپار سی رکنیاں، اور مسلمان عورتوں کے بر قعے۔“  
”مجھے بر قعے والیاں بھی پسند ہیں؟“

مودا لندن پرے کو رداق ہو۔ ان مدقق عورتوں کو کون چاہے گا جلا؟“  
دنیعیں میں چاہتا ہوں۔ یسوع مسیح کی قسم، مجھے یہ بیمار جس پسند ہے پیلے پیلے

گاؤں میں نیلی نیلی رگوں کی لکیریں، اس پر غاز سے کاغذ بار۔ خداون کے موسم میں گلاب کی پتیاں — ہاتے ہیں نے ایسا حسین امتحان کیا نہیں دیکھا —  
بواستے دوسروں دوسری یہ

”ایک ہی بات ہے تم پلا قیا میں پلا دل — ہمارے دونوں ملکوں کا بلند نصب العین مشترک ہے۔ ہم اس اشتراک کو مستقل بنانے کی ہر ممکن گوشش کیں گے — تمہاری صحت کے لیے“

ایک مسلمان ایڈبیٹر میں سکونت سے جی بہادر ہاتھا، موقع پاکروہ شراب اور پڑپت کے ایک بڑے تاجر کو گھیر کر کھڑا ہو گیا  
وہیں نے سنائے کہ پاکستان بننے کے بعد کجا ہی اور لامہ ہو یہیں ولایتی شراب کی کچھ پہنچ سے تلگنی ہو گئی ہے؟“ ایڈبیٹر نے اپنے ایڈبیٹریل کے لیے مواد اکھٹا کرنا شروع کیا۔

”غلط“ تاجر نے گرم جوشی سے تردید کی۔ ”بالکل غلط، آپ بھی کیا عجیب افایں لے اڑتے ہیں۔ تلگنی تو کیا اگر دلگنی بھی ہو جاتے تو غنیمت ہے۔“  
”افسوس“ ایڈبیٹر نے اصرار کیا۔ ”کیا یہ امر اس نئی اسلامی حکومت کے لیے شرمناک نہیں؟“

”پاکستان دنیا کا پانچواں بڑا اور مسلم ممالک میں سب سے بڑا ملک ہے“ تاجر نے ایڈبیٹر صاحب کی معلومات میں اعتماد کرنے کی گوشش کی:  
”عکیا یہ امر اس سب سے بڑے مسلم ملک کے لیے شرمناک نہیں؟“ ایڈبیٹر صاحب برابر مُصر تھے۔

”وقبده“ تاجر نے دلکش کامبا سا گھونٹ بھر کر کہا۔ ”آپ ریاست بنارہے ہیں۔  
مسجد نہیں“

”وہ کالے کالے بُر قفعے“ اور دوسرے غیر ملکی سفیر کا سیکرٹری پہلے غیر ملکی سفیر کے سیکرٹری سے کہہ رہا تھا۔ درسرخ و سبز راشم کے سربراہتے ہوتے نقاپ، بُر قعن کی اوٹ میں جھانکتے ہوتے گول گول، پیلے پیلے، لال لال چہرے، سندھل بانہیں۔ راشم کی تہوں سے جھلکتے ہوتے مخدوطی ہاتھ ————— کنواری مریم کی عصمت کی قسم میں نے ایسے برپارے کہیں نہیں دیکھے۔ جب میں انھیں الفشن سٹریٹ کی دکانیں میں بھیلیاں گرتے دیکھتا ہوں، تو میراجی بے اختیار چاہتا ہے کہیں ان کے قدموں میں گرجاؤں اور آن کے نازک اور سبک پاؤں مجھے اپنی مٹھوکوں سے روندتے چلے جائیں، روندتے چلے جائیں۔

”بواستے دوپیگ و سکی اور سوڈا۔“ پہلے نے آوازوی۔

”اس بار میری طرف سے۔ بواستے! دو سوڈا، دو سکی!“ دوسرے نے کہا۔  
”ایک ہی بات ہے، تم پلاو، یا میں پلاو! — ہمارے بہادر ملکوں کا نصب العین ایک ہی ہے۔ ہم پاکستان کے خانہ بدش مهاجرین کی کیسان مدد کریں گے!“

”یہ دولی کھوٹی ہے، جی!“ بس کے کندکٹرنے کو خٹکی سے کہا۔  
”اس سے بدل دو!“

”یہ دولتی میں نے نہیں بنائی!“ پنجابی پسختنے ترکی پر کی جواب دیا۔ ”میں یونی  
کوئی ولی یا لکھنؤت سے نہیں لایا۔ میں تھیں ہرگز دوسری دولتی نہ دوں گا!“  
کندکٹر نے بس روک دی۔ ”جب تک تم مجھے دوسری دولتی نہ دو گے یہ بس اگلے نہیں جائے گی!“

کچھ پنجابیوں نے کندکٹر کو چند فیض و بلیغ گالیاں دیں۔ سالے سندھی ہفت

پاکستان مل گیا سالوں کو، ہم بھی دو دن میں مزارع ٹھکانے لگا دیں گے، یہاں؟  
کندھ کٹر اور ڈرائیور باہر نکل کر ایک طرف کھڑے ہو گئے بس اسے پنجابی،  
پٹ پٹا کر یہاں آئے تو سالوں کا دماغ ہی نہیں ملتا۔ سر پر ہی چڑھتے آتے ہیں، سور  
کے پتھے، جیسے ان کی ماں کے خصم کا گھر ہے یہاں؟

ایک ہندو را گیریہ قصیدہ سن کر بھٹھر گیا اور داد کے طور پر اس نے کندھ کٹر  
اور ڈرائیور کو ایک ایک بیڑی پیش کی۔

دو بنگالی یہ نگامہ دیکھ کر بس سے نیچے اتر آتے۔

دلارنس روکھتمنی ڈور ہے جی؟ ایک نے پوچھا۔

”یہی کوئی دو فرلانگ اور ہوگی؟“ دوسرے نے اندازہ لگایا۔

”داؤٹھلتے ہی چلیں۔“

جب وہ دو نسل بس سے ایک محفوظ فاصلے پر پہنچ گئے تو انہوں نے دو تین  
واںے حادثے پر جی کھول کر تبصرہ کیا۔ ”لڑنے دؤسا کے سندھیوں اور پنجابیوں کو، کہتے  
ہیں پاکستان کی زبان اردو ہوگی؛ چھپی، گویا شرمنگکہ بجا شاہماری قومی زبان  
ہی نہیں... چھپی۔“

صدر کے چوک میں ایک ایڑانی ہوٹل والا، ایک چھاٹری والے پر گرج رہا تھا۔  
”تم یہ گندے کیلے یہاں نہیں رکھ سکتے۔ میرے ہوٹل میں کھیلیاں آتی ہیں۔  
— ہیں۔“

”ابے چل، ہوٹل کے پتھے؟“ چھاٹری والا اکٹھ رہا تھا۔ یہ پیشی تیرے باہرا  
کی ہے؟“

ایڑانی نڑا ہوٹل والے نے پاڈن کی ایک بھرپور ٹھوکر سے کیلوں کی چھاٹری الٹ

دی۔ چھا بڑی والا لپک کلاس کی طبقنگوں سے چھٹ گیا۔  
ایک کافی میبل نے اگر چھا بڑی والے کے منڈ پر زور کا تھپٹ رکارا۔ مساے  
حرامی کتنی بار کہا ہے، یہاں پکری مت کرو لیکن منتنے ہی نہیں حرامزادے چلو،  
تھانے چلو۔“

چھا بڑی والے نے گزگڑا کر شوشاں دکی، کہ دار و فده جی، یہیں اجمیر شریف سے کیا  
ہوں۔ میرا گھر بار سب آٹ گیا ہے۔ میری اندھی بہن بیرے ساتھ ہے۔ مجھے چھوڑ  
دو۔ یہیں پھر ہمارا چھا بڑی نہیں لگاؤں گا۔

لیکن قانون، قانون ہے۔ قانون کی نظر یہیں نہ اجمیری کا امتیاز ہے نہ لا ہجوری کا۔  
نہ اندھی بہن کی تیزی ہے۔ نہ آنکھوں والی کی۔ کافی میبل نے اپنا فرض منصبی بڑے  
احسن طور پر انجام دیا اور چھا بڑی والے کو آگے لگا کر تھانے لے گیا۔  
جب تھانیدار نے اندھی بہن کی تفصیل متی تو اسے  
کافی میبل کی نالائق پر ٹرا غصہ آیا کہ کیوں نہ وہ اس کی اندھی بہن کو بھی ساتھی  
بیتا آیا۔

”زو اور دو چار ۔۔۔ چار اور تین سات ۔۔۔ سات اور نو کے ہوتے ہیں؟“  
چیل رام دلال نے خوشی محمد دلال سے پوچھا۔  
خوشی محمد دلال چاتے سے مکھی نکال کر جچھے چھپک رہا تھا۔ ادھ موئی مکھی کو  
فرش پر گرا کے اس نے چاتے کا ایک لباس اگھونٹ بھرا۔  
”دسات اور نو سو لے“ چیل رام نے خود ہی حساب لگایا۔ یہیں نے کہا اُستاد،  
سینر انہیں رہا۔“

خوشی محمد دلال نے اپنا لٹکا ہوا اچھلا ہونٹ سمیٹ کر چاتے کا ایک اور لباس

گھونٹ لیا۔

”سچ پوچھو دوست تو بڑا کراہ سیزرن لگاتھا“ چیلارام کے گالوں کی کچوریاں خوشی سے بچوں رہی تھیں وہ ایک سیزرن میں سولہ چھوکریاں! رام قسم میں نے توابیا دھندا ساری عمر نہیں کیا تھا“

اطمینان قلب کے افہار کے طور پر چیلارام نے چاند تارے والی جناب کیپ اتار کر اپنی بخی چندیا کو زور زور سے سلا لیا۔

خوشی محمد کا لکھا ہوا سچلا چونٹ اور بھی لٹک گیا۔ اور رہ عمل کے طور پر اس نے چانے کا ایک طویل سا گھونٹ سڑاپ لیا۔

”تم سالے قسمت کے حصی ہو، خوشی محمد منمنیا یا۔ یہ چھوکری پر چھوکری اتارتے تھے۔ یہاں مشکل سے صرف تین ہاتھ آئیں“

”تین چھوکریاں! اتحتو! اچیلارام نے طنز اریسٹو ران کے فرش پر بغیر کا ایک ٹڑا سا غلفہ تھوک دیا۔ دو کالی کالی پور نہیں۔ کوئی آنکھا اٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا اس تو میرے پاس جو سے انمول دانے تھے، یار..... گرم گرم، سخت سخت پتھانیں۔ ناڑک لچک دار دلی والیاں اور سپردہ پتیاں لے والی جتنی، ہلتے ہلتے ہیرا تھی، خوشی محمد بیڑا!“

چیلارام نے ایک کھارا بسکٹ انگلیوں کے درمیان دبا کر توڑ دالا۔

”وہ سالا برا ذُن اسے پورٹ سعید لے گیا۔ کتنا تھا، بڑا کام دے گی وہاں۔

— میں نے کہا خوشی محمد، یہ پورٹ سعید کس طرف ہے؟“

”ہو گئی کہیں۔ خوشی محمد کا بیو پارڈ رامندا تھا پس چاٹے منگواد اب تو کوئی سالی ریفیو جی ٹرین بھی نہیں آتی۔“

گرم چانے کے دوسرا کپ پر وہ دونوں پھر اپنے اپنے خیالوں کی دنیا

میں کھو گئے۔ چیلارام دلال اپنے انمول والنوں کا حساب لگا رہا تھا۔ جو اس کے اپنے ہاتھوں سے نکل کر رودے زمین کے مختلف حصوں میں بھرے ہوئے تھے۔ قاهرہ —  
لندن — پورٹ سعید — زبانے اس کے بیش قیمت تھے کہ کس شہستان کی زینت بنے ہوئے تھے کسی ولیدار آرام گاہ میں اس پڑیاے والی جنین کا جسم بھی ریشم اور کھواب کے گاؤں تھے کی طرح سجا ہوا ہو گا — چیلارام کے دل میں عجیب عجیب قسم کی آرزوں میں سراٹھا رہی تھیں۔ ایک بار اس کا جی چاہا، کہ وہ پر لگا کر پورٹ سعید جائی پڑے اور پانچ سو ستر روپے کے نوٹ سالہ ہوا فون کے منڈپ مار کے پڑیاے کی جتنی کو والپس لے لے اور اس کے گھنے ہوئے مغلیں گاؤں تھے ایسے جسم کو بانہوں پر اٹھا کر بھاگ آتے۔ طوفانوں سے لٹتا ہوا، سمندر کی لمبیں سے لٹکاتا ہوا، پہاڑوں کی چھاتی پر چڑھتا ہوا —

خوشی محمد دلال کی دنیا میں غم اور غصے کا دھواں چھایا ہوا تھا۔ پہلے تو یہ سالے ریفیو جی ہوانی چمازوں میں بھر کر لائے جاتے تھے۔ ٹرینوں پر ریٹنیں لدمی آتی تھیں۔ لیکن اب کچھ دنوں سے بازار سرد تھا۔ وہ ہر روز اخباروں میں نیتی تھی خبریں پڑھتا تھا — دلی بیس خون — کانپور میں خون — کلکتہ میں خون — احمد آباد میں خون — اجمیر میں خون — لیکن اس سلسلے خون کے ریلے میں ایک ریفیو جی ٹرین بھی کل الجی نہ پہنچتی تھی۔ خوشی محمد دلال کو اس بات کا سخت قلق تھا۔ پھر بھی اس نے کسی موہوم سی امید کا سہما رائے کر پھر پیسے کا خلن کیا اور اخبار کی جلی سرخیوں پر لمبا تی ہوئی نظر دوڑا تی۔ اخبار تھی پہنچو کر اگلا چھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ اب تو کشمیر میں بھی چھڑ گئی — جموں میں لاکھوں مسلمانوں کا خون ہو گیا — اب تو —

خوشی محمد دلال نے ہمسدن شوق ہو کر خبریں پڑھیں کشیر کی جنت میں بھی دفع

کے شعلے بھر ک اٹھتے تھے۔ زعفران کے کھیتوں پر اگ برس رہی تھی۔ بچپوں کے دامن میں شر رجل رہے تھے۔ نیم بہار کی جگہ دو گروں کی تلوار چل رہی تھی۔ ہزاروں مر گئے تھے، ہزاروں مر رہے تھے۔ ہزاروں بینڈگوں کی طرح چھپ چھپ کر، چوہوں کی طرح رینگرینگ کر اس آتش کدہ جہنم سے باہر نکلنے کی گوشش کر رہے تھے۔ خوشی محمد نے چیلا رام کی ران پر زور سے ہاتھ سارا۔ اب تو کشیر میں بھی لگ گئی ہے یا۔ میں نے کہا، چیلا رام، ذرا سُن لو؟ چیلا رام پورٹ سعید کے تصویر میں مگن تھا۔ پھر تو سبب منگے ہو جائیں گے؟ اس نے بے توہی سے پوچھا۔

لیکن خوشی محمد میں شاعری کی رُوح حلول کر آئی تھی۔ اس نے چٹمارے لے لے کر کشیر کی نازک بدن، سیم تن عورتوں کا ذکر سنایا۔ خوبصورت رینگین، گلخدار عورتیں — جن کے گالوں میں سبب ہوتے ہیں۔ چھاتی پر ناشاپاتیاں۔ ہونٹوں پر اشگور کا اس۔ انکھوں میں ڈل کی لمروں پر رقصندہ کنوں۔ لگے میں پہاڑی جھرنوں کا سروود۔ انگ انگ میں گلاب اور سوتیے کی رنگت۔ زعفران کی بھینی بھینی ملک — چیلا رام دلال کے منز سے رال ٹپکنے لگی۔ وہ آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا اور خوشی محمد کے لیے اس نے چلتے کا تیسرا کپ بھی مٹکوایا۔ پھر وہ سرستے سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور کشیر کے سینر کی امیدا فرا عنایتوں میں کھو گئے —

ہوا کے تھپیڑوں سے بادبائ لہڑا۔ موجود میں ایک ہلکا ساتھاٹھا — کشتی دلگانی اور وہ ستم کریٹھ قائم علی دائم علی کے پہلو سے لگ گئی۔

سیٹھ قائم علی دائم علی کی توند میں ہنسی کا جوار بھائی اس اٹھا اور پان کی پیک بج کچھ عرصہ سے اُس کے منز میں جمع ہو رہی تھی، بے اختیار بدر روکے گندے سے پانی کی طرح بیکھی۔

بوجھا ملاح بیڑی سلگا کر مسکرا یا پدکشیر سے آئی ہے سیدھا، اندھی ہے، بولو، کس طرف چلوں؟ پیرس یا ونیس؟“

سیدھے قائم علی دامِ علی کا ایک وفت پیرس میں بھی تھا یوں بھی اس نے پیرس کے تعلق بڑی دلاؤز بائیں من رکھی تھیں لیکن اس وقت وہ اس حضوری سی ڈگناٹی ہوتی کشتی میں اتنے بے سفر پر جانے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔ چنانچہ جب ملاح نے اسے پیرس یا ونیس چلنے کی دعوت دی تو وہ بوكھلا گیا۔

چالاک ملاح اس کی بوكھلا ہٹ پر مسکرا یا دیگھرا دنہیں سیدھا، دنہیں سے جاؤ گا، ہا! کیا جگہ ہے پیرس بھی! دیکھو گے تو سرجا گے، ہا! کیا جگہ میں خاصی چل پہل تھی۔ اتوار کی حضی منانے والے بجوم ادھڑا ہر گھوم رہے تھے۔ کتنے منوڑا جادا رہا تھا، کونی سینٹہ پٹ آئی لینڈ۔ اور ایک جہاز بیٹنی جانے کے لیے فلکاٹھارا رہا تھا۔ جہاز کے ڈیک پر سینکڑوں ریگیں ساڑھیاں پھر پھر طاری ہیں۔ لوگ دُو بیٹیں آنکھوں سے لگائے کراچی کی آخری جھلک دیکھ رہے تھے۔ جب جہاز روانہ ہوا، تو کچھ لوگوں نے اپنے سروں سے جناح ٹوپیاں اتار کر سمندر میں ٹیٹھ دیں اور ہوا میں گھونسے الہالمرا کر جبے ہند، کاغنڑہ لگایا۔

کشیر کی اندھی دوشیزہ سیدھے قائم علی دامِ علی کے پہلوستے لگی ایک گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جب نہوں کے تلاطم پر کشتی کا سینہ ڈگناٹا تو اسے اپنا ہلکا چمک کا شکارا یاد آتا، جو اسی طرح ڈل اور وول کی نازک نہوں پر تھر تھرایا کرتا تھا۔ پہلے دن جب اس نے سمندر کا چلو بھریا نی پیا تو اس سے قی اگنی۔ اُف! اکتنا کڑو اپانی تھا۔ ڈل کا پانی تو تازہ دودھ کی میٹھا تھا اور جسمہ شاہی کا پانی۔ ہاتے جیسے دودھ اور نکھن اور شہد کو برف میں لگا کر پیا جاتے وہ چاہتی تھی کہ ایک بار اس کڑوی جھیل کو بھی دیکھے کہ اس کا پانی کالا ہے یا سرخ؟ نیلا ہے یا سبزہ؟ لیکن ہاتے اس کی آنکھیں!

ایک دب بھاک اس کی غلائی آنکھوں میں چھیل دوڑ کی رطیف نیلام ہٹ اور کچے باداموں کی نازک راحت ہوا کتنی تھی لیکن اب ان کی جگہ گھرے گھرے زخم تھے۔ جیسے دواندھے اور تاریک کنوں کسی ڈور دراز فیرانے میں کھوئے پڑے ہوں — اب وہ اندھی تھی، بے بصر تھی، ایک بہادر ڈوگرنے اپنی سُگین سے اس کی آنکھوں میں بے ہوئے ٹلسی رنگ محل سماڑ کر دیے تھے،

ساحل کے ہنگامے سے ڈور ایک کالے رنگ کا جہاز سمندر میں تھا کھڑا تھا اس پر سترخ رنگ کے جلی حروف میں لکھا تھا کہ اس میں بارود ہے جب اس کی کشتی پاس سے گزری تو سیدھے قاتم علی دائرہ علی نے جلدی سے ٹوکی کا ہاتھ پھوڑ دیا۔ معاویہ ڈر گلا کر کیمیں یہ بارود بھاک سے اڑنا جاتے — جب کشتی ذرا ڈور نکل گئی تو سیدھے قاتم علی دائرہ علی نے پھر اس کے دونوں ہاتھ پر مکراپنی تو نہ پر کھلیے۔

کشتی ایک چھوٹے سے جزیرے سے جاگئی۔ جزیرے میں چند ماہی گیروں کی جھونپڑیاں تھیں۔ ملاح نے بتایا کہ اس عشرت کدے کا نام پیرس ہے۔ اس پاس اور بھی چند جزیرے سے تھے، ان کے ساحلوں پر بھی اکا ملکا گشتیاں کھڑی تھیں۔ کیمیں میں تھا، کیمیں نیپلز — کیمیں روم —

مالح نے بادبائیں کھول کر کشتی پر ایک سائبان سائبان دیا۔ پھر اس نے سیدھے قاتم علی کو آنکھ ماری ڈلو سیدھے، میں تو مچھلیاں پکڑنے چلا — تم مزے سے کشمیر کی بہاریں لوٹ —

عیدگاہ کے میدان میں ایک بینا بازار لگا ہوا ہے۔ یہاں ہر روز عید ہے ہر شب شب برات اٹاٹ کی چھوٹی جھونپڑیوں میں ننھے ننھے چراغ ٹھٹھا رہے ہیں۔ گوشت روٹی، سیلے ہوئے کپڑے، پرانے بوٹ، تازے پھل، لوہے کی میخیں، الٹوی کے صندوق،

چھڑے کی کریاں، تیل، اپار، صابن — بے گھرا دربے درمہا جرسہارے  
کی بہر مکن روٹی خام کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک عجیب قسم کا اہمیناں، ایک عجیب قسم  
کی ابدیت اس ماحل پر جاری و ساری ہے — جسے دیکھ کر یہ گان ہوتا ہے  
کہ زندگی کا یہ بھٹکا ہوا کاروں آخر اپنی متزل مقصود پر پہنچ گیا ہے۔

ایک جھونپڑی میں چادر تان کرد و جھٹے کیکے ہوئے ہیں۔ سامنے کی طرف اشادو  
پکوڑیاں تل رہی ہے و پھلی طرف زیدہ وہی بڑے لگائے بیٹھی ہے۔

ایک لمبا تڑنگا پٹھان پکوڑیوں کے سامنے پسکڑا امارے بیٹھا ہے۔

”و گرم گرم پکوڑیاں ہیں خان، — عالو — بولو کتنے کی بُدُل؟“  
”دنزم ہے، خو، گرم ہے؟“ پٹھان نے آنکھ ماری۔

”ہاں خان انزم ہے، خو گرم ہے؟“ دلشاو کڑھی منڈ کے سامنے کر کے مسکنا۔  
دلشاو کی مسکلاہٹ میں بھی عجیب جادو تھا۔ اس کی ایک مسکلاہٹ پر دلشاو کو  
رجیم خان نے قسم کھالی تھی کہا گر سورج یا چاندیا تارے سے بھی اُسے اٹھا لے جائیں تو  
وہ ارض وہاں کی دستیں پھاند کر اُسے چھین لاتے گا؛“

پٹھان نے ہونٹوں پر زبان پھیری بدخواہیک روپیہ؟“

”وہ نہیں خان، خو پائچ روپیہ —“

”دہٹ، خو، ڈھانی روپیہ؟“

”و خو، پائچ؟“

پٹھان نے اپنی جیب کے پیسے گئے۔ اس کے پاس تین روپے چار آنے  
تھے اس نے پونے دو روپیہ کا ادھار کرنا چاہا ملکیں دلشاو نے اُسے مجبور کر دیا کہ  
خان، قرض محبت کی تیچی ہے۔ تم پیسے پورے کر لاؤ۔ میں تمھیں جھٹ پٹ نرم نرم  
گرم گرم پکوڑیاں اتار دوں گی؛“

پھر ان مایوس ہو کر دوسری طرف چلا گیا۔ دل ان اس نے دہی ٹروں کا سودا کیا ہے۔ زبیدہ ابھی بچہ تھی، نادان تھی، مقصوم تھی، اس لیے وہ پونے دور پے کا دھاران گئی۔

زبیدہ نے دلشاہ کو آواز دی: "ہم ذرا اس طرف دھیان رکھنا محدود سورہ ہے۔ میں ذرا خان کے ساتھ جا کر دہی لے آؤں"۔

اسی طرح جب دلشاہ بھی اپنی پکوڑیوں کے لیے بین لینے کسی گاہک کے ساتھ جاتی ہے تو اپنی بچی کو زبیدہ کے سپرد کر جاتی ہے۔ دہی اور بین کی اس ملاوٹ پر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ملت کا مستقبل پروان چڑھ رہا ہے۔ جب دلشاہ کی بچی نرم نرم، گرم گرم پکوڑیوں پر پل کر جان ہو گی۔ جب زبیدہ کا محمود ہی ٹوں کی چاٹ پر سیانا ہو گا، تو اسلام کی برادری میں دو گرانقدر رکشوں کا اضافہ ہو جائے گا۔ ایک مضبوط بھائی، ایک خوبصورت بھن — جسم کی مضبوطی اور جسم کی خوبصورتی ایسی تو وہ ایسٹ اور گارا ہے، جس سے بہادر قویں تعمیر ہوتی ہیں — جسم کی مضبوطی اور جسم کی خوبصورتی! یہی تو وہ نعمتِ عظیمی ہے، جو نعمتوں والے عظمتوں والے باری تعالیٰ نے تم کو عطا کی ہے۔ وہ تو بڑا ہی رحیم اور شفیق آقا ہے۔ وہی مشرق کا ماں ہے، وہی مغرب کا مولا ہے۔ اُسی نے دنختوں پر غرے میں اور انارکلے میں دہی دریا قل سے متوجہ اور مونگے نکالتا ہے۔ وہی جنت کا رحمان ہے، وہی دوزخ کا قہار ہے — پھر تم اپنے پروردگار کی بس کس نعمت کو جھپٹاؤ گے؟

## دیباچہ

مشی پر یہ چند سے لے کر اب تک کے افسانہ نگاروں کے درمیان اندازہ بیان کی متعدد مثالیتیں موجود ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس دور کے افسانہ نگاروں کی انفرادیتیں اپس میں اس طرح پیوست ہیں کہ ایک دوسرے سے الگ پہنچانا شوال ہے۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ ایک ہی دور میں سانس لینے اور ایک ہی قسم کے سائل سے نہیں کی وجہ سے ان افسانہ نگاروں کے اسلوب بیکارش کی سرحدیں بعض مقامات پر ایک دوسرے کو چھوٹی ہوئی گزر جاتی ہیں۔ قدرت اللہ شہاب بھی افسانہ نگاروں کی اسی پودے سے تعلق رکھتا ہے جن کے سائل یکساں تھے اور جو حقیقت پسندی کی راہ سے ان سائل سے نہیں تھے، مگر کم سے کم ماں جی ٹکے مطالعہ سے تو مجھ پر پیریت انگلیز اکٹھاں ہوا ہے کہ شہاب کا اندازہ بیان اپنے ہم عصروں میں سے کسی سے بھی مثال نہیں ہے۔ بعض مقامات پر شہاب کی سادہ زبان کے حلاوه اس کی بیانی تکلفی اور بے ساختگی منٹو کی یا دضور دلاتی ہے۔ مگر منٹو کے سادہ جملوں کی بھی باقاعدہ نہیں اور

دھاریں ہوتی تھیں۔ اس کے پر عکس شہاب اپنے سادہ سادہ جلوں میں بظاہر سادہ سی بات کر کر آگے بڑھ جاتا ہے مگر انسانہ مکمل کر لینے کے بعد پڑھنے والے کے تحت الشعور میں ان جلوں کا گمراہ اور بھرپور شفوم دکتا رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شہاب کا افسانہ ایک بار پڑھ لینے کے بعد اسے ایک بار پھر پڑھنے کو جویں چاہتا ہے۔ یہ خصوصیت بہت کم افسانہ نگاروں کو مسلط ہے۔

”ماں جی“ میں شہاب کے صرف افسانے شامل نہیں ہیں۔ اس مجبوسے میں افسانوں کے علاوہ خاکے، مکالمے، انشائیتے اور سفرنامے بھی ہیں۔ مجبوسے کی ترتیب کا یہ طریقہ ہمارے متوجہ معیاروں کے مطابق نہیں ہے مگر اس مجبوسے کے افسانے خاکوں سے، اور خاک کے مکالموں سے، اور مکالمے انشائیتوں سے، اور انشائیتے سفرناموں سے پوری طرح مربوط ہیں اور ان کے درمیان باہمی ربط، شہاب کے کہانی ننانے کے منفرد اندازتے پیدا ہو اتے۔ وہ خاکے، انشائیتے اور سفرنامے لکھتے ہوئے جویں افسانہ نگاری رہتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس طرح شہاب، شاید قطعی غیر شعوری طور پر، اُردو افسانے کے ایک نئے ادب کی جلوہ گری کا سامان کر رہا ہے۔ آج کل ہمارا جدید تر افسانہ تحریک کا شاہکا ہے (اور تحریک کو حقیقت نگاری کا رو عمل کہا جاتا ہے، حالانکہ وہ دراصل حقیقت سے فوار کا ایک بار عجب نام ہے)۔ جب ہمارا نیا افسانہ تحریک کے چنگل سمنسلکے گا۔ اور اُردو افسانے کو اگر زندہ رہنا اونکھڑا ہے تو اُسے اس گورکھ دھندے سے نکلنا ہی ہو گا۔ — تو اُردو افسانے کی ہستیت میں شہاب کا یہ اجتہادِ مئی نسل کی رہنمائی گرے گا۔ ظاہر ہے کہ فن افسانہ نگاری کے بعض متفقہ تقاضے تو صدور ہیں مگر یہ صرف تقاضے ہیں، ساچے نہیں ہیں۔ ہر افسانہ اپنا ساچہ آپ ہی تیار کرتا ہے بلکہ بعض اوقات تو افسانہ نگار اپنے ہی افسانے کے سامنے بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس صورت میں یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ افسانہ آج بھی اسی طرح لکھا جاتا رہے جس طرح پہمیں چند یا کرشن چند یا مٹھی یا مٹھی یا

نے لکھا تھا۔ شاعری کی طرح افسانہ نگاری کے بھی بے شمار تینتی امکانات میں صرف تجربے کا حوصلہ شرط ہے۔ شہاب میں یہ حوصلہ موجود ہے۔ اور اس مجموعے کے مندرجات اس حقیقت پر مشاہد ہیں۔

شہاب تنوع موضوعات کا افسانہ نگار ہے۔ وہ کسی ایک موضوع، انسانی زندگی کے کسی پہلو کا "سپیشلیست" نہیں ہے۔ جو بھی موضوع اس کے گھر سے اور باریک مشاہدے سے گزرا ہے اور جس بھی واقعے نے اس کے احساس کو چھیڑا ہے، اسے افسانے یا انسانوںی تحریر کی صورت میں اس اضافے کے ساتھ پیش کر دیا ہے جو کسی تحریر کو فن پارہ بناتا ہے جو حقیقت اور فتنی حقیقت میں اسی اضافے کا ذائقہ ہے۔ یہیں سے خبر نگار اور افسانہ نگار کی لا ہیں ایک دوسرے سے الگ ہوتی ہیں۔ خبر کا دل عدالت یہ ہوتا ہے کہ کسی مقام پر ایک خوشگوار یا ناگوار واقعہ ہوا ہے، مگر افسانے کا درد عمل یہ تو تھا ہے کہ یہ واقعہ ہو رہا ہے اور یہ واقعہ ہم پر سے گزر رہا ہے۔ اسی لیے تو فن کو کہدا رسانی کا منصب حاصل ہے یہاں مجھ پر الزام ٹایپ ہو سکتا ہے کہ میں شہاب کے فن کو مقصود سے "آلوہ" کر رہا ہوں۔ مجھے یہ الزام قبول ہے کیونکہ میری نظر میں یہ "آلوہ" سچے اور اعلیٰ فن کی سب سے بلیتی متاع ہے۔ پھول خوبصورت چیز ہے مگر پھول آکانے والے کے ہاتھ۔ سوندھی سوندھی مٹی سے سنتے ہوتے ہاتھ اس سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں۔ تخلیق کا ہمہ باقی رہنے والاحسن اسی "آلوہ" ہے، میں ہے اور میں خوش ہوں کہ شہاب کا مجھوں اسی حسن سے "آلوہ" ہے۔

شہاب کے افسانوں اور خاکوں وغیرہ کے لئے حد تنویر موضعات، عالم موجود انسانوںی موضوعات سے بیکسر الگ ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ سب اس کی تنوع زندگی کی دین ہے۔ مگر لوگوں نے تو شہاب سے بھی زیادہ تنویر زندگیاں بسر کی ہیں لیکن نہ ان کے ذہنوں کے پتھر پچھلے اور نہ ان کے دلوں کے بجزیں سے کوئی اکھوا پھوٹا۔ یہ فن کا ر

شہاب ہی ہے جو اپنے مشاہدے کے دروازے چھٹے رکھتا ہے۔ اور کوئی شخص سے شخصی تھصیل بھی ایسی نہیں جو اس کے دماغ و دل پر اپنا عکس ڈالے بغیر گزر جائے۔ میں شہاب کے مشاہدے پر بطور خاص اس لیے زور دے رہا ہوں کہ اس کا یہ تکلف ان اور بے ساختہ اندازِ بیان اس امر کی دلیل ہے کہ اس نے جو کچھ بھی لکھا ہے، براہ راست اپنے ذاتی مشاہدے سے لکھا ہے۔ اور اس کا مشاہدہ اس انتہا تک گھرا اور مکمل ہے کہ اگر اس نے کہیں بیرون اور خاکر و بلوں کو بھی بات کرتے ہوئے دکھایا ہے تو یہ یا تین بیرون اور خاکر و بلوں ہی کے روز مرہ کی ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ایک اعلیٰ افسوس کو اس "مخلوق" کے مشاہدے اور مطالعے کا وقت کہاں سے ملا۔ اس سوال کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ سی ایس پی افسر شہاب اور دیوبیب شہاب دو الگ الگ شخصیتیں نہیں ہیں۔ اور اگر ہم اپنی آسانی کے لیے دونوں کو الگ الگ کر دیں تو پھر گوں سمجھ لیجئے کہ ایک شہاب نے ان کی نفیسیات کی ایک ایک پرت کو چھان لیا۔

"ماں جی" میں شہاب ایک طنز نگار کی صورت میں بھی نمایاں ہوتا ہے۔ طنز کا عنصر اس کی سابقہ تخلیقات میں بھی موجود ہے مگر اس مجسم عیسیٰ میں یہ عنصر بہت بلیغ ہو گیا ہے۔ اس کا طنز کسی ایک طبقے یا کسی ایک ادارے کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ معاشرے پر، ادب کی مروجہ قدر دوں پر، نام نہاد تقدس پر، حدیہ ہے کہ کاروبار حکومت پر بھی طنز کرتا ہے اور طبا بھر پور ہوتا ہے۔ طنز نگاری بہت مشکل فن ہے۔ یہ سب ادیبوں کے بس کاروگ نہیں۔ کامیاب طنز نگاری کے لیے نہ صرف ایک خاص مزاج دکار ہوتا ہے بلکہ مشاہدہ و مطالعہ کا بے پناہ ذخیرہ بھی ضروری ہے اور چھار مشاہدات کا منطقی اور سائنسی تجزیہ کرنے کی قوت بھی لازمی ہے۔ مزاج تو ہم نقوشوں کے الٹ پیسر سے بھی پیدا کر سکتے ہیں مگر طنز کرنے کے لیے تو علم کی وسعت اور احساس کی شدت سے مسلک ہونا پڑتا ہے۔ شہاب اس اسلحے سے پوری

طرح آراستہ ہے۔ مثال کے طور پر میں اس کے صرف ایک سفر نامے "اسے بنی اسرائیل" سے چند اقتباسات پیش کروں گا:

"پولیس کے سپاہی غیر معمولی طور پر موٹے تھادوں کی وجہ سے اپنی وردوں سے بیزار۔ یہ سپاہی زیادہ تر تھیلوں یا ٹھیبوں کا سما را لیتے اونگادر ہے تھے۔ جب بھی انکھی کھلی تو ٹیوں ہی کسی کو دھکا دے کر کسی کو ڈانٹ ڈپٹ کر کے اپنے فرائض منصبی سے عدہ برآ ہو رہے تھے۔"

اگر دوسرے مسافروں اور قلیوں کی لٹکا ہیں بُری طرح ان پر نہ بھی ہوتیں تو یہ بذرگ (رد من کی تھوکاک پادری) نرسوں کو اپنے مندرس سینوں سے ضرور چھٹایتے۔ بہت سے عرب شہزادے، جو اپنے ملک یا اپنے محلات میں شراب پینے سے معذور ہیں اپنے پرانیویٹ جہازوں میں جو حق درحقوق یہاں (بیرودت میں) آتی ہیں اور راتوں رات داعیش دے کر صحیح سورے اپنے فرائض منصبی پر واپس حاضر ہو جاتے ہیں۔

بیرودت کا شمار بھی دینا کے ان منذب شہروں میں ہے جہاں غیر ہونا لذکر جرم نہیں، البتہ بھیک مانگنا ضرور جرم ہے۔

اس خاندان میں ایک چھوٹ سات سال کا لڑکا تھا۔ ایک نوسال کی لڑکی تھی۔ ان کی ہاں ایک ادھوری بہار کی طرح چھے وقت سے پہلے خزاں نے پاماں کر دالا ہو۔ وہ بھی اپنے پتوں کی طرف دیکھتی، کبھی راگبیروں کی طرف اور کبھی اس سپاہی کی طرف جو بید کی چھڑی گھاگھا کر بھک منگوں کو بھگا رہا تھا۔ مجھے رُکتے دیکھ کر وہ لکھا میری طرف بڑھا اور بڑی لجاجت سے پوچھنے لگا۔ کیا آپ میری تصویر کھینچنا چاہتے ہیں؟"

طنز کا تیر سیدھا ذہن میں جا کر ترازو ہو جاتا ہے مگر اتنے منور طنز کے لیے شہاب کو کسی نہ کشف، کسی ہیر چھپ، کسی بناوٹ کی ضرورت نہیں پڑی۔ یہ سادگی پڑی بیافت

کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ بیٹن نے بعض معرفت سلیس نگاروں کے ہاں بھی تصنیع کے انبار لگے ہوتے دیکھے ہیں۔ یہ لوگ پڑھنے والے کو سلاست کا دھوکا دے کر دراصل اپنا تصنیع چھپاتے ہیں۔ ان کی سلاست اپنی سلاست پر اتنا لئے ہوئی معلوم ہوتی ہے، مگر شہاب کی سادگی میں بلاکی پر کاری ہے۔

شہاب کے ہاں مجھے اگر کوئی خامی نظر آئی ہے تو وہ یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کو افسانے کے موضوع یا اس کے کرداروں سے لا تعلق نہیں رکھ سکتا۔ وہ ایک شاق افسانہ نگار کی طرح آغاز تو عدم وابستگی سے کرتا ہے مگر کہیں نہ کہیں اس کی وابستگی عیاں ہو جاتی ہے۔ اصطلاحی زبان میں اسے افسانہ نگاری کی تینک کی خلاف ورزی کہ تجھیے مگر میں نے حسوس کیا ہے کہ جس چیز نے شہاب کی اس خامی کو بیشتر مقالات پر خوبی بنایا ہے، وہ موضوع کے ساتھ اس کا خلوص اور پھر اس خلوص کی شدت ہے۔ عدم وابستگی کی گوشش کے پاؤ جوڑ، وابستگی کا یہ پالوا سطہ اظہار مجھے تکِ محبت کا فیصلہ کرنے والے اس عاشق کی یاد دلاتا ہے جو اپنے محبوب کو یہ فیصلہ سنائے کے بعد جب پلٹے تو رو دے!

اس مجموعے میں اور غالشہ اگتی، اور یہو سے جنکش، دسردار جسمت سنگو، نمبر پلیز، پکے پکے آم، دوجگ جگ، دیا، اور ملاش، کے سے نک سکتے درست افسانے بھی ہیں، ایک پکپک، شینو گراف، دشوار، اور جلتگ، کے سے جذبات پھرے داں بھی ہیں، اسے بنی اسرائیل کے سے ڈال دینے والے سفرنامے بھی ہیں، اقبال کی فریاد، دسماں قیدی، دسرخ فینٹ، اور ایک ڈسپیچ، کے سے پارہ ہاتے طنز بھی ہیں۔ ان میں رابرٹ لانگ اور ہیرد کے ہیرے اور گولان اور اس لڑکی بار برا کے سے بھیشہ یا درہنے والے کردار بھی ہیں جو متعدد مقالات پر مختلف ناموں سے نمودار ہوتی ہے اور اس کی گرفت کہیں بھی ادھوری نہیں۔ — مگر میں جیران ہوں کہ اس ادب پارے کو کیا نام دوں جس سے اس مجموعے کا آغاز ہوا ہے اور جس سے اس مجموعے نے اپنا نام پایا

ہے۔ میں اسے افسانہ یا الشناحتیہ یا سیکچ یا تائش یا تند کہ — کچھ بھی کہنے کا فیصلہ کروں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں اس گرال مایہ تحریر کے ساتھ بے انصافی کر رہا ہوں۔ مان جی ” ان سب نثری اصنافِ ادب سے وابستہ ہو کر بھی ان سب سے کوئی الگ اور بلند چیز ہے۔ اردو ادب میں اس کی واحد مشالِ عصمت چعتانی کا ”دوزخی“ ہے۔ مگر کیا ہم ”مان جی“ اور ”دوزخی“ پر نثری ادب کی کسی بھی مروجہ صفت کا ٹھپٹا گلا سکتے ہیں؟ اس کے باوجود اشارہ انگلیزی کے لحاظ سے کوئی بڑے سے بڑا افسانہ یا سیکچ یا تند کہ اردو ادب کے ان دو غیر معمولی شاہزادوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میرا عالمی ادب کا مطالعہ بہت وسیع نہیں تو کچھ ایسا محدود بھی نہیں مگر دوسری زبانوں کے ادب میں بھی ”مان جی“ کے پائے کی کوئی چیز میری نظر سے کبھی نہیں گزری۔ شہاب اگر ”مان جی“ کے سوا کبھی کوئی چیز نہ لکھتا تو جب بھی ادب اسے صدیوں تک فرموش نہ کر سکتا ”مان جی“ کوئی صرف شہاب ہی کا نہیں، پورے اردو ادب کا کارنامہ قرار دیتا ہوں — اور پھر انسان کے اس مقدس ترین رشتے کا کارنامہ بھی جس کے بعد صرف ایک بھی رشتہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ بندے اور خدا کا رشتہ ہے۔

احمد نیدم قاسمی

۲۰ جنوری ۱۹۶۸ء

# مال جی

مال جی کی پیدائش کا صحیح سال معلوم نہ ہو سکا۔

جس زمانے میں لائل پور کا ضلع نیانیا آباد ہوا تھا۔ پنجاب کے ہر قصبے سے غریب الحال لوگ زمین حاصل کرنے کے لیے اس نئی کالونی میں جو حق در جو حق کھنچے چلے آ رہے تھے۔ عرفِ عام میں لائل پور، جنگ، سرگودھا وغیرہ کو ”بار“ کا علاقہ کہا جاتا تھا۔ اس زمانے میں مال جی کی دس بارہ سال تھی۔ اس حساب سے ان کی پیدائش پچھلی صدی کے آخری دس پندرہ سالوں میں کسی وقت ہوتی ہو گی۔

مال جی کا آبائی وطن تحصیل روپڑ ضلع انبار میں ایک گاؤں بنیلذ نامی تھا۔ والدین کے پاس چند لاکھ اراضی تھی۔ ان دونوں روپڑ میں دریاۓ ستیخ سے نہر سرہند کی کھدائی ہو رہی تھی۔ نانا جی کی اراضی نہر کی کھدائی میں ضمن ہو گئی۔ روپڑ میں انگریز حاکم کے دفتر سے ایسی زمینوں کے معادھتے دیے جاتے تھے۔ نانا جی دو تین بار معادھتے کی تلاش میں شہر گئے۔ لیکن سید ہے آدمی تھے۔ کبھی اتنا بھی معلوم نہ کر سکے کہ انگریز کا

دفتر کہاں ہے اور معاوضہ و صول کرنے کے لیے کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ انجام کا صبر شکر کے بیٹھ گئے اور نہر کی گھنٹائی نہیں مزدوری کرنے لگے۔

انہی دنوں پر چڑکاگہ باریں کالوں کھل گئی ہے اور نئے آباد کاروں کو مفت زین مل رہی ہے۔ ناتاجی اپنی بیوی، دونخے بیٹوں اور ایک بیٹی کا کنبہ ساتھ لے کر لائل پر روانہ ہو گئے۔ سواری کی توفیق نہ تھی۔ اس لیے پاپا دہچل کھڑے ہوتے۔

راستے میں محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے۔ ناتاجی جگہ بجگہ قلی کا کام کرتے یا کسی طال پر لکھیاں چیر دیتے۔ نافی اور ماں جی کیسی کاسوت کات دیتیں یا مکانوں کے فرش اور دیواریں لیپ دیتیں۔ لائل پور کا صحیح راستہ کسی کو نہ آتا تھا۔ جگہ جگہ جھکلتے تھے۔ اور پوچھ پوچھ کر دنوں کی منزل ہفتون میں طے کرتے تھے۔

ٹیڑھ دمہنی کی مسافت کے بعد جرانوالہ پنچے۔ پاپا دہچلے اور محنت مزدوری کی مشقت سے سب کے جسم ٹھھال اور پاؤں سوچے ہوتے تھے۔ یہاں پر چند ماہ قیام کیا۔ ناتاجی دن بھر غلمہ منڈھی میں بوریاں اٹھانے کا کام کرتے۔ نافی چرخ کات کر سوت پچھیں اور ماں جی گھر سنبھالتیں جو ایک پھوٹ سے جھوپڑے پر پشتلتھا۔

انہی دنوں بقرعید کا تھوا ر آیا۔ ناتاجی کے پاس چند روپے جمع ہو گئے تھے۔ انہوں نے ماں جی کو تین آنے بطور عیدی دیے۔ زندگی میں پہلی بار ماں جی کے ہاتھ اتنے پیسے آتے تھے۔ انہوں نے بہت سوچا لیکن اس رقم کا کوئی مصرف ان کی بھجوں میں نہ اسکا دفات کے وقت ان کی عمر کوئی اسی برس کے لگ بھگ تھی لیکن ان کے نزدیک سو روپے دس روپے، پانچ روپے کے نوٹوں میں امتیاز کرنا انسان کام نہ تھا۔ عیدی کے تین آنے کئی روز ماں جی کے دوپٹے کے ایک کونے میں بندھے رہے۔ جس روز وہ جعلی تو سے رخصت ہو رہی تھیں ماں جی نے گیارہ پیسے کا تیل خرید کر مسجد کے چڑاغ میں فال دیا۔ باقی ایک پیسے اپنے پاس رکھا اس کے بعد جب کبھی گیارہ پیسے پورے ہو جاتے وہ

فراہ مسجد میں تیل بھجوادتیں۔ ساری عمر جمعرات کی شام کو اس علی پر بڑی وضعداری سے پابند رہیں۔ رفتہ رفتہ بہت سی مسجدوں میں بجلی اگتی۔ لیکن لاہور اور کراچی جیسے شہروں میں بھی انھیں ایسی مسجدوں کا علم رہتا تھا جن کے چراغ اب بھی تیل سے روشن ہوتے ہیں۔ دفات کی شب بھی ماں جی کے سرانے ململ کے رومال میں بندھے ہوئے چند آنے موجود تھے۔ غالباً یہ پیسے بھی مسجد کے تیل کے لیے جمع کر رکھے تھے چونکہ وہ جمعرات کی شب تھی۔

ان چند آنوں کے علاوہ ماں جی کے پاس کچھ اور رقم تھی، نہ کوئی زیور، اسباب دنیا میں ان کے پاس گنتی کی چند چیزیں تھیں۔ تین جوڑے سوتی کپڑوں کے، ایک جوڑا دلیسی جوتا، ایک جوڑا بڑے چپل، ایک عینک، ایک الگوٹی جس میں تین چھوٹے چھوٹے فیروزے جوڑے ہوتے تھے۔ ایک جاتے نماز، ایک تیسیع اور باقی اللہ اعلیٰ پہنچنے کے تین جوڑوں کو وہ خاص اہتمام سے رکھتی تھیں۔ ایک زیب تدبیر اپنے باتھوں سے دھو کر تکتے کے نیچے رکھا رہتا تھا۔ تاکہ استری ہو جاتے۔ تمیسا ر دھونے کے لیے تیار۔ ان کے علاوہ اگرچو تھا کہ ان کے پاس آنا تاallowہ چکر سے ایک جوڑا کسی کو دے دیتی تھیں۔ اسی وجہ سے ساری عمر انھیں سوت کیس رکھنے کی حاجت محسوس نہ ہوتی۔ لمبے سے لمبے سفر پر دوانہ ہونے کے لیے انھیں تیاری میں چند منٹ سے زیادہ ز لگتے تھے۔ کپڑوں کی پولی بناؤ کر انھیں جاتے نماز میں لپٹتا۔ جاڑوں میں اونی فرد اور گرمیوں میں ململ کے دوپٹے کی پیکل ماری اور جہاں کہیں چلتے کو تباہ۔ سفر آغرت بھی انھوں نے اس سادگی سے اختیار کیا۔ ملے کپڑے اپنے باتھوں سے دھو کر تکتے کے نیچے رکھتے۔ نہاد دھو کر بال سکھاتے اور چند ہی ہنڑوں میں زندگی کے سب سے لمبے سفر پر رہا نہ ہو گئیں۔ جس خاموشی سے دنیا میں بھی تھیں، اسی خاموشی سے عقبی اکوسدھا رکھتیں۔ غالباً اسی موقع کے لیے وہ اکثر یہ دعا

مالکا کر تی تھیں، کہ اللہ تعالیٰ ہاتھ چلتے چلا تے اٹھا لے۔ اللہ جبکہ کسی کا محتاج نہ کرے....  
 کھانے پینے میں وہ کپڑے لئے سے بھی نیادہ سادہ اور غریب مزاج تھیں۔ ان کی  
 مرغوب تیرین غذا مکنی کی شان، دھینے پو دینے کی جتنی کے ساتھ تھی۔ باقی چیزوں خوشی سے تو کھانا  
 تھیں، لیکن شوق سے نہیں۔ تقریباً ہر نو اے پر قند کا شکر ادا کرنی تھیں۔ بچلوں میں کبھی بہت  
 بھی مجبور کیا جائے تو کبھی بھار کیلے کی فراش کرنی تھیں۔ البتہ ناشتے میں چائے کے دو  
 پیالے اور تیسرے پر سادہ چائے کا ایک پیار ضرور پیتی تھیں۔ کھانا صرف ایک وقت  
 کھاتی تھیں۔ اکثر دبیشتر و پہر کا۔ شاذونا در رات کا۔ گرمیوں میں عموماً کھن بنکالی ہوتی پہنچی  
 نمیں لستی کے ساتھ ایک آدھ سادہ چپاتی ان کی محبوب خوراک تھی۔ دوسروں کو کوئی پیز غربت  
 سے کھاتے دیکھ کر خوش ہوتی تھیں اور بھیشہ یہ دعا کرتی تھیں۔ سب کا جلا۔ خاص اپنے  
 اپنے بچوں کے لیے انہوں نے براہ راست کبھی کچھ زمانگا۔ پہلے دوسروں کے لیے دعا  
 مانگتی تھیں اور اس کے بعد مغلوق خدا کی حاجت روائی کے طفیل اپنے بچوں یا عزیزوں  
 کا بھلا چاہتی تھیں۔ اپنے بیٹیوں یا بیٹھیوں کو انہوں نے اپنی زبان سے کبھی "میرے بیٹے" یا  
 "میری بیٹی" کہنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ہمیشہ ان کو اللہ کا مال کہا کر تی تھیں۔

کسی سے کوئی کام لینا ماں جی پر بہت گران گزتا تھا۔ اپنے سب کام وہ اپنے  
 ہاتھوں خود انجام دیتی تھیں۔ اگر کوئی ملازم زبردستی ان کا کرنی کام کر دیتا تو انہیں ایک  
 عجیب قسم کی شرمندگی کا احساس ہونے لگتا تھا اور وہ احسان مندی سے سارا دن  
 اُس سے دعائیں دیتی رہتی تھیں۔

سادگی اور درویشی کا یہ رکھ رکھ تو قدرت نے ماں جی کی سرشت میں پیدا کیا تھا۔  
 پچھے یقیناً زندگی کے زیر و بم نے سکھایا تھا۔

جو طانوالہ بیس کچھ عرصہ قیام کے بعد جب وہ اپنے والدین اور خود سال بھائیوں  
 کے ساتھ زین کی تلاش میں لاکل پور کا گالوں کی طرف روانہ ہوئیں تو انہیں کچھ معلوم نہ تھا

کر انھیں کس مقام پر جانا ہے اور زمین حاصل کرنے کے لیے کیا قدم اٹھانا ہے۔ ماں جی تباہی کرتی تھیں کہ اس زمانے میں ان کے ذہن میں کالوںی کا تصور ایک فرشتہ سیرت بزرگ کا تھا جو کہ میں سرراہ بیٹھا زمین کے پروانے تقسیم کر رہا ہو گا۔ کئی ہفتے چھپوٹا ساتھا لال لپوڑے کے علاقے میں پاپیا دہ بھٹکتا رہا۔ لیکن کبھی راہ گزرا پر انھیں کالوںی کا خضر صورت رہنا نہ مل سکا۔ آفرنگ آگر انھوں نے چک نمبر ۳۹۲ میں جوان دلنوں نیانیا آباد ہو رہا تھا دی رے ڈال دیے۔ لوگ جو حق درحق وہاں آگر لوگ آباد ہو رہے تھے۔ ناما جی نے اپنی سادگی میں یہ سمجھا کہ کالوںی میں آباد ہونے کا شایدی سی ایک طریقہ ہو گا۔ چنانچہ انھوں نے ایک چھپوٹا ساتھا لگھیر کر گھاس چھوٹس کی جھونپڑی بنانی اور بخرا راضی کا ایک قلعہ تلاش کر کے کاشت کی تیاری کرنے لگے۔ اسی دنون مکملہ مال کا عمارت پر تال کے لیے آیا۔ ناما جی کے پاس آلات منٹ کے کاغذات نہ تھے۔ چنانچہ انھیں چک سے لمحال دیا گیا اور سکاری زمین پر ناما جائز جھونپڑا بینے کی پاداش میں ان کے برتن اور بستر قرق کر لیے۔ علے کے ایک آدمی نے چاندی کی دلبالیاں بھی ماں جی کے کانوں بے اتر والیں۔ ایک بالی آثار نے میں ذرا دیر ہونی تو اس نے زور سے کھینچ لی جس سے ماں جی کے بائیں کان کا زبری رح جسہ بُری طرح سے چھٹ گیا۔

چک نمبر ۳۹۲ سے نکل کر جو راستہ سامنے آیا اس پر چل کھڑے ہوتے۔ گھیوں کے دن تھے۔ دن بھر بھلپتی تھی۔ پانی رکھنے کے لیے مٹی کا پولی بھی پاس نہ تھا۔ جہاں کہ میں کوئی کنوں نظر لیا ماں جی اپنا دعہ بھاگو لیتیں تاکہ پیاس لگنے سے پسے چھوٹے بھائیوں کو چھاتی جائیں۔ اس طرح وہ چلتے چلتے چک ۷۔۵ میں پہنچ جہاں ایک جان بھاٹ کے آباد کارنے ناما جی کو اپنا مزارع رکھ لیا۔ ناما جی ہل چلاتے تھے۔ نانی مولیشی چڑانے لے جاتی تھیں۔ ماں جی کھیتوں سے گھاس اور چارہ کاٹ کر زینداری کی جینسوں اور گلیوں کے پیسے لایا کرتی تھیں۔ ان دلنوں انھیں اتنا مقدر بھی تھا کہ ایک وقت کی روٹی بھی پیدا

طرح کھاسکیں کیسی وقت جھلکی پر گزارہ ہوتا تھا۔ کبھی خربوزے کے چمکے آبال کر کھا لیتے تھے۔ کبھی کسی کھیتے میں کچی انبیاں گردی ہوئی مل گئیں تو ان کی چینی بتا لیتے تھے۔ ایک روز کہیں سے تو بیٹھے اور کھلتے کا بلا جلا ساگ ہاتھا گیا۔ نالی محنت مزدوری میں مصروف تھی۔ ماں جوئی نے ساگ چولتے پر چڑھایا۔ جب پک کرتیار ہو گیا اور ساگ کو اتنی رکھا کر گھٹنے کا وقت آیا تو ماں جوئی نے ڈولی ایسے زور سے چلانی کر ہندیا کا پینڈا لٹوٹ گیا اور سارا ساگ بہر کر چولتے ہیں آپڑا۔ ماں جوئی کونانی سے ڈانٹ پڑی اور مار بھی۔ رات کو سارے خاندان نے چولتے کی لکڑیوں پر گرا ہوا ساگ انگلیوں سے چاٹ چاٹ کر کسی قدر پریٹ ہمرا۔ چک نمبر ۵۔ نانا جوئی کو خوب راس آیا۔ چند ماہ کی محنت مزدوری کے بعد نانی آباد کاری کے سلسلے میں آسان قسطوں پر ان کو ایک مر بعد نہیں مل گئی۔ رفتہ رفتہ دن پھر گھے اور تین سال میں ان کا شمار گاؤں کے کھاتے پیتے لوگوں میں ہونے لگا۔ بھوں بھوں فارغ الیالی بڑھتی گئی توں توں آبائی وطن کی یاد تانے لگی۔ چنانچہ خوشحالی کے چار پانچ سال گزارنے کے بعد سارا خاندان ریل میں بیٹھ کر نیلکی کی طرف روانہ ہوا۔ ریل کا سفر ماں جو کو بہت پسند کیا۔ وہ سارا وقت کھڑکی سے باہر منہ نکال کر تماشہ دیکھتی رہیں۔ اس عمل میں کوئی کے بہت سے ذریعے ان کی آنکھوں میں پڑ گئے جس کی وجہ سے کئی روز تک وہ اشوب بیب چشم میں بنتا رہیں۔ اس تجربے کے بعد انھوں نے ساری عمر اپنے کسی بچتے کو ریل کی کھڑکی سے باہر منہ نکالنے کی اجازت نہ دی۔

ماں جوئی ریل کے تھرڈ کلاس ڈبے میں بہت خوش رہتی تھیں۔ ہم سفر عورتوں اور بچتوں سے فوراً گھل مل جاتیں۔ سفر کی تھکان اور راستے کے گرد و غبار کا ان پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ اس کے بر عکس اپنے درجنوں میں بہت بیزار ہو جاتیں۔ ایک دوبار جب انھیں مجبوراً ایرکنڈلیشن ڈبے میں سفر کرنا پڑا تو وہ تھک کر جوڑ ہو گئیں۔ اور سارا وقت قیک صعوبت کی طرح ان پر گلاں گزرا۔

میں پہنچ کر ناتاجی نے اپنا آبائی امکان درست کیا۔ عزیز و اقارب کو تھاuff دیے۔

دعتیں مجھیں اور بھروسی جی کے لیے بڑھونڈنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس زمانے میں لاٹل پور کے مر بعد داروں کی بڑی دھوم تھی۔ ان کا شمار خوش قسمت اور باعترت لوگوں میں ہوتا تھا۔ چنانچہ چاروں طرف سے ماں جی کے لیے پلے درپے پیام آنسے لگے۔ یوں بھی ان دنوں ماں جی کے بڑے مٹاٹھ بانٹھ تھے۔ برادری والوں پر رعب گانٹھنے کے لیے نافی جی انھیں ہر روز نست نئے کپڑے پہناتی تھیں اور ہر وقت انہوں کی طرح سجا کر رکھتی تھیں۔

کبھی کھمار پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے ماں جی بڑے معصوم فخر سے کہا کرتی تھیں۔ آن دنوں میرا تو گاؤں میں نکلناتھاک دو بھر ہو گیا تھا۔ میں جس طرف سے گزر جاتی لوگ ستمبک کو کھڑے ہو جاتے اور کہا کرتے یہ خیال نکش مر بعد دار کی بیٹی جا رہی ہے۔ دیکھیے کون سا خوش نصیب اسے بیاہ کر لے جائے گا۔

دمان جی! آپ کی اپنی نظر میں کوئی ایسا خوش نصیب نہیں تھا، ہم لوگ چیزیں کی خاطر ان سے پوچھا کرتے۔

”تو پر تو پر“۔ ماں جی کافنوں پر ہاتھ لگاتیں۔ ”میری نظر میں بھلا کوئی لکیسے ہو سکتا تھا۔ میں میرے دل میں اتنی سی خواہش ضرور تھی کہ اگر مجھے ایسا آدمی ملے جو دو حروف پڑھا کر ہو تو خدا کی بڑی محرومی ہو گی؟“

ساری عمر میں غالباً یہ ایک خواہش تھی جو ماں جی کے دل میں خود اپنی ذات کے لیے پیدا ہوئی۔ اس کو خدا نے یوں پورا کر دیا کہ اسی سال ماں جی کی شادی عبداللہ صاحب سے ہو گئی۔

ان دنوں سارے علاقوے میں عبداللہ صاحب کا طوطی بول رہا تھا۔ وہ ایک امیر کبیر گھر اسے کے چشم و چراغ تھے لیکن پانچ برس کی عمر میں تیمیں بھی ہو گئے اور بے حد

مغلوک الحال بھی۔ جب باپ کا سایہ سر سے اٹھا تو یہ اکٹھاف ہوا اک ساری آبائی جائیداد فرن  
پڑی ہے۔ چنانچہ عبداللہ صاحب اپنی والدہ کے ساتھ ایک سمجھوپڑے میں اٹھا گئے۔  
زرا در زین کا یہ انعام ویکھ کر انھوں نے ایسی جاندا بنانے کا عزم کر لیا جو مہاجنوں کے ہاتھ  
گروئی نہ رکھی جاسکے۔ چنانچہ عبداللہ صاحب دل و جان سے تعلیم حاصل کرنے میں منہک  
ہو گئے۔ وظیفے پر وظیفہ حاصل کر کے اور دوسرا سال کے امتحان ایک ایک سال میں پاس  
کر کے پنجاب یونیورسٹی کے میٹریکولیشن میں اول آتے۔ اس زمانے میں غالباً یہ پہلا موقع  
ھتاک کر سی سالان طالب علم نے یونیورسٹی امتحان میں ریکارڈ قائم کیا ہے۔

اڑتے اڑتے یہ خبر سرستید کے کانزوں میں پڑ گئی جو اس وقت علی گڑھ مسلم کالج کی  
بنیاد رکھ چکے تھے۔ انھوں نے اپنا خاص نشی گاؤں میں بھیجا اور عبداللہ صاحب کو  
وظیفہ دے کر علی گڑھ بلالیا۔ یہاں پر عبداللہ صاحب نے خوب بڑھ چھڑھ کر اپنا رنگ  
نکالا۔ اور بی۔ اے کرنے کے بعد انہیں برس کی عمر میں وہیں پرانگریزی، عربی، فلسفہ  
اور حساب کے لکھ جر ہو گئے۔

سرستید کو اس بات کی وجہ تھی کہ مسلمان لو جوان زیادہ سے زیادہ تعداد میں اعلیٰ  
ملازمتوں میں جائیں۔ چنانچہ انھوں نے عبداللہ صاحب کو سرکاری وظیفہ دلوایا کہ وہ  
انگلستان میں جا کر اپنی سی، الیس کے امتحان میں شرکیے ہوں۔

پچھلی صدی کے ٹرے بوٹھے سات سو نو پارکر کے سفر کو بلاتے باگھانی سمجھتے  
تھے۔ عبداللہ صاحب کی والدہ نے بیٹے کو ولایت جانے سے منع کر دیا۔ عبداللہ صاحب  
کی سعادت مندی اسٹرے آئی اور انھوں نے وظیفہ واپس کر دیا۔

اس حرکت پر سرستید کو بے حد غصہ بھی آیا اور دکھ بھی ہوا۔ انھوں نے لاکھ سو بھیجا  
بھیجا، ڈرایا، دھر کایا لیکن عبداللہ صاحب شش سے مس نہ ہوتے۔  
«کیا تم اپنی بُوڑھی ملن کو قدم کے مقاد پر تجزیح دیتے ہو؟» سرستید نے کڑا کر پوچھا۔

”جی ہاں“ عبد اللہ صاحب نے جواب دیا۔

یہ پنکھا سا جواب سن کر سرتیڈ صاحب آپ سے باہر ہو گئے۔ کر کے کارروانہ بند کر کے پہلے انہوں نے عبد اللہ صاحب کو لاتوں، ہمکوں، تختپرتوں اور جو توں سے خوب پیٹھا اور کامیح کی لذکری سے بخواست کر کے یہ کہ کر علی گڑھ سے نکال دیا۔ اب تم ایسی چلک جا کر مر جہاں سے بھی تمہارا نام بھی نہ سن سکوں؟“

عبد اللہ صاحب جتنے سعادت مند بیٹھے تھے۔ اتنے سعادت مند شاگرد بھی تھے۔ نقشے پر انھیں سب سے دور افتدادہ اور دشوارگزار مقام گلگت نظر آیا۔ چنانچہ وہ ناک کی سیدھہ گلگت پہنچے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کی گورنری کے عمدے پر فائز ہو گئے۔ جن دنوں ماں جی کی منگنی کی تکہ ہو رہی تھی۔ انہی دنوں عبد اللہ صاحب بھی چھپی پر گاؤں آتے ہوئے تھے۔ قسمت میں دونوں کا سنجوک لکھا ہوا تھا۔ ان کی منگنی ہو گئی اور ایک ماہ بعد شادی بھی ٹھہر گئی تاکہ عبد اللہ صاحب والہن کو اپنے ساتھ گلگت لے جائیں۔ منگنی کے بعد ایک روز ماں جی اپنی سیلیوں کے ساتھ پاس والے گاؤں میں میلہ دیکھنے کی ہوتی تھیں۔ اتفاقاً قایا شاید والستہ عبد اللہ صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔ ماں جی کی سیلیوں نے انھیں گھیر لیا اور ہر ایک نے چھیڑ چھیر کر ان سے پانچ پانچ روپے پیش کیے۔ لیکن انہوں نے انکا رکھ دیا۔ بہت اصرار پڑھ گیا تو مجبوراً ماں جی نے گیارہ پیسے کے فرماںش کی۔

”اتنے بڑے میلے میں گیا ہے پیسے لے کر کیا کروگی؟“ عبد اللہ صاحب نے پوچھا۔ ”اگلی جمعرات کو آپ کے نام سے مسجد میں تیل ڈلوادوں کی“ ماں جی نے جواب دیا۔ زندگی کے میلے میں بھی عبد اللہ صاحب کے ساتھ ماں جی کا لین دین صرف جمعرات کے گیارہ پیسے ہیں۔ اس سے نیادہ رقم نہ کبھی انہوں نے مانگی نہ اپنے پاس رکھی۔

گلگت میں عبداللہ صاحب کی بڑی شان و شوکت تھی۔ خوبصورت بیگلہ، وسیع باغ، توکر چاکر، دروازے پر سپاہیوں کا پرہ۔ جب عبداللہ صاحب درے پر باہر جاتے تھے یا والپس آتے تھے تو سات توپوں کی سلامی دی جاتی تھی۔ یوں بھی گلگت کا گورنر خاص سیاسی انتظامی اور سماجی اقتدار کا حامل تھا۔ لیکن ماں جی پر اس سامنے جاہد جلال کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ کسی قسم کا چھوٹا بڑا ماحول ان پر اثر انداز نہ ہوتا تھا۔ بلکہ ماں جی کی اپنی سادگی اور خود اعتمادی ہر ماں ماحول پر خاموشی سے چھا جاتی تھی۔

ان دنوں سرمالکم ہیلی حکومت برطانیہ کی طرف سے گلگت کی رومنی اور جینی سرحدوں پر پوٹیکل ایجنسٹ کے طور پر مأمور تھے۔ ایک روز لیڈی ہیلی اور ان کی بیٹی ماں جی سے ملنے آئیں۔ انہوں نے فرائی پہنچنے ہوئے تھے۔ اور پہنڈلیاں کھلی تھیں۔ یہ بے جوابی مان جی کو پہنڈ نہ آئی۔ انہوں نے لیڈی ہیلی سے کہا۔ ”تمہاری عمر تو جیسے گزرن تھی گزر ماں جی کی پہنڈ نہ آئی۔“ انہوں نے لیڈی ہیلی سے کہا۔ ”تمہارے بیٹے کہ کہہ کر انہوں نے مس ہیلی کو اپنے پاس رکھ لیا۔ اور چند مہینوں میں اُسے کھانا پکانا، سینا پرونا، برتن مانجھتا، کپڑے دھونا سکھا کر ماں باب کے پاس والپس بھیج دیا۔“

جب روس میں انقلاب ہوا تو لارڈ کچر سرحدوں کا معافانہ کرنے گلگت آتے۔ ان کے اعزاز میں گورنر کی طرف سے ضیافت کا اہتمام ہوا۔ ماں جی نے اپنے ہاتھ سے دس بارہ قسم کے کھانے پکاتے۔ کھانے لذیذ تھے۔ لارڈ کچر نے اپنی تقریب میں کہا۔ ”مسٹر گورنر، جسیں خانہ ماں نے یہ کھانے پکاتے ہیں، براہ مہربانی میری طرف سے آپ ان کے ہاتھ پہنچ جوں ہیں؟“

دعوت کے بعد عبداللہ صاحب فرمان و شاداں گھر لوٹے تو دیکھا کہ ماں جی پاورچی خانے کے ایک گوشے میں چٹانی پر بیٹھی تھک اور صریح کی چٹنی کے ساتھ مکتنی کی روٹی کھا رہی ہیں۔

ایک اپھے گورنر کی طرح عبداللہ صاحب نے ماں جی کے ہاتھ چومنے اور کہا  
”اگر لارڈ پھر یہ فرماش کرتا کہ وہ خود خانساام کے ہاتھ چومنا چاہتا ہے تو پھر تم کیا  
کرتیں؟“

”میں“ ماں جی نے کہا۔ ”لولیں ۔ میں اس کی منچھیں پکڑ کر جوڑ سے اکھاڑ دیتی یہ  
آپ کیا کرتے؟“

”میں“ عبداللہ صاحب نے ٹرامہ کیا۔ میں ان منچھوں کو روشنی میں لپیٹ  
کر والسرائے کے پاس بیچ دیتا اور تمہیں ساتھ لے کر بیس اور بھاگ جاتا، جیسے  
سرستی کے ہاں سے بھاگا تھا؛“

ماں جی پر ان مکالموں کا کچھ بھی اثر نہ ہوتا تھا۔ لیکن ایک بار —  
ماں جی رشک و حسد کی اس آگ میں جل بھین کر کتاب ہو گئیں جو ہر عورت کا اتنی  
ورثہ ہے۔

ملکت میں ہر قسم کے احکامات ”گورنری“ کے نام پر جاری ہوتے تھے جب  
یہ چرچا ماں جی نے پہنچا تو انھوں نے عبداللہ صاحب سے لگکر کیا۔  
”بھلا حکومت تو آپ کرتے ہیں لیکن گورنری گورنری کہہ کر مجھ غریب کا ہاں  
بیج میں کیوں لا بایا جاتا ہے خواہ محنا ۵“

عبداللہ صاحب علی گڑھ کے پڑھے پڑھتے تھے۔ رُگِ ظراحت پھر لٹھی  
اور یہ اعتمانی سے فرایا۔ بھاگوں یہ تھارا نام تھوڑا ہے۔ گورنری تو دراصل  
تمہاری سوکن ہے۔ جو دن رات میرا پیچاپ کرتی رہتی ہے۔“

ذائق کی بیوٹ تھی۔ عبداللہ صاحب نے سمجھا بات آئی گئی ہو گئی لیکن  
ماں جی کے دل میں غم بیٹھ گیا۔ اس غم میں وہ اندر ہی اندر رکھنے لگیں۔  
کچھ عرصہ کے بعد کشمیر کا مہاراجہ پرتاپ سنگھا پنی مہارانی کے ساتھ گلکت

کے دورے پر آیا۔ ماں جی نے مہارانی کو اپنے دل کا حال سنایا۔ مہارانی بھی سادہ عورت تھی۔ جلال میں اگئی۔ ہاتے ہاتے ہمارے راج میں ایسا ظلم تھا۔ میں آج ہی مہاراج سے کہوں گی کہ وہ عبداللہ صاحب کی خبر لیں۔

جب یہ مقدمہ مہاراج پر اپنگٹک پہنچا تو انھوں نے عبداللہ صاحب کو بلا کر پوچھ چکھ کی۔ عبداللہ صاحب بھی حیران تھے کہ بیٹھے بھٹکتے یہ کیا افتاداً پڑی۔ لیکن جب معاملے کی تہہ تک پہنچے تو دونوں خوب ہنسنے۔ آدمی دونوں ہی وضعدار تھے۔ چنانچہ مہاراج نے حکم نکالا کہ آئندہ سے گلگت کی گورنری کو وزارت اور گورنر کو وزیر وزارت کے نام سے پکارا جائے۔ ۱۹۴۱ء کی جنگ آزادی نیک گلگت میں یہی سرکاری اصطلاحات رائج تھیں۔ یہ حکم نہ سرشن کر مہارانی نے ماں جی کو بلا کر خوشخبری سنائی۔ گرم مہاراج نے گورنری کو دیس نکالا دے دیا ہے۔

”اب تم دو دھوں نہ ساخت، پتوں چپلو۔“ مہارانی نے کہا۔ بد کسی بھی ہمارے لیے بھی دعا کرنا۔“ مہاراجہ اور مہارانی کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لیے وہ اکثر ماں جی سے دعا کی فراش کرتے تھے۔

اولاد کے معاملے میں ماں جی کیا واقعی خوش نصیب تھیں؟ یہ ایک ایسا سوال یہ نشان ہے جس کا جواب آسانی سے نہیں سوچتا۔

ماں جی خود ہی تو کہا کرتی تھیں کہ ان جیسی خوش نصیب ماں دُنیا میں کم ہی ہوتی ہے۔ لیکن اگر صبرہ و شکر، تسلیم و رضائی عینک اتار کر دیکھا جائے تو اس خوش نصیبی کے پڑھے میں لکھتے ڈکھ، لکھنے غم، لکھنے صدھے نظر آتے ہیں۔

اللہ میاں نے ماں جی کو تین بیٹیاں اور تین بیٹھے عطا کیے۔ دو بیٹیاں شادی کے پچھوڑے، بعدیکے بعد دیگرے فوت ہو گئیں۔ سب سے بڑا بیٹا عین عالم شباب میں لگکھتا چاکر گز بیا۔

کہنے کو تو مان جی نے کہہ دیا کہ اللہ کمال تھا اندہ نے لے لیا لیکن کیا وہ اکیلے میں چھپ چھپ کر خون کے آنسو رویا ذکرتی ہوں گی؟

جب عبداللہ صاحب کا انتقال ہوا تو ان کی عمر بسا سو سال اور مان جی کی عمر تکچھیں سال تھی۔ سوہ پر کا وقت تھا۔ عبداللہ صاحب بان کی کھدری چار پانی پر حسبِ معمول گاؤں تکمیل رکا گئی تھیں دراز تھے۔ ماں جی پائیتھی پر بیٹھی چاقو سے گناہ پھیل چھیل کر ان کو دے رہی تھیں۔ وہ مزے مزے سے گناہ پس رہے تھے اور مذاق کر رہے تھے۔ پھر پیکاک وہ سنجیدہ ہو گئے اور کہنے لگے ”بھاگو ان شادی سے پہلے میلے میں میں نے تھیں گیارہ پیسے دیے تھے۔ کیا ان کو واپس کرنے کا وقت نہیں آیا؟“

ماں جی نے نتی نوبیلی والوں کی طرح سر جھکایا اور گناہ پھینے میں مصروف ہو گئیں۔ ان کے سینے میں بیک وقت بہت سے خیال آمد آئے ”ابھی وقت کہاں آیا ہے۔ ستر لاج شادی کے پہلے گیارہ پیسوں کی توڑی بات ہے لیکن شادی کے بعد جس طرح تم نے میرے ساتھ بناہ کیا ہے۔ اس پر میں نے تمہارے پاؤں دھو کر ملنے میں۔ اپنی کھال کی جوتیاں تھیں پہنانی میں۔ ابھی وقت کہاں آیا ہے میرے ستر لاج۔“

لیکن قضا و قدر کے بھی کھلتے میں وقت آچکا تھا۔ جب ماں جی نے سراٹھا یا تو عبداللہ صاحب گئے کی قاش منہ میں یہی گاؤں تک پہنچ پر سور ہے تھے۔ ماں جی نے بہتر بلایا ہلا کیا۔ چکار لیکن عبداللہ صاحب ایسی نیند سو گئے تھے جس سے بیداری قیامت سے پہلے ممکن ہی نہیں۔

ماں جی نے اپنے باقی ماندہ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کو سینے لگا کر تلقین کی ”بچہ، رونا مت۔ تمہارے ابا جی جس آرام سے رہے تھے، اسی آرام سے چلے گئے۔ اب رونا مت۔ ان کی رُوح کو تکلیف پہنچے گی۔“

کہنے کو تو مان جی نے کہہ دیا کہ اپنے ابا کی را دیں نہ رونا، در نہ ان کو تکلیف پہنچے

گی۔ لیکن کیا وہ خود چوری چیزے اس خادم کی یاد میں تردی ہوں گی جس نے باسطھ سال کی عمر تک انھیں ایک المٹروں سمجھا اور جس نے ”د گورنری“ کے علاوہ اور کوئی سوکن اس کے سر پر لا کر نہیں بھٹکاتی۔

جب وہ خود چل دیں تو اپنے بچوں کے لیے ایک سوالیہ نشان چھپو رکھتیں، جو قیامت تک انھیں عقیدت کے بیان میں سرگردان رکھے گا۔

اگر ماں جی کے نام پر خیرات کی جائے تو گیارہ پیسے سے زیادہ ہمت نہیں ہوتی۔ لیکن مسجد کا ملا پریشان ہے کہ بھلی کاربیٹ بڑھ گیا ہے اور تیل کی قیمت گلاں ہو گئی ہے۔ ماں جی کے نام پر فاتحہ دی جاتے تو کمکی کی روٹی اور نکاں مرچ کی چینی سلنگ آتی ہے لیکن کھانے والا درویش کہتا ہے کہ فاتحہ درود میں پلاو اور زرد مے کا اہتمام لازم ہے۔ ماں جی کا نام آتا ہے تو بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن اگر دیا جلتے تو ڈر لگتا ہے کہ ان کی روح کو تکلیف نہ پہنچے اور اگر ضبط کیا جلتے تو خدا کی قسم ضبط نہیں ہوتا۔

## ۱۸۔ رسولِ الاسن

فردوی، ۱۹۴۱ء میں سیر انتبدار اٹلیسہ ہوا اور کنک میں مجھے ہوم ڈپارٹمنٹ کے ڈپٹی سیکرٹری کے طور پر تعینات کیا گیا۔

اس زمانے میں اٹلیسہ کے وزیر اعلیٰ سری ہری کرشن ممتاز تھے۔ ہوم ڈپارٹمنٹ کا شعبہ ان کے ماتحت تھا۔ چارج لینے کے بعد میں ان سے ملنے گیا تو انہوں نے پوچھا کہ مجھے رہنے کے لیے کون سا گھر ملا ہے۔ میں نے کہا اٹلیسہ گورنمنٹ مجردا نہروں کو رہائشی جگہ دینے کے حق میں نہیں ہے۔ اس لیے میں اب تک سرکٹ ہاؤس میں مقیم ہوں۔

ممتاز صاحب سکلتے اور کہا۔ اگر گھر حاصل کرنا ہے تو لگے ہاتھوں شادی بھی کر ڈالو۔

میں نے وزیر اعلیٰ کو مطلع کیا کہ ان کی حکومت نے یہ ضابط بھی بنارکھا ہے کہ شادی کے بعد جب تک کہنی پڑے پیدا نہ ہو جائیں کسی افسر کو سرکاری مکان نہیں مل سکتا۔

لگے ہاتھوں فی الفور کئی بچوں کا باپ بننا میرے بس کاروگ نہیں تھا چنانچہ پیر کافی  
عرصہ تک سرکت ہاؤس میں رہا۔

ایک روز کچھ فائدیں لے کر ہر کرشمند امداد صاحب کے پاس گیا تو انہوں نے  
پھر میرے مکان کا مسئلہ چھپڑ دیا۔ وزیر اعلیٰ ہونے کے باوجود مہتاب صاحب پرے  
پُر خلص اور نیک دل انسان تھے۔ اور اپنے ساتھ کام کرنے والوں کے ذاتی مسائل  
کی طرف خاص طور پر توجہ دیا کرتے تھے۔

”میرے ذہن میں ایک کوٹھی ہے،“ مہتاب نے کہا۔ لیکن اس میں کچھ جن بحوث  
بھی رہتے ہیں۔ اگر تمھیں اس کی صحبت قبول ہو تو وہ مکان ابھی مل سکتا ہے۔“  
جن بحوثوں کے ساتھ مجھے ابھی تک ذاتی تعارف کا شرف حاصل نہیں ہوا تھا۔  
قصوں اور کہانیوں میں بستے والی یا فوق العادت مخلوق میرے نزدیک ایک محلِ فہم  
کا درج رکھتی ہے۔ بیس نے اس موقع پر غنیمت سمجھا اور وہیں میٹھے بیٹھے مہتاب صاحب  
نے سول انہنزی نمبر اٹھارہ کی کوٹھی مجھے الٹ کر دی۔

یہ ایک چھوٹی سی خوشناک کوٹھی تھی لیکن سالہا سال سے غیر آباد رہنے کی وجہ سے  
اس کے درودیوار سے وحشت پک رہی تھی۔ کوٹھی کے ساتھ ایک وسیع و عربیض  
لان تھا۔ چاروں طرف لمبی لمبی گھاس اگی ہوئی تھی۔ زردوڑ دسوکھے ہوئے پتے ڈھیر  
ڈھیر پھر سے پڑے تھے۔ جا بجا تازہ اور پرانے گوبر پر مکھیاں بھجن چنار ہی تھیں۔ ایک  
چھوٹے سے تالاب میں کافی جھی ہوئی تھی۔ صحن کے جنوبی گوشے میں جامن کا درخت تھا۔  
شمال مغرب میں ایک درخت سے بہت سی چمگاڑیں المٹی ہوئی تھیں۔ ناریل کے پیڑے  
نیچے ایک فاقہ زدہ بلی دھوپ سینک رہی تھی۔ برآمدے میں دو آوارہ گتے اپنے بچوں  
کے ساتھ گردنیں کھا رہے تھے۔ اور چمگاڑوں کی طرف منڈھا اٹھا کر لمبی تانوں میں  
رو رہے تھے۔

میرے ساتھ ایک کشمیری ملازم رمضان تھا۔ اُس نے سارا دن لگا کر مکان کو جبڑا پوچھ کر صاف کر دیا۔ دوسرا صبح جب وہ شیو کا پانی لئے کرایا تو اس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ ان دونوں بہار، بنگال اور اڑیسہ میں جا بجا ہندو مسلم فساد ہو رہے تھے۔ رمضان نے رونی صورت بننا کر کہا کہ رات جب وہ اپنے کوارٹر میں سویا پڑا تھا تو ایک ہندو دبے پاؤں اندر آیا اور اس کی چار پانی المٹ کر جاگ گیا۔ رمضان نے اس کا تعاقب کیا تو اندر ھی سے میں اس کا منہ کھٹاک سے دروازے کے ساتھ لگا، یعنی اندر سے کنٹھی بند تھی۔

”اگر وہ ہندو باہر سے آیا تھا تو کرے کی کنٹھی اندر سے کیسے بند ہو گئی؟“

”اس میں بھی سالے ہندو دن کی چال ہو گی۔“ رمضان نے دلتوں سے جواب دیا۔ اس کے ذہن میں ہندو مسلم تعصیب یوں کوٹ کر بھرا ہوا تھا کہ اب اس میں ماقول الفطرت حادثات کے بیان کرنی جگہ باقی ذریعی بھی تھی۔

۱۸۔ رسول لاہنزی کی جو خصوصیات سب سے پہلے کھٹکی وہ یہ تھی کہ وقتاً فوقتاً اس کی پچھت انگڑائیاں سی لیتی محسوس ہوتی تھیں۔ رات اور دن میں کتنی بار پچھت کٹاک کٹاک بنتی تھی، جیسے لوہے کی گرم چادر ٹھنڈی ہو کر ٹھنڈتی ہے۔

ایک رات گیارہ نجی کے قریب میں بھلی بھاکر بستیر پیٹا تو دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے سوچا کہ شاید رمضانی کوئی چیز بھجی گیا ہے، لیکن آیا ہے۔ لیکن دروازہ کھولا تو برآمدہ خالی تھا۔ البتہ ہوا کا ایک گرم سما جھونکا میرے چہرے سے ضرور لگا۔ فروری کی وہ رات خوب ٹھنڈی تھی لیکن برآمدے میں یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کہیں پاس ہی الاوجل رہا ہے۔

اس رات کے بعد پر دستک ایک معمول بن گئی۔ جیسے ہی بھلی بھاکر لیٹتا، دروازے پر پھنسا تھپ دو تین بار دستک ضرور ہوتی۔ ایک رات جب پر دستک نہ ہوتی تو مجھے عجیب سالگا۔ میں بھلی بھاکر لیٹتے ہی رہتا تھا کہ سوچ کھٹاک سے بجا اوز بکھنی خود سخنو

روشن جو گئی۔ یہیں بھلی سچانے کے لیے اٹھا تو پرے سلیپر کمیں نظر نہ آئے بلنگ کے نیچے جھانکا۔ ارادھر ادھر تلاش کیا۔ لیکن سلیپر نہ ارد۔ — اسی اتنا میں سوچ خود بخود گھٹا لیا اور بھلی بھگئی۔ یہیں دوبارہ یٹھا تو سرٹون کے نیچے پھر مرسا ہوا تکہہ اٹھا کر دیکھا تو دلپت پر بڑے سلیقے سے غلاف کے اندر دھرے تھے۔

کوئی بھی کاڈ رائینگ روم سونے کے کمرے سے بھت تھا۔ درمیان میں ایک دروازہ تھا جو عموماً اکھلا رہتا تھا۔ دروازے میں سبز بندگ کی جالی کا ایک باریک سا پرده لٹکا رہتا تھا۔ لیکن ایک دروازے کا پرده ہلا، اور کاڈ رائینگ روم میں سرسر اہست سی چڑھی۔ جیسے راشم کا تھان کھل رہا ہو۔ پھر چڑھیاں کھنکھیں اور ایک نسوانی آواز نے چند ہجکیاں لیں۔ فرش پر اُپنی ایڑی وائے زنا نہ جو تنوں کے چلنے پھرنے کی آواز پیدا ہوئی۔ میں نے فرستے ڈرتے پر دے کے نیچھے سے جھانکا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ لیکن فضماں میں حناء کے عطر خوشبو رچی ہوئی تھی۔ یہیں نے کاڈ رائینگ روم کا بہب روشن کر کے احوال کا جائزہ لیا۔ ایک اداس خاموشی کے سوا دہاں کچھ بھی نہ تھا۔ والپس اُگر بلنگ پر یٹھا تو چھت پر بہت سے چھاری چھک کم قدموں کی آواز سنائی دی اور ساخہ ہی کئی پھر پیے درپے اندر برستن لگے پھر پھر میرے دایکس بائیں، آگے نیچھے زور زور سے گرتے تھے لیکن مجھے لگتے نہ تھے۔ دروازہ کھڑکی اور روشن داں بند تھتے، لیکن پھر دوں کا مینہ بدستور برستارہ باہر کافی زندگی باش ہو رہی تھی۔ لیکن کمرے میں گرنے والے پھر بالکل خشک تھے۔ ایک اینٹ جو میرے بازو کے عین پاس آ کے گری، کوئی ڈھانی سیر و زنی تھی۔

صحح سوپرے میں نے ان تمام پھر دوں کو اکٹھا کر کے باہر پھینک دیا تاکہ رمضانی کے دل میں ہندو دوں کی خشت زلی کا رعب نہیں بھاگتے لیکن جب وہ میرے لیے چاہے کر آتا تو بڑی بے بسی سے مجھے خردی کر ساری رات کتی ہندو اس کے کمرے میں کوڑے کر کٹ کے تو کمرے پھینکتے رہے ہیں۔ ایک بار تو ایک انسانی کھوپڑی بھی اس

کی چار پانی پر آکے گئی۔ رمضان بڑے دل گردے کا کشمیری تھا۔ کیونکہ جب میں نے اسے راتے دی کہ رات گوڈ رائینگ روم میں اگر سورہ کرے تو اس نے صاف انکار کروایا۔ «صاحب اگر میں نے کواٹر چھوڑ دیا تو یہ سلے ہندو سمجھیں گے کہ یہ مسلمان ہتا ہو دا ہے۔»

اس روز میں نے دوپہر کے کھانے پر ایک دوست کو بلایا تھا تھا۔ کھانے میں پلاڑ، کو فتنے اور سیخ کیا ب تھے۔ جب میں نے نوالہ منہ میں ڈالا تو میرے دانتوں میں ریت ایسی کو تھیز کر کچھ کرنے لگی۔ معاجمجھے خیال آیا کہ رمضان نے مصالح کچھ سل پر پیسا ہے اور سارے کھلنے میں کم اگئی۔ جس جس چیز کا نوالہ منہ میں ڈالتا تھا اس میں لکھنیاں سی کو کڑائے لگتی ہیں۔ لیکن یہ ریت اور دوست بڑے سے ہر چیز نوش جان فرماتا تھا اور اس نے ایک بار بھی ریت یا انکریں کی شکایت نہ کی۔

کھانے کے بعد میں نے ایک پان لیا۔ منہ میں ڈالتے ہی میرے دامت بڑی طرح جھنچھنائے کیونکہ پان میں سپاریوں کی جگہ چھوٹی چھوٹی لکنکریاں بھری ہوئی تھیں بنگرے کی سچاہاں میں بھی ریت کے ذرے سے تھے۔ سبب کامنگڑا پکتے روٹے کی طرح لکھتا تھا یہاں تک کہ جب میں نے ایک کیلہ چھیل کر کھانے کی گوشش کی تو اس میں بھی کچھ کچھ کرنے ہوئے مٹی کی آمیش پانی۔

شام کے وقت میں ڈرائینگ روم میں اکیلا بیٹھا تھا۔ یک ایک کرے میں بھنے ہوتے گوشت کی پیشیں آنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد سوچی کے گرم گرم حلے کی سوندھی سوندھی خوشبو چھیل گئی۔ اس کے بعد یک ایک ایک بہت بڑی چمگا دڑ زور میں بھلی کے بلب پر آگرگی۔ بلب توٹ گیا اور اندر صیرا ہوتے ہی مجھے یوں نظر آیا جیسے میرے سامنے فرش پر ایک انسانی جسم سفید چادر میں لپٹا ہوا ہے۔ میں چیلانگ لگا کر باہر نکلنے لگا تو کمرے کے سارے دروازے ٹھپ ٹھپ بند ہو گئے۔ جھٹ پر با جاسا بھنے لگا جس میں ڈھول،

طبیلہ اور نشنائی کے ساز خاص طور پر نہایاں تھے۔ باہر بنا دے میں یوں سنائی دیتا تھا، جیسے  
بڑے بڑے شہزادگھوڑے پکے فرش پر سر پت بھاگ رہے ہیں۔ گھپ اندر ہیرے میں  
میں نے ایک دیوار سے کوڑھد سے کھوئنے کی گوشش کی تو ساری چوکھٹ اکھڑ کر دھڑام  
سے زمین پالا گئی۔ میں لپک کر بنا دے میں آگئی۔ یہاں کیاں اکھڑی جوئی چوکھٹ اپنی جگہ پر  
ایسا دادہ ہو گئی۔ کھٹ کھٹ کر کے کمرے کے سارے دروازے اور کھڑکیاں کھل گئے۔  
اس وقت رات کے سائز ہے آٹھ بجے تھے، میں ٹری بے صبری سے رمضان کا انتظا  
کرنے لگا کہ وہ کھانا لے کر آتے تو مجھے گوشت پوست کا ایک جیتا جا گئਾ۔ انسان نظر آئے۔  
جب کافی دیر تک رمضان نہ کیا تو میں نے اپنے ڈرائیور کو آواز دے کر لگا کہ وہ رمضان کو  
بلال کرے۔ ڈرائیور بھی باور پھی خانہ میں جا کر غائب ہو گیا۔ کچھ دیر انتظار کے بعد میں خود دہا  
گیا۔ باور پھی خانہ خالی تھا۔ چولے ہے میں آگ بھی ہوتی تھی۔ دروازے کے پاس رمضان  
خاموش ٹا تھا۔ اس کے نزدیک ڈرائیور بھی دنیا و ما فہما سے بے خبر ہیا ہوا تھا۔ میں نے  
ان کے مہنہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے تو وہ دنوں جمایاں لے کر اٹھنی شروع ہی۔ جیسے ابھی  
ٹوپی نہیں سے بیدار ہوتے ہوں۔ رمضان نے اپنی گھٹی دیکھی، سائز ہے ذوب بھے کا  
عمل تھا۔

”اوہ صاحب اتنی دیر ہو گئی“: اس نے معدرت طلب آوازیں کہا۔ ”ابھی تک  
کھانا بھی تیار نہیں ہوا۔“

پھر اس نے زیرِ لب جملہ اہل ہندو کو چند گالیاں دیں جو کالے جادو کا عمل کر کے بیجا سے  
مسلمانوں کو خواہ مخواہ پر لیشان کر رہے تھے۔

رمضان نے جلدی جلدی دو انڈوں کا آمیٹ بنایا۔ میں نے آمیٹ کا ایک ٹوکڑا  
کاٹا تو اس میں سے گاڑھے گاڑھے خون کی دھار سی ہمہ نکلی۔ یوں بھی آمیٹ مطہی بساندی  
تجھیل کی طرح بد بودار مردار سا ہو گیا۔ میں نے جلدی جلدی اس سڑاند چھوڑتی شے کو کاغذ

میں پسیت کر باہر بھینک دیا۔ اگر کہیں غلطی سے رمضان کو پتہ لگ جاتا تو ہندہ و قل کے کارے علم کا یہ کرشمہ دیکھ کر اس کے تن بدن کی ساری اسلامی ریگیں بڑی طرح دکھنے لگتیں۔ لیکن سیری گوشش کے باوجود اس کا لے علم نے بہت جلد رمضان کے دل و دماغ پر پوری طرح تسلط جمالیا۔ میں نے اُسے استور دم میں بھیجا کہ وہ میرا گراموفون اور کچھ ریکارڈ نکال لاتے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پیٹنے میں شرب لور والپس آیا اور فرن صورت بنناکر بولا۔ ”صاحب کوئی حرامزادہ اسٹر میں گھسنا بیٹھا ہے اور دروازہ کھولنے نہیں دیتا؟“

میں رمضان کے ساتھ استور دم لیا اور اس کے دروازے کو دھکا دیا۔ کوڑا تھوڑا سا سکھلا، پھر غلیل کے سبڑی طرح زنانے کے ساتھ والپس گھوم بند ہو گیا۔ ہم دونوں نے کوڑا کے ساتھ کندھے لے گا کر زور سے دھکیلا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شے اندر سے پوری قوت کے ساتھ دروازے کو بند رکھنے پر تلقی ہوئی ہے۔ یکاکی رمضان کو ایک ترکیب سوجھی۔ وہ چاروں شانے چت زمین پر لیٹ گیا اور اپنے دونوں پاؤں دروازے کے ساتھ ملا کر پورے زور کے ساتھ اسے دھکیلنے لگا۔ دروازہ چٹاخ سے کھل گیا اور رمضان اسی طرح لیٹا ہوا تیز رفتاری کے ساتھ اندر گھستتا چلا گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی اسے ٹالنگوں سے پکوڑ کر بڑی طرح گھسیت رہا ہے۔ کمرے میں گھپ اندر ھیرا تھا۔ میں نے جملی جملاتی تو رمضان اٹھ کر کپڑے جھاڑ رہا تھا۔ اس کا پسیت اور کہنیاں بڑی طرح چھل گئی تھیں اور کپڑوں پر جا بجا خون کے ذہبے پڑے ہوتے تھے۔

رمضان لنگڑا تا ہوا خاموشی سے باہر سپلا گیا۔ میں نے گراموفون اور چند ریکارڈ اٹھائے اور ڈرائینگ روم میں چلا گیا۔ اتنے میں میرا اور ایشور اندر آیا اور بولنا دھما۔ رمضان گاڑی میں باہر جانا چاہتا ہے، لے جاؤں؟“

”کہاں جاتے گا؟“ بیس نے پوچھا۔

”مشاید شہر جلتے گا صاحب؟“

”لے جاؤ؟“ بیس نے کہا ”جلدی والپس آنا“

رات کے اندر ہیرے میں جب میری موڑ کپونڈ سے باہر نکلی، تو اس کی بچھلی سرخ تباہ دوستک نظر آتی رہیں۔ سرخ روشنی کو دیکھتا رہا۔ جب کار کی تباہ نظر سے اُدھیل ہو گئیں تو پیچے سے کسی نے میرے کندھے پر ایک ہنکا سا لامتحر کھو دیا۔ بیس اچک کر پیچے مڑا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ مگر اس غیر مرتب لمس کی جھنجھناہٹ بہت دیر تک میرے رگ و پے میں سرسراتی رہی۔ باحوال کی اس گورستان کیفیت کو تو چڑھ کے رہیے بیس نے سہل کا ایک پسندیدہ ریکارڈ گراموفون پر رکھ دیا اور چابی دینے کے لیے باجے لی گنجی کو کھایا۔ چابی لٹکنے کی وجاتے بڑی سرعت کے تاثر اٹی طرف گھومتے لگی۔ بیس نے سوچا شاید چابی پہلے ہی سے پوری طرح چڑھی ہوئی ہے۔ چنانچہ بیس نے سوئی بدل کر ساونڈ بکس کو ریکارڈ پر رکھ کے چلا دیا۔ ریکارڈ میں سے پہلے ایک نختے سنتے نختے کے روشنے کی آواز آئی۔ پھر کسی عدت کی سیسکیلیں شنائی دینے لگیں۔ اور پھر کویا ایک بھوپھال سا آگیا۔ ریکارڈ میں بھیانک آوازیں آئنے لگیں۔ جیسے بہت سارے لگلے یہی وقت بے دردی سے گھومنٹے جائے ہوں۔ یوں بھی سارے کرے میں ایک خوفناک سار تعالیٰ جھاگیا اور کھڑکیوں اور دروازوں میں بیسوں سنکھ بجنٹے گے۔ ان ناقوسوں کی آوازویں ہی تھی جیسی ہندوار بھیوں کے ساتھ سنکھ بچوٹکے پر برا کم ہوتی ہے۔ بھلی کی روشنی مدھم ہوتے ہوتے موٹ بھی کی طرح ہلکی ہو گئی اور دھمی دھمی روشنی میں سرخ تسرخ انکار سے تیرنے لگے۔ مجھے الیسا محسوس ہونے لگا۔ جیسے میرے گرد و پیش بہت سی لاشیں چڑھ جو جمل رہی ہوں۔

شہشان بھومنی کے یہ وحشت ناک لمحے بے حد طویل ہو گئے، اور صدیاں گزرنے کے بعد جب میری کار کی تیز تیز روشنی دوبارہ کھڑک پر ٹری تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سارے مکان کو تیز تیز شعلوں نے اپنی آغوش میں لپیٹ لیا ہے۔ رمضان ننگلا تاہما کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچے یچھے ایک سفید روشن بزرگ تھے جنہوں نے سبز منکوں کی تیز گلے میں ڈالی ہوئی تھی۔ ان کے باہم میں موٹا سا عصا تھا اور سر پر درویشوں والی چوگوئشہ ٹپی تھی۔

یہ درویش حاجی علی اکبر بانوں تھے۔ حاجی صاحب لٹک کی جامع مسجد کے خطیب تھے اور ایک خوش بیان شاعر ہونے کے علاوہ ان کی نیکی اور پارسائی کا بھی بہت چرچا تھا۔

گراموفون بدستور آہ و فغاں میں صروف تھا۔ اور سنکھوں کی جگرچاک کرنے والی آواز مرنگ میں ہجنوں کی طرح گونج رہی تھی۔ حاجی اکبر بانوں چند ساعت دم بخود کھڑے رہے پھر انہوں نے ایک کاغذ پر کچھ لکھ کے گراموفون کے ساؤنڈ باکس پر کھدیا۔ ساؤنڈ باکس زخمی ٹھاگ کی طرح لٹکھا ایسا۔ ایک دو ثانیوں کے لیے اس میں سے کھڑک کھڑک آواز آئی اور پھر لیکارڈ میں سمجھ کی اپنی آواز دیا۔ ننگلا بنے نیارا ۔۔۔ گانے لگی۔ حاجی علی اکبر بانوں مسکراتے اور اپنی جیب سے تیزی سے نکال کر فرش پر دونالوں پیٹھیں گئے۔ میں نے گراموفون بند کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ ساؤنڈ باکس پر دھرا ہوا کاغذ اٹھا کر دیکھا تو اس پر کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا۔

گراموفون تو بھیک ہو گیا لیکن سنکھوں اور ناقوسیں کی آواز اب کچھ اور بھی شدید ہو گئی۔ کمرے کی دیواروں کے ساتھ یہ آوازیوں کو خیلی جیسے طوفان میں سمندر کی ٹری ٹری امیں ساحل سے نکلا کر چلتی میں۔

Hajji علی اکبر بانوں سماں بھیں بند کر کے تیزی پھر نے لگے۔ رمضان بھی پاس ہی

مودب بیٹھ گیا اور اپنی جیب سے دعا نے لگنے العرش بخال کر ورد کرنے لگا۔ جوں جاوی صاحب کا صرفہ عینیق ہوتا گیا، پاروں طرف گوچتی ہوئی آواز دن میں ایک نامعلوم سی نشکین پیدا ہونے لگی جیسے الگ کے تیز تیر شعلوں پر ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہو۔ پھر فتحہ رفتہ یہ پھوار پڑھی۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ ساری خوفناک آوازیں ایک لمبی سی سلسکی میں سائیں سائیں کرنے لگیں۔ چوئے ہوئے یہ سائیں سائیں بھی فضایں تخلیل ہوئی گیں اور اس کی آواز بھجوں سے گزرنے والی بندوں کی شپ ٹپ میں تبدیل ہو گئی۔ پھر یہاںک ایک چھنکا سا ہوا اور سارے ماحول پرستا سا چھا گیا۔ اس ستائے میں ایک اونچی سی تان اُٹھی اور غشت غشت کر کے سارے کمرے میں بول کے پانی کی طرح بھر گئی۔ مُھندا در غبار کا ایک ریلاسا آیا اور مکان کی اینٹ اینٹ سے بے حد خوش الحان قرأت میں اذان کی صدائیں لگی۔ یہ اذان مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک پھیل گئی اور اس کی بلند آہنگی اور خوش الحان سارے عالم پر ایک زد کار شامیانے کی طرح چھا گئی۔

کچھ عرصہ کے بعد ایک روز میں سری ہری کشن مہتاب کے پاس بیٹھا تھا۔ انھوں نے ہنس کر پوچھا۔ سنائیے نئے مکان میں کسی بھوت پریت سے سابقہ تو نہیں پڑا؟

”بھوت پریت تو عمر توں اور پھوں پر زیادہ اُترتے ہیں۔“ میں نے مذاق میں بات مالنے کی گوشش کی بعد میں اکیلہ رہتا ہوں میرے پاس بھلا دکیا کرنے آئیں گے۔

”تعجب“ دنیروں اعلیٰ نے کہا اس مکان میں جو روح آتی ہے وہ ایک بہان اور خوبصورت لڑکی ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ تم میں ضرور دلچسپی لے گی۔

”وہ لڑکی کون تھی؟“ میں نے استجواب پوچھا۔

مہتاب صاحب نے اپنی دو دھمکی سفید کھدر کی ٹوپی سر سے اتار کر میز پر کہ

دی۔ ان کے چہرے پر کھانیاں سنانے والی بوڑھی واہیوں اور ناتیوں والا موڈ طاری ہو گیا۔ وہ الگی پالتی مار کر کرسی پر بیٹھ گئے اور بوئے کوئی تمیس برس قبل اس کو بھی میں ایک انگریز افسر ہتا تھا۔ اس کے پاس ایک طردہ رائیا تھی۔ آیا کامنام سو شیلا تھا۔ سو شیلا بڑی خوبصورت اور خوش مزاج لڑکی تھی۔ اور خوب بن سدور کے رہا کتنی تھی۔ انگریز افسر کا دل سو شیلا پر بڑی طرح لگ گیا۔ اور اس نے شادی کا چکمہ دے کر اس پر می کو شیشے میں آثار لیا اور سو شیلا نے اس انگریز کو پنادیوتا سمجھ کر اس کی خوب خدمت کی۔ ایک روز جب اس نے شریمن ولمنوں کی طرح یہ راز افشا کیا کہ وہ عنقریب ہی مان نہنے والی ہے، تو صاحب بہادر کے ہاتھوں کے طوٹے اٹک گئے۔ اس نے رات سو شیلا کا گلا گھونٹ کر اسے مارڈا لاجب سو شیلا کا گلا گھر جا رہا تھا تو عین اسی وقت اس کے بطن سے ایک مردہ بچی پیدا ہوئی۔ انگریز افسر نے ان دونوں لاشوں کو اسی کوھنڑی کے کھی کونے میں دبادیا کیتے ہیں کہ اس روز سے بچاری سو شیلا کی روح اپنی بچتی کی لاش اٹھلتے اس کو بھی میں بھٹک رہی ہے۔“  
”اس انگریز افسر کا کیا بنا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ زمانہ خالص انگریزی راج کا تھا۔“ مہتاب صاحب نے ایک ممتاز کامنگریسیں پیدا کی تھیں سے کہا۔“ وہ افسوس لشک کا کمشنر بھی بنا۔ اسے بہت سے خطابات بھی ملے اور ولایت میں وہ آج بھی بڑی شان سے زندہ ہے۔“

# اقبال کی فریاد

آزادی سے قبل تو خیر دوسری بات تھی۔ لیکن اب اللہ کے فضل و کرم سے آپ کو پاکستان مل گیا ہے تو اب ذرا مجھے بھی دم لینے دیکھئے۔ شکایت کرنا تو مومن کی شان کے خلاف ہے لیکن جس بے دردی سے آپ میرا بیچھا فرما رہے ہیں۔ اس میں میرے اور میری شاعری دونوں کے لیے بڑی عبرت کی نشانیاں ہیں۔

جلے جلوس میں گڑ بڑ کا احتمال ہو تو اس کی روک تھام کے لیے اقبال کا شعر دھوال دھار تھرید میں سانس بچولنے لگے تو دم لینے کے لیے اقبال کا شعر رسالوں میں بھی جھی جگہ پڑ کر نے کے لیے اقبال کا شعر ریڈیو میں فال تولمحات گزارنے کے لیے اقبال کا شعر گرمی گفتار ہو یا گالی گلوبیج، نصیحت ہو یا فصیحت، وقت بے وقت، جگہ بے جگہ میرے غریب اشعار کا حصہ بُری طرح بکھڑا جاتا ہے۔ خوشامد اور چاپوں سی ہو تو طاڑلہ بڑا کا ہی ان ہوتا ہے۔ فرعونیت میں اسرار خودی فاش کیے جاتے ہیں۔ شراب اور رباب میں روز بے خودی کی تلاش ہوتی ہے۔ چندے کے وقت شاہین پتوں کے بال وہر

اچھائے جاتے ہیں۔ چور بازاروں میں دہقان کی روزی اور خوشگندم کی داستان حلپتی ہے۔ دن کے وقت تقدیر امام اور شمشیر و سنان کے نفرے بلند ہوتے ہیں۔ رات کے وقت طاؤس ورباب کی باری آتی ہے۔ یہ بھی غنیمت ہے کہاہ سحر میرے بیٹے تبرگا چھوڑ دی جاتی ہے۔ اور اللہ کا نام ساقی کے سپر ہوتا ہے۔ ورنہ خدا جانے ان دو زینوں میں بھی کیا کیا گل کھلاتے جاتے۔ سینا والے اپنے اشہاروں میں ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ کی تلقین فرماتے ہیں۔ ایک آلمہ میر امیل والے نے تیل کی بوتوں پر گیسوے تایدار کو اور بھی تایدار کر کے لیبل چیپاں کر رکھے ہیں۔ ایک خاندانی حکیم صاحب اپنی قیمت اور میرے کے سرموں کی بدولت میرا عشق میری نظر بخش دینے کے دعویدار ہیں الیکشنز میں خاص طور پر میرے قلب و نظر اور عشق و خود کا بے دریغ استعمال ہوتا ہے اور رقاہ عام کی بہت سی انجمنیں قبر کے تبوں کے لیے میرے اشعار بلا معاوضہ منتخب کرنے کے لیے بھی شکر بست رہتی ہیں۔ ان کے علاوہ میرے خاص کرم فرماؤں میں قولوں اور ریڈیلو والوں کا درجہ بہت بلند ہے۔ اگر ان اصحاب کی گوششیں با راؤ اور ہمیں تو عجب نہیں کہ بہت جلد میر کے کلام کو پاکستان سے ہجرت کی سعادت نصیب ہو جاتے۔ یہ وہ سنت نہوئی ہے جو یہیں جیتے جی خود تہنجا سکا۔ لیکن اگر میرے پرستاروں کی اعانت سے میرے کام کو یہ درجہ اب مل سکتا ہے تو زبے نصیب۔ دراصل سچ تو یہ ہے کہ فی زمانہ آپ میری شاعری میں کچھ اس طرح ابھگتے ہیں کہ نہ جاتے رفتہ نہ پائے ماندن۔ ایک فیشن ہے چھوڑیتے تو مشکل نہ چھوڑتے تو مشکل۔ لیکن اگر قولوں اور ریڈیلو والوں کی برکت سے میر اکلام اُٹھیا تو ہم خرامہم ثواب والی بات ہوگی۔ یعنی بھی بھٹکنے مفت میں آپ کا پیچا بھی بچھت جائے گا اور مجھے بھی کچھ دم دینے کی مددت نصیب ہوئی۔

قولوں کا مستور تھا کہ دہ عموماً فارسی پر اپنی نظر عنایت رکھتے تھے۔ اُردو میں از کا زور نظر اکبر آبادی کے خسروں اور حالی کے مسدس کے علاوہ اور کسی چیز پر زیادہ

نہیں چلا۔ لیکن جوں ہی اس فقیر سے شاعری کا گناہ سرزد ہوا ان کی ساری توجہ ایک طوفان کی طرح میری طرف امدا آئی۔ اب یہ حالت ہے کہ مشکوہ اور جواب شکوہ کے علاوہ میری دوسری معصوم نظموں کو بھی سرتال، تلقفنا در گل کے ایسے بیچ ختم ہیں ہے گوارا جاتا ہے کہ ان کی صورت مسخ ہو کر کچھ سے کچھ بن جاتی ہے۔ یوں تو قوالیاں عام طور پر اولیے کے لام کے مزاروں پر ہوتی ہیں۔ لیکن اندھا شکر ہے کہ مجھے درجہ دلایت عطا نہیں ہوا اس پیسے اس فقیر کی قبر قوالوں کی دسترس سے محفوظ ہے۔ لیکن اب یہ نیا گل ہکلا کر قریب کی جگہ اس غریب کے نام پر قوالیوں کا دستور زور پکڑنے لگتا ہے۔ چنانچہ جب شادی بیاہ یا چلم کی رسوم کا ہمانہ نہ ہو تو پہلکفت دعویوں کے بعد محض مشوقیہِ اقبال کی قوالیوں سے جی بھلایا جاتا ہے۔ امتید تھی کہ شاید شاعرے اس رسم کو توڑنے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن ممکنت خدا وادیں قوالوں کی تعلاد کسی عنوان شاعروں سے کم نہیں ہے اس پیسے یہ دونوں مشاغل یکساں رفتار سے جاننی ہیں۔

خدا کے فضل سے قوالیوں اور زیبیوں کچھ ایسا چوپی دامن کا ساتھ ہے کہ جب کہیں قوالی ہو رہی ہو تو ریڈیو کا گھان نہ تکھیے اور ریڈیو پل رہا ہو تو قوالی کا رنگ بھج جاتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ریڈیو والوں نے میری عزت افزانی کے پیسے اور بھی بت سے طریقے ایجاد کر رکھے ہیں۔ فلمی گانوں کا فرمائشی پروگرام وقت مقرر سے ایک آصد منٹ پہلے ختم ہو جائے تو عموماً اقبال کا ایک شعر "کام آتا ہے۔ اگر عین موقع پر کوئی مقرر حاضر ہو سکے تو تقریر کا موضوع خواہ دیکھیا فی کھاد" ہو یا "پاکستانی کھالیں" اس کی جگہ بڑی بٹکھی سے اقبال سے ایک ملاقات "یاد اقبال کا فلسفہ خودی" رکھ دیا جاتا ہے۔ کیونکہ آپ کی دنیا میں اقبال کے ملاقاتیوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔ بلکہ جوں بھول وقت گزرتا جاتا ہے، ان کی تعداد میں کچھ اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ اور خدا کے فضل سے میرے فلسفہ خودی کے ماہرین کا فیض بھی بڑا عام ہے۔ ماں یہ دوسری بات ہے کہ

ادھر یہ تقریبیں شروع ہوئیں، ادھر ریڈیو کے شاپنگز نے سونی ٹکما کر دسرے اشیائیں کی راہ لی۔ اللہ اکیم زمانہ تھا کہ میرا کلام سنتے کے لیے لوگ عید کے چاند کی طرح اتنا کرتے تھے۔ ابھی حیاتِ اسلام لاہور کے سالانہ جلسے مجھے ابھی تک یاد میں اور میں قیام تک جامع مسجد لاہور کا وہ سال بھی نہیں بھجوں سکتا جب نماز جمعہ کے بعد میں نے حضور رسالت آتیں جنگ طرابس والی نظم پڑھی تھی۔ آپ کو خالد بیان یاد ہو گا کہ ایک بار میں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجاکی تھی کہ میرا فور بصیرت عام کر دے۔ شاید یہ اسی وعا کا اثر ہے کہ اب کہا بھی ہو ذھا کہ، لاہور ہوب پشاور صبح ہو یا شام ریڈیو کا پنڈ دبلیتے، کسی نہ کسی جگہ سے ہر وقت اقبال کا کلام نشر ہو رہا ہے۔ کہیں گلدستہ باتی ہے کہیں سلطان جان یادا تم علی بیا حاتم خان ہے کہیں شرافت علی، ظرافت علی اور ان کے ہمنوا میں کبھی یہ گمان گزتا ہے کہ درویشوں کی ٹولی چاکا کر جیک مانگ رہی ہے۔ کبھی رونے کی بیتل کاشیہ ہوتا ہے۔ کبھی مرثیہ حوانی کا سامان بندھتا ہے۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ اکثر لوگ اقبال کے کلام کا علاں سنتے ہی ریڈیو کی سونی ٹکما دیتے ہیں۔ ورنہ جس نے ایک بار دل لٹکا کر ان را گینوں کو سنا وہ چیز کے لیے ان نغموں کو کتابی صورت میں پڑھنے سے بھی بیزار ہو گیا۔ اکثر اشتہار بازوں، قوالوں اور ریڈیو والوں کی مساعی جمیلہ کے باوجود خدا خاستہ بھرے نام یا کلام یا کلام کا کچھ حصہ سلامت بچ گیا تو رہی سی کسر نکلنے کے لیے بزرگوں کی ایک جماعت بھی خدمت کے لیے تیار ہے۔ یہ وہ بزرگ ہیں جو میرے ہم نوالہ اور ہم پیالہ تھے، جن کی محبت میں میں نے گناہ و ثواب، عقل و عشق، خودی و بے خودی کی بیٹے شمار منزلیں ملے کی تھیں اور جن کے سینے میں ابھی تک میرے غیر مطبوعہ اشعار کے گنجھاتے گرائے محفوظ ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان میں سے اکثر حضرات ایسے میں جن سے اس خاکسار کو بھی ملاقات کا ثرف بھی حاصل نہ ہوا تھا۔ لیکن اب جس وقعت سے پھری زندگی کے رانہ ہاتے سرپستہ فاش کرنے میں مشغول ہیں اسے دیکھ کر کبھی تو مجھے اپنے

متعاقن شہر ہونے لگتا ہے۔ بچارے منکر کیا اگل پریشان ہیں کہ یہ کیسا شخص تھا جس کے اعمال خود ہماری نظر سے بھی پوشیدہ رہے۔ پچھا نچھے اب یہ تمول ہو گیا ہے کہ کسی صاحب نے لکھنگو کا یوں آغاز کیا کہ ”ایک روز جب میں حضرت علامہ مرحوم کی خدمت میں حاضر تھا... اس لئے گھرگار کے اعمال نامے کی از سہ نوجاں پڑال ہو نے لگی۔ پہلے من نافٹا بھی بہت ناراض تھے کہ یہ دُنیا و اسے بڑے بے حیا ہیں۔ ان کے ذاتی اور سچی خطوط تک کو اٹھا کر جھاپ ڈالا۔ لیکن جب میں نے اپنے خلف طکا حشران سے گوش گزار کیا تو وہ مشکراتے اور فرما نے لگے ”میاں اقبال غم نہ کرو، یہ بڑے دل گردے والی اُمت است ہے جس نے اُند کے رسول پر بھی بے شمار الٰہی سیدھی حدیثیں ایجاد کرنے سے پرہیز نہیں کیا، وہ بھلا تھمارے جیسے خاکپاتے رسول مکہ میان چھوڑتی۔ ہمارے حقیقت خرافات ہیں کھو گئی۔ یہ اُمت روایات میں کھو گئی؟“

اب رہا اقبال ڈے کا معاملہ۔ یہ رسم میری زندگی ہی میں شروع ہو گئی تھی لیکن اب میں دیکھتا ہوں کہ زمانے کے انداز بدل گئے۔ اقبال ڈے پر بچارے اقبال کے سوا ہر چیز کا خوب اہتمام کیا ہوتا ہے۔ سیاست دانوں، طالب علموں، ادیبوں اور تاجروں کی ہر پارٹی اپنی پالی اگل جاتی ہے۔ سیاست دان و صتوں دار تقریبیں کرتے ہیں کہ سند رہیں اور بوقتِ انتخاب کام آئیں۔ طالب علم امتحانات ملتوی کرنے پر زور دیتے ہیں۔ ادیب ایک دوسرے کی پچڑی اُچھائی کا مشغله سنبھالتے ہیں اور تاجر لوگ اپنی پورٹ ایکسپریس لائنسوں کی مشکلات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ سرکاری درباروں میں بھی، ٹرےے ٹھستے کے انتظامات ہوتے ہیں اور افریقی صوفوں اور ایرانی قالینوں پر عظیم منعقد ہوتی ہیں۔ غرباً پاک کوں اور با غیجوں میں جلسے منعقد کرتے ہیں کھانے پینے کے شو قیں ٹی پارٹیاں رچاتے ہیں۔ کہیں کہیں مشاعرہ بھی ہوتا ہے اور یہے دیرینہ کرم فرمائیڈیو والوں کے دم قدم سے نظم خوانی اور توالیوں کا زنگ بھی خوب جنتا

ہے۔ اگر گھاگھی میں فی سبیل اللہ کچھ توجہ میری طرف بھی منعطف ہوتی ہے تو کبھی محمود کا اقبال سامنے آتا ہے۔ کبھی ایاز کا کبھی بندے کا اقبال ظاہر ہوتا ہے کبھی بنو لوز کا۔ لیکن بیچارے مومن کے اقبال کو کوئی نہیں پوچھتا۔ کہ جس کے لیے میرے دیدہ تر کی بے خوابیاں، میرے ول کی پوشیدہ بے تابیاں۔ میرے نالہیم شب کانیاز میری خلوت و انجمن کا گذار، اُمینگیں، میری آرزویں، میری اُمیدیں، میری جستجویں ہمیشہ ہمیشہ ہیقرار رہتی تھیں۔

اگرچہ عالم بالا میں اقبال ڈے منٹے کا رواج نہیں۔ لیکن رضوان کی مہربانی سے اس روز ہم سب کوچھی ضرور عطا ہوتی ہے۔ معلوم نہیں آپ کے ہاں کیا دستور ہے؟

## اُثنا رفت دمپیہ

آج سے کوئی ایک ہزار سال کے بعد جب دنیا میں ایٹم یعنی ذرہ عظیم کا دور دوڑھ ہو گا۔ اور ماہرین آثار قدیمہ بیسویں صدی کے متعلق چھان میں کریں گے تو امید ہے کہ ان کے تاثرات کچھ مندرجہ ذیل قسم کے ہوں گے۔

ادب:

کچھ کھوپڑیاں ایسی ملی ہیں جن سے اس نظریے کی وضاحت ہوتی ہے کہ اس زمانے میں ایک قوم نام اویب بھی آباد تھی۔ کھوپڑیوں کی مدد سے اس قوم کے متعلق صحیح معلومات ہم پہنچانا مشکل امر ہے کیونکہ کچھ کھوپڑیاں الٹی ہیں اور کچھ سیدھی۔ البتہ دیگر مثالوں کی بنا پر اس کے بہت سے کوائف تحقیق ہو چکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسل کتنی شاخوں میں بھی ہوتی تھی۔ شاعر، افسانہ نویس، نقاد، مقالہ نگار، یہ چار بڑی شاخیں تھیں۔ ان میں بھی بہت سے فرقوں کا اپنا اپنا

الگ مسلک تھا۔ ترتی پسند، غزل گو، بے قافیہ و بے روایت، بے سرد پاہ بھم وغیرہ وغیرہ اپس میں جو تی پیزار کے علاوہ ان کا دوسرا محبوب مشغله عورت تھی۔ جیسا کہ ہم کسی اور جگہ بیان کر چکے ہیں۔ ایسا ہر چہالت میں عورت ایک مشهور مخلوق تھی۔ اسے جنس لطیف کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا لیکن اس کا اصل مقصد نسل انسانی کی بقا کا کام تھا۔ یہ کام آج کل ہماری حکومت میں ایسی شاعروں سے لیا جاتا ہے۔

نسل انسان کی بقا کے علاوہ عورت کو اور بھی بہت سی باتوں کی لست تھی مثلاً شاعروں، افسانہ نویسوں اور مصوروں پر سوار ہوتا۔ اس زمانے کا ایک شعر ہے سے

ہند کے شاعر و صورت گرو افسانہ نویس

اہ بے چاروں کے اعصاب پ عورت ہے سوار

ایک دوسرے بیان کے مطالبہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ لیکن اس بیان کی ابھی تک تصدیق نہیں ہو سکی۔

ادھیروں پر سوار ہونے کے علاوہ عورت نامی صنف کا ایک اور مشغله حسن تھا یہ معالم نہیں کہ اس مشغله کی اصلی نوعیت کیا تھی۔ لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ حسن کا عشق سے گمراہ کا وہ تھا۔ جیسا کہ آپ ارضِ دیوانگی کے سلسلہ میں سن چکے ہیں عشق ایک خطرناک تعددی مرض تھا جو دل میں فسادِ حزن اور دماغ میں خلل کی وجہ سے پیدا ہوتا تھا۔ اس زمانے کے انسانوں میں دل سینے کے بائیں طرف گوشت کے ایک لوٹھڑے کا نام تھا جہاں اب ہم نے بتی ڈانمو گائے ہوئے ہیں اور دماغ کی جاتے و قرع کھوپری کے نیچے تھی، جہاں اب ضرورت کے لحاظ سے مختلف کیشل پاؤر کے قسمی آؤیزاں کیے جاتے ہیں۔ قیاس ہے کہ جس طرح چوہوں سے پلیگ اور مکھیوں سے بہینے کے جراحتیں پھیلتے تھے۔ اسی طرح عورت سے عشق کی دباؤ پھوٹتی تھی۔ چونکہ قوم ادیب عورت کی پیر و تھی اس لیے یہ مرض اس قوم میں ٹہری شدت سے پایا جاتا تھا۔

اس قوم کے دو مشہور فرقوں یعنی رجعت پسندوں اور ترقی پسندوں کے بہت سے حالات دستیاب ہو چکے ہیں۔ رجعت پسندوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ہنسنے سے زیادہ رونے، سونے سے زیادہ جلگتے اور مکانوں کی جگہ سایہ دبوار کے شوقین تھے۔ تاریخ گفتا ان کا محبوب مشغله تھا۔ گلیوں میں دوٹانگوں کی سجائے سر کے بل چلتے تھے۔ اور تالبینوں کی جگہ آنکھیں بچھانے کے عادی تھے۔ کپڑے وہ کبھی پہنچتے تھے، کبھی پھاڑڈلتے تھے۔ اور ان کی خواراک میں دل جگر، خون، زہر، شراب، شربت اور انواع و اقسام کی گالیاں شامل تھیں۔

اس کے بر عکس ترقی پسند نہ ہنستے تھے، نہ روتے تھے، نہ سوتے تھے، نہ جلگتے تھے، نہ کھاتے نہ پینتے تھے۔ البتہ ان میں لکھنے کا بہت شوق تھا۔ لیکن یہ تحقیق نہیں ہو سکا کہ وہ کیا لکھتے تھے۔ یہ بات وہ خود بھی نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ اسی وجہ سے انھیں ترقی پسند کہا جاتا تھا۔ اس لحاظ سے ان کا وجود ارتقا نے انسانی میں ایک اہم سنگہ میں کا درج رکھتا ہے۔ ان کو یہ امنیا ز حاصل ہے کہ انھوں نے پہلی مرتبہ دل دماغ، عقل و فہم ہوش فروں کے بہت توڑو لئے اور انسان کے ذہن کو روایتی قیود سے آزاد کیا۔

رجعت پسندوں اور ترقی پسندوں میں صرف ایک مشابہت تھی۔ وہ یہ کہ دونوں ایک دوسرے کو اٹا دیکھتے تھے۔ رجعت پسندوں کا دخونی تھا کہ ترقی پسند سید ہے نہیں اوندھے ہیں۔ اور ترقی پسند رجعت پسندوں کے متعلق یہی نظر ہے رکھتے تھے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ دونوں میں سے کس کا دعویٰ صحیح تھا۔ لیکن قیاس ہے کہ دونوں میں بہت سے لوگ سید ہے تھے۔ اور بہت سے اوندھے۔

ایڈیٹر:

بیسویں صدی کے حشرات الارض میں اخبارات کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ کیونکہ ان

کام کاٹا پانی تک نہ مانگتا تھا۔ اخباروں کو کامنے کا مرض ہی نہیں بلکہ جنون تھا سچ تو یہ بے کران کی زندگی کا دار و مدار ہی اس فن پر تھا۔

جس طرح سانپ پائتے والے کو پیسرا دری پچھو والے کو قائد رکھا جاتا تھا، اس طرح اخبار والے کو ایڈیٹر کرتے تھے۔ ایڈیٹر کام یہ تھا کہ وہ موسم کے مطابق اخبارات کو پال پوس کر تیار رکھتا تھا تاکہ وقت آنے پر وہ کامنے کے فرائض بطریق احسن سرجنام دے سکیں۔ اس عمل میں کبھی کبھی ایڈیٹر خود بھی کٹ جاتے تھے لیکن جس طرح نیوے کو سانپ کے زہر کے متعلق جرمی بوٹیوں کا علم تھا۔ اسی طرح ایڈیٹروں کے پاس بھی اخبار کے کامنے کا منزور موجود تھا چنانچہ وہ خود اس زہر سے کبھی نہیں مرتے تھے۔ ایڈیٹر کو کبوتروں کی طرح اخباروں کی خبر رسانی کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کبوتر تجو پیغام لے کر آڑتے تھے اسے من عن منزلِ مقصود تک پہنچا دیتے تھے لیکن اخباروں کو راتی کا پربت اور سوتی کا بھالا بنانے میں کمال کی مہارت حاصل تھی۔

اخباروں کی خواک گپ بھی۔ اور ایڈیٹر لوگ گلڑی پر گزارہ کرتے تھے۔ پھر لوگوں آیام جمالت میں کثرت سے کاشت کی جاتی تھیں لیکن جب سے ایٹھی شغاalon نے کرہ ارض کو منور کیا ہے، اخباروں اور ایڈیٹروں کے ساتھ ساتھ گپ اور گلڑی بھی ناپید ہو گئی ہے۔ بہت سی جستجو کے بعداب تک ہیں صرف دو ایڈیٹروں کے ڈھلنچے ملے ہیں۔ ان میں یہ خصوصیت ہے کہ اگر انھیں پاس پاس رکھا جاتے تو فوراً ایک دوسرے کی طرف پیٹھ موز لیتے ہیں۔ اور اگر انھیں ایک دوسرے سے دُور رکھا جاتے تو وہ آپس میں سر ہوڑ کر بیٹھنے کی گوشش فرماتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے یہ لوگ آپس میں ہنسنے والے تھے تو بھی آفاق راستے سے۔ اس لحاظ سے ان کا شمار بھی ترقی پسندوں میں ہونا چلا ہے۔ ادھیوں اور ایڈیٹروں میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔ جب ادھیوں کی صورت سخن ہونے لگتی تھی تو وہ ایڈیٹر بن بیٹھتے تھے اور جب ایڈیٹروں کے چہرے بگردتے

تھے تو وہ ادیب کہلاتے تھے۔

### سیاست دان:

پہلے یخیال تھا کہ سیاست دان شاید اگالدار کی قسم کا کوئی ظرف ہو گا۔ میکن اب یہ یخیال غلط ثابت ہو چکا ہے۔ دراصل وہ سارے بان، کوچان اور ہمیوان کے زمرہ میں شامل تھے۔ جس طرح سارے بان اور کوچان اونٹ، گھوڑے، گدھے یا خچر کی تکمیل تھا متنے تھے۔ اسی طرح سیاست دان عوام کی لگام اپنے ہاتھ میں رکھنے کی گوشش کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ہملاں کی طرح دنگل فرمانا بھی آپ کا شیوه تھا۔ گھوڑوں کی طرح سیاست دانوں کی دوڑ بھی ایک دلچسپ تماشہ ہوا کرتی تھی۔ یہ بات نہیں کہ خدا خواستہ سیاست دان خود دوڑ لگاتے تھے، بلکہ وہ تو بس عوام کو دوڑانے پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ ہاں ابتدہ دنگلوں میں وہ خود پر نفس نفیس اکھاروں میں اترنا کرتے تھے اور بڑے گھسان کارن پڑتا تھا۔ کبھی قوم سیاست دان کی گردان پر اور کبھی سیاست دان قوم کی گردان پر۔ دوڑ ایک قسم کا ہتھیار تھا، جو ایسے موقعوں پر استعمال کیا جاتا تھا۔ دوڑ کی ساخت غالباً اس بوٹ کی سی تھی جو اس زمانے میں پاؤں میں پہننا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی دنگلوں میں یہ دنوں کی یہاں چلتے تھے۔

سیاست دانوں کا ایک اور مشغله بیان بازی تھا۔ یہ اصل میں پنگ بازی، بیٹھ برازی کی قسم کا ایک من تھا، جس میں کبھی کبھی یاتوں ہی یاتوں اور کھیل ہی کھیل میں ہاتھا پانی نکل تو بت آجاتی تھی اور بڑے زور ون کی سرخچوں ہوا کرتی تھی۔ جس وقت سیاست دان دنگا فساد میں مصروف نہ ہوں تو وہ سر را ہے کیپڑا اور پچھڑیاں اچھال کر اپنا جھی بھلا کرتے تھے۔

سیاست دان فلک پر معاش سے آزاد ہوتے تھے۔ ہنی اسرائیل کے بعد یہی ایک قوم تھی جس پر آسمان سے من دسلوٹی نازل ہوتا تھا۔ اگرچہ اجھل نیسل ناپید ہے لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ اس قوم کے چند بزرگ کسی طرح فرار ہو کر یا جو ج کی بستی میں روپوش ہو گئے ہیں۔ دہان سپر انھوں نے ایک تازہ دستور اساسی مرتب کیا ہے جس کے مطابق وہ میدانِ حشر میں ایک جزءِ الکشن اڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

## اے بنی اسرائیل

تیسرا روز صبح سویرے ہی بیروت کا ساحل نظر انے لگا۔

عرب طالب علم دوڑ دوڑ کر سب سے اوپر والے عرشہ پر چڑھ گئے اور بڑی خوشحالی سے اپنے قومی ترانے کانے لگے۔ فرانسیسی نرسوں کو خاص طور پر یگیت پسند آئے۔ غالباً وہ مجھ سے بھی پاکستان کا قومی ترانہ منشی کی فرماں شہزادی تھی۔ لیکن میں ان کا ارادہ جانپ کر ادھر ادھر کھسک گیا۔ کیونکہ اپنے قومی ترانے کے الفاظ اگر مجھے باد تھے تو میں نبھانا میرے بس کی بات نہ تھی۔

جب چہار بندگاہ میں داخل ہوا تو سب سے پہلے جوچہ نظر آئی وہ لوگوں کا ہجوم تھا جو ساحل پر کھڑے کھڑے زور زور سے چیخ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں اور گردنوں کے خشکیں اشارے ان کی آواز کا ابر ساختہ دے رہے تھے۔ دور سے معلوم ہوتا تھا کہ بدوہ چور ہا ہے۔ نزدیک پہنچے تو گمان ہونے لگا کہ وہ لوگ جہان والوں کو غصے میں گالیاں دے رہے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد راز کھلا کہ یہ لوگ بندگاہ کے قلی ہیں۔ اور اُنے

والے مسافروں کو اپنی خدمات علیش کر دے ہے ہیں۔

ساحل پر جا بجا سرخ ٹوپیاں نظر آتی تھیں جن پر تسل کی چکنائی اور میل نمایاں تھی۔ کپڑے بھی تیلے کچیے اور پھٹے پڑانے تھے۔ شور و غل، ریل پیل، حکم و حکما عام تھی۔ اس دشت کو دیکھ کر بے ساختہ گھر کی یاد آتی تھی۔ پولیس کے سپاہی غیر معمولی طور پر موٹھے اور گرمی کی وجہ سے اپنی دردیوں سے بیزار۔ یہ سپاہی زیادہ تر ٹھیلوں یا کھبیوں کا سہارا سینے اونٹھ رہے تھے۔ جب بھی انکھ کھلی تو یوں ہی کہی کو دھنکا دے کر کسی کو ڈانت ڈپ کر کے اپنے منصبی فرالض سے عمدہ برآ جو رہے تھے۔

یہاں رہن کیستول اک پادریوں کی منزل تھی اور وہ اپنا سامان اتروا کر رہا اور خداوتہ فرانسیسی نرسوں سے رخصت ہو رہے تھے۔ پہلے انہوں نے نرسوں کے ہاتھا اپنے ہاتھوں میں لے کر دیرتاک انھیں سہلایا۔ پھر ٹری بے صبری سے چڑا فر چڑا خ الوداعی بوئے لیے..... اگر دسرے مسافروں اور ٹیلوں کی نگاہیں بُری طرح ان پر نہ جھی ہوتیں تو یہ بندگ نرسوں کو اپنے مقدس سینوں سے ضرور چھپا لیتے۔

پادریوں نے طوغا کر لاجھا زچھوڑا اور کشمہ ماؤس کے دروازے تک جلتے جاتے کئی بار فرانسیسی نرسوں کی طرف مژمر کر دیکھا۔ جواب اپنے ہمینڈ بیگ کھول کر اپنے رحصارہ کے پاؤڑا اور ہنٹوں کی پ اشک کواز سر فوتازہ کرنے میں مشغول ہو گئی تھیں۔ بوئے مقدس ہستیوں نے ہوں یا گنگاروں کے راعور توں کے پاؤڑا اور لپک اشک پر ان کا اثر ایک ساہی ہوتا ہے۔

یہاں جہماز کو چند گھنٹوں کے لیے رکنا تھا۔ مسافروں کو بہروت کا شہر دکھلنے کے لیے ایک نورستہ ایجنسی نے بہت سی ٹیکسیوں کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ جیسی شاندار ٹیکسیاں یہاں نظر آ رہی تھیں، ولیسی موڑ کاروں میں غالباً یورپ کے بڑے شہروں کو بھی کہیں ہی نصیب ہوتی ہوں گی۔ فورٹ شیور اور یوک کے ماطل عام تھے۔ کہیں کہیں کیٹھیں لکھ

کاریں بھی ملکیوں کے طور پر چلتی نظر آتی تھیں۔ امریکہ کے بڑے بڑے شہروں کے بعد غائب  
بیروت ہی ایسا شہر ہے جس کی سڑکوں پر سیک وقت اس قدر نتی امریکی گاڑیاں چلتی ہیں۔

یوں بھی بیرودت کے چہرے نہ رے پر کتنی قسم کا بین الاقوامی رنگ و رونگ چڑھا گوا  
ہے۔ زبان اور آداب میں یہ شہر فرانسیسی ہے۔ موڑوں کے ماذل، بوش روں کے ٹوپیاں  
اور لیونیورسٹیوں کی ڈگریوں کے لحاظ سے امریکن ہے۔ ہولیووڈ کے کاروبار اور پوپ فنا  
پہاڑی مقالات کی نسبت نہ صرف بیرودت بلکہ سارا لبنان مشرق دستی کا سو شر رہیند  
ہے اور جیسا کہ میرے ایک لبنانی دوست مصطفیٰ الفخری نے مجھے ہالینڈ میں بتایا تھا  
بیرودت کی نشاطگاہوں اور ناسٹ کلبیوں کو پیرس کی ہسری کا بجا طور پر دعویٰ ہے چنانچہ  
بہت سے عرب شہزادے جو اپنے ملک یا اپنے محلات میں شراب پینے سے معدود  
ہیں۔ اپنے پرائیویٹ جہازوں میں جو حق درحقیق یہاں آتے ہیں اور راتوں رات دادیش  
وے کر صحیح سویرے پسے فالف منصبی پر واپس حاضر ہو جاتے ہیں۔ میری ملکی کے  
ڈرائیور نے بڑے فخر کے سانحہ مجھے وہ ہولی بھی دکھایا جس پر صرکے سابق شاہ فاروق  
کی محظوظ رفاقتہ سمیعہ جمال پھری ہوئی تھی۔ ہولی کے دروازے پر سمیعہ جمال کی بڑی تفتخر  
آؤیزاں تھی۔ تصویریں اس کے گھنے بال گھنگھوڑ گھٹاکی طرح نظر آتے تھے۔ اور وہ اپنی بڑی  
بڑی غزالی آنکھوں سے باہر چوک کی طرف دیکھ کر مسکارہ ہی تھی۔ جمال ایک پوسیں کا نشیبل  
بڑی مستعدی سے ٹرینیک کنٹرول کرنے میں مصروف تھا۔ ملکی ڈرائیور نے مجھے بڑے جذبے  
سے مطلع کیا کہ اس چوک میں ہر تیس منٹ کے بعد ایک حارثہ ہوتا ہے۔ غالباً یہ بھی  
حادثے والا تیسوائیں منٹ تھا۔ کیونکہ اچانک ہماری ملکی نے پہلے ایک راہ گیر اور  
پھر بہ نفس نفس خود چوک والے کا نشیبل کو اپنی زردیں لینے کی سر توڑ کو شش کی۔ بے چارہ  
راہ گیر تو کپڑے جھاڑک راٹھ کھڑا چھوڑا۔ لیکن ٹرینیک کا نشیبل نے نیٹی، سچا جا کر ہمارا تعاقب کرنے  
کی خودڑی بہت کو شش ضرور کی۔ لیکن ملکی ڈرائیور نے ایکسی لیٹر و بکر رفتار اور بھی تیز

کر دی اور ہم خطرناک پہاڑی موڑوں کو کسی خاص بھروسے کی مدد سے طے کرتے ہوتے تھے ٹرینیک کا نشیبل اور سید جمال دونوں کی زد سے باہر نکل آتے۔ لیکن ڈرائیور نے مغدرت کرتے ہوئے مجھے تھیں دلایا کہ اس چوک میں ایسے حادثات کوئی خلافِ عمول چیز نہیں ہیں سید جمال کی آنکھوں میں ایسا جادو ہے کہ راہ گیر ڈرائیور اور ٹرینیک کا نشیبل سب بیک وقت اسی کی طرف دیکھنا پاہتے ہیں۔ ان حالات میں اگر ٹرینیک میں تصادم کے واقعات رومنانہ ہوں تو یہ انسان کی بڑی کورڈو قی ہو گی۔

بیروت کی شرکوں پر حادثات کا ہونا کچھ سید جمال کی سحر کار آنکھوں ہی پر موقوف نہیں ہے۔ بلکہ ہم جہاں کہیں بھی جاتے تھے مجھے یہی احساس ہوتا ہوا کہ ہم مسلسل جاؤ کی زدیں متعلق ہیں۔ محلی شرکوں اور گنجان گلیوں میں لیکن ایک ہی رفتار سے جاگتی جاہتی تھی اور اس کی سپیلی پیٹیس میں فی گھنٹہ کی رفتار سے شاید ہی شیخے گرتی تھی۔ کوٹ پتوں والے راہ گیروں کے درمیان تو لیکسی بڑے اٹیباں سے ہاراں بھائی ہوئے گز جاتی۔ لیکن عباوں والوں کے درمیان ڈرائیور متذہب ہو جاتا۔ ڈرائیور نے وضاحت کی، بولا:

”دو پتوں والے اہ گیر کی ٹانگیں دُور سے واضح طور پر نظر آ جاتی ہیں اور پتہ چل جاتا ہے کہ وہ کہھر سے کہھر کو جا رہا ہے۔ اس کے بر عکس عبا کے نیچے دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ راہ گیر اگے کی طرف جا رہا ہے یا تیچھے کی طرف؟“ مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ مغربی لباس کا یہ افادی سپلواب تک میری نظر سے پوشیدہ تھا۔

امریکن یونیورسٹی کے قریب ایک فیشن ایبل ریستوران کے سامنے لیکسی روک کر ڈرائیور نے مجھے ہدایت کی کہ کوئی خوش مناق سیاح اس ریستوران میں بیٹر کا گلاس یا چائے کی پیالی نوش کیکے بغیر بیروت سے واپس نہیں جاتا۔ اپنی سیاحت اور خوش مزا جی کیلن رکھنے کے لیے میں نے بھی اندر جا کر چاہتے کا آرڈر دیا۔

ریستوران میں زیادہ تر دو گھنی ملکی تھے اور غالباً وہ سب سیاح تھتے اور انہی ملکی سیوں کے  
ڈلائیوروں کی بڑیات کے مطالبہ انہی خوش مزاجی کی داد دینے آتے تھے۔  
ایک نوجوان بیرے نے مجھے چاٹے لا کر دی۔ اس کی مونچیں باریک اور تکھی تھیں۔  
سفید دردی میں ملبوس وہ کسی جاسوسی ناول کا ہیر و گھانی دیتا تھا، جو بعد میں بدل کر کسی  
گھر سے راز کی تلاش میں ہوٹلوں کی ملازمت کر رہا ہو۔ چاٹے کا ٹرے میز پر رکھ کر وہ میرے  
پاس مذوب کھٹا ہو گیا۔ اور فرنچ نا انگریزی میں بولا: ”آپ کون میں؟“  
”میں پاکستانی ہوں؟“

”مرحباً مرحباً! اُس نے اپنے ہاتھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”اوہ آپ؟“ میں اخلاقاً پوچھا۔

”الحمد للہ میں مسلمان ہوں؟“

بیرے کے اس بے ساختہ جواب نے مجھے چونکا دیا۔ عربوں کے متعلق مشہور ہے  
کہ وہ سب سے پہلے عرب ہوتے ہیں۔ پھر شامی یا بنانی یا عراقی یا مصری ہوتے ہیں اور  
اس کے بعد مسلمان۔ لیکن تسلیمی مونچیوں والالیہ نوجوان بیرانہ صرف سب سے پہلے مسلمان  
سماتا بلکہ وہ اپنے مسلمان ہونے پر بغیر کسی جواب کے خدا کا شکر بھی ادا کر رہا تھا۔  
”مجھے بھی مسلمان ہونے کا فخر حاصل ہے۔“ میں نے کہا۔

”الحمد للہ، الحمد للہ!“ بیرے نے پھر خوشی سے اپنے ہاتھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے  
کہا: ”آپ نے اخوان المسلمين کا نام بتاہے کیا؟؟“

”اخنان کو کون نہیں جانتا؟“ میں نے جواب دیا۔

”میں بھی اس تحریک کا ایک ادنیٰ ساخا دم ہوں۔“ بیرے نے فرز سے کہا: ”بہم زاری  
ذیبا کے سلفاؤں کے بھائی اور خدمت گاریں۔“

”کیا آپ پاکستان کی فارلن سروس میں میں؟“ بیرے نے اچانک پوچھا۔

”بھی نہیں“، میں نے کہا۔ آپ کو بخوبی کیوں آیا؟“

”مشرق و سطحی میں جو سیاح آتے ہیں وہ اکثر سفارت خانوں کے افسروں کے ہوتے ہیں۔“  
وہ گروں کے پادری ہوتے ہیں، یا ان کا تعلق تیل کے چشمتوں سے ہوتا ہے۔ ”بیرے کے چہرے پر غیر معمولی سمجھیدگی“ لگتی۔ سفارت خانوں سے وہ ہماری حکومتوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ گروں کے فدیعے وہ ہمارے دین میں داخل دیتے ہیں اور تیل کے چشمتوں سے وہ ہمارے پست کنٹرول کرتے ہیں۔ پھر اس نے نکیسوں سے ادھراً دھر دیکھا اور گرد اچھلا کر رکھو شی میں کہنے لگا۔ ”دہم اخوان ایسے سیاحوں پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں“  
باتوں ہی باتوں میں بیرے نے مجھے بتایا کہ اس ریستوران کا مالک ایک فلسطینی عیسائی ہے اور یہاں کام کرنے والا ہر بیرے اسے پاسخ سے چھپا ڈکھتا ہے۔ ہر یہ گفتہ تخلواہ دیتا ہے۔

”بیرے ریستوران کے مالک کو تخلواہ دیتا ہے؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”یہ تو ایک بیٹی بات ہوئی۔“

”یہاں یہ بات بالکل سیدھی ہے“، بیرے نے سمجھیدگی سے جواب دیا۔ ”ہمارا گزرہ محض گاہکوں کی بخشش پر ہے۔ امریکن سیاح بہت زیادہ ہیں۔ وہ ہمیں اچھا ٹپ دیتے ہیں۔ اور ہمیں اپنی آمد کا دسوال حصہ ریستوران کے مالک کی نذر کرنا پڑتا ہے۔“

چلتے ختم کر کے میں نے بل طلب کیا۔

”آپ بیرے نہان ہیں۔ آپ کابل میں خود ادا کر دیں گا“، بیرے نے بڑے خلوص سے کہا۔

میرا دل چاہتا تھا کہ بیرے سے کہوں کہ بل نہیں تو مجھ سے کم از کم پہلی قبائل کے تاکہ ریستوران کے مالک کی تخلواہ میں کمی واقع نہ ہو۔ لیکن بیرے کی ممتازت

اد غاص کے سامنے مجھے کچھ کہنے کی جرأت نہ ہو سکی۔  
وہ مجھے باہمیکی تک چھوڑ لئے آیا۔

جب ٹیکسی روانہ ہوئی تو مجھے یون محسوس ہوتے لگا کہ میں راستوران کے ایک بیرے سے نہیں، بلکہ دنیا کے ایک بہت بڑے مفلک سے مل کر آ رہا ہوں۔ اس نوجوان پرے میں ایک اچھے صلغ کی صداقت اور ایک سچے مومن کی فراست کوٹ کوٹ کر جی ہوئی تھی۔ ایسے سادہ اور پرکشش کردار میں نے بہت کم دیکھتے تھے۔

بیروت کے مضافات میں جلاجلا چھوٹے چھوٹے جھوپڑوں کی آبادیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ انہیں فلسطین کے عرب ہماجر رہتے تھے۔ ہماجر کو اپنی میں ہوں یا پروردت میں۔ ان کے جھوپڑوں پر دہی کثافت اور چہروں پر دہی فلاکت برستی ہے۔ جس طرح کو اپنی میں، یہاں ہماجر بستیوں کے درمیان بڑی سرعت سے سیمٹ کی جری بڑی عاختیں بلند ہو رہی ہیں۔ بالکل اسی طرح بیروت میں بھی فلسطینی مہاجرود کے ارد گرد بلند و بالا خوبصورت مکان تعمیر ہو رہے تھے اور چند اسریخ سیاح جوان جھوپڑوں اور مکانوں کی تصویریں انداز ہے تھے، بڑی گرجوشی کے ساتھ جوڑوں کی سیاست پر بھی رائے زنی فرمائی ہے تھے۔

”خداؤ کی قسم“، ایک سیاح کہہ رہا تھا۔ ”بس وہ بھی ان جھوپڑے والوں نے امظک کر ان خوبصورت عمارتوں کو جلانا شروع کر دیا، تب سے مشرق و سلطی میں کیونز م کاغذبہ ہو جلتے گا۔“

”ہبائی جواں تم میرے پال تو قلچوٹ کے بچوں سے بھی نیزادہ کوتاہ انڈیش ہو۔“ دوسرے سیاح نے اپنے ساتھی کو پیار سے گالی دی۔ ”کیونز م اگ لگنے کا انتظار نہیں کرتا کیونز م کا راستہ تو اسی روز ہمارہ ہو گیا تھا جب ان غلبیظ جھوپڑوں کے درمیان ان معقول عمارتوں کی بنیا درکھی گئی تھی۔“

”تم دو فوٹ گتیا کے بچے ہو۔“ تیسرے امریکن نے فیصلہ صادر کیا۔ جب تک یہاں  
اسلام کا جذبہ غالب رہے گا۔ کیونکہ زم کے آنے یا ان کے کا سوال ہی نہیں اُھتنا۔  
اسلام کا یہ کار آئندہ بہ کمی زنگ سے غالب اٹا ہے۔ — زمیہ کے پاس ہر سکریٹ  
لائسنس ہاں پر فرنی خود میں کلمہ طبیہ لکھا ہوا تھا۔ بیرد، بغداد، دمشق اور قاہرہ میں  
ایسے سکریٹ لائسنس جا بجا فروخت ہوتے ہیں۔ سفری ایجنسیاں اپنے ہدایت ناموں میں  
متینہ کرتی ہیں کہ مشرقی ممالک میں کبھی سبز پاں سلااد اور شاٹر نہ کھائیے۔ کیونکہ ان میں مالک  
جزاً ہم ہوتے ہیں۔ اور کامیاب ایسفید زنگ کے چلتے پھر تے خیموں میں زجاجا نیکے، کیونکہ ان  
میں عورتیں ہوتی ہیں۔ جب تک مشرقی حورت خود انکھ نہ لڑاتے اس سے انکھ نہ لٹائے۔  
کیونکہ اس سے ان کا مذہب بگرم جاتا ہے۔

بند رنگ کے قریب ایک کھلا میدان مٹاٹ اور مٹیں اور چٹائیوں کے چھوٹے چھوٹے  
چھوپڑوں سے لکھا کچھ بھرا ہوا تھا۔ میدان کے چاروں طرف لوہے کے خاردار تار کھینچنے  
ہوئے تھے اور پولیس کے کچھ سپاہی پھر سے پر امور تھے۔ میدان میں سینکڑوں مردا اور  
عورتیں بھیڑ بکریوں کی طرح مخصوص تھیں اور فضائیں دُوز تک بول و برلز کی عقدت پھیل  
ہوئی تھی تمازت افتاب میں یہ سارا میدان انگیٹھی کی طرح دکھ رہا تھا۔ کچھ ضعیف  
عورتیں چاہیکے چادر کو پانی میں ترکر کے بار بار اپنے چہروں پر مل رہی تھیں۔

ٹیکسی ڈرائیور نے بتایا کہ یہ لوگ فلسطینیں کے مهاجر نہیں ہیں بلکہ یہ میدان حاجیوں  
کا کیمپ ہے جو حکومت نے خدا اپنے خرچ سے قائم کر رکھا ہے۔ کبھی کتنی مہینوں  
تاک دور دراز سے لوگ ایک لگاس کیمپ میں جمع ہوتے رہتے ہیں۔ جو خوش نصیب  
میں انھیں ہوا۔ یا سمندری جہاز میں جگہ مل جاتی ہے۔ باقی لوگ انتظار کر کے والپس  
چلے جاتے ہیں۔

ٹیکسی ڈرائیور کے انداز سے کے مطابق (جو اقا عده اعداد و شمار پر منی تھا)

کیمپ میں ایسے لوگ بھی تھے جو دو دو تین تین پارچا سال سے بند رگاہ پر انتشار کرنے کے بعد بے نیل مرام والیں جا رہے تھے۔ اگر علاستے کرام کراچی یا بریوت یا قاہروہ سے بھی والیں نوٹ جائے تو اسے ایک صحیح کاتھواب مل سکتا ہے۔

حاجی کیمپ کے ایک گوشے میں نمازِ عصر کی جماعت ہو رہی تھی۔ باقی دنیا سے اسلام کی طرح اس کیمپ میں بھی حاجی زیادہ تھے اور نمازی کم۔ ایک بوڑھی عورت بڑے خفنود خشونت سے مزید ہو رہی تھی۔ اس کی چادر میلی تھی اور کوئی کا دامن پھٹا ہوا تھا۔ یوں اس سارے ماحول پر ایک ایسی المناک غربت اور صعوبت جھانی ہوئی تھی۔ یہاں پرانا ائمۃ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کے سوا اور کیا عرض کر سکتا ہے۔

تبے شک ہم تھیں کچھ خوف اور بھوک سے اور مال و جان اور چلوں کی کمی سے ضروراً نہ گے صبر کرنے والیں پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم خدا ہی کے ہیں اور اسی کی طرف نوٹ جانے والے ہیں۔ ایسے لوگوں کو خوشخبری دے دو کہ ان پر ان کے پردہ گار کی طرف سے رحمتیں اور عنایتیں ہیں اور یہی لوگ تمت والے ہیں۔ بیرودت کاشمار بھی دنیا کے ان مذب شہروں میں ہوتا ہے جہاں غریب ہونا تو کوئی جرم نہیں۔ البتہ بھیک مانگنا ضرور منع ہے۔ بند رگاہ کے باہر پولیس کا ایک سپاہی سید کی چھڑی گھاٹکا کہ بہت سے گدگروں کو منتشر کر رہا تھا جو آتے جاتے سیاہ پر بھوکی چیلوں کی طرح جیستے تھے فلسطینی مهاجروں کا ایک خاندان سپاہی کی نظر پچاکر ایک کونے میں سما کھڑا تھا۔ ظاہراً وہ دست سوال دراز نہیں کر رہے تھے مگر ان کے پھرے اپنی زبان بے زبان سے پکار پکار کر اپنی بھوک اور اپنی بے بسی ہی کی فریاد کر رہے تھے۔

اس خاندان میں ایک چھیسا سات سال کا لڑکا تھا۔ ایک نوسال کی لڑکی تھی۔ ان کی ماں ایک ادھوری بہار کی طرح، جسے وقت سے پہلے ہی خزان نے اُن کی دال

ہو۔ دکھنی اپنے بچوں کی طرف دیکھتی کہ جی را گیر دل کی طرف، اور کبھی اس سپاہی کی طرف بھوپی کی چھڑی گھاٹکار بھیک منگوں کو بھاگ رہا تھا۔ مجھے رُکتے ہوئے دیکھ کر وہ لاکامیری طرف بڑھا اور بڑی لجاجت سے پوچھنے لگا۔ کیا آپ ہماری تصویر کی پیغماں چاہتے ہیں؟

جس طرح کراچی کے فقیر دیاسلامی یا بوث پاش کا سہارا لے کر جمیک مانگتے ہیں۔ اسی طرح فلسطین کے مہاجر تصویریں کھینچو اکر خشش کی فریاد کرتے ہیں۔ ان کے خوبصورت خدوخال تیکھے تیکھے نقش اور ادا سائنسیں سیاحوں کے لیے بڑی جاذب نظر جوتی ہیں اور وہ ان کے فرلوٹا تار کفر اخمل سے خشش دیتے ہیں اور اس طرح اہل فلسطین پر اپنی ہمدردی، منصف مزاوج اور غیر جانبداری کی مرثیت کر دیتے ہیں۔ تصویریکی فناش سن کر میرا جی چاہا کرنچے کو اٹھا کر گلے سے دکاؤں اور کہوں میرے مقصوم فرشتے ابھی خدا نے وہ مصادر بیدا ہی نہیں کیا جوتیری تصویر کا حق ادا کر سکے تیرے کپڑے پھٹے چوتے ہیں۔ اس جعلستی مخصوص میں تیرے پاؤں ننگے ہیں اور تیری سوہنی ہڑوں مانگھوں میں انسوؤں کی نبی بھی خشک ہو چکی ہے۔ وہ تیری ماں ہے جسے ندرت نے شباب کی منزل سے پہنچے ہی بوسا کر دیا ہے۔ اس کے بھنچے ہوئے ہونٹوں پر فریاد لرز رہی ہے۔ لیکن سپاہی کے ڈرسے وہ اپنا ستمہ نہیں کھول سکی۔ یا شاید اس کے سوکھے ہونٹوں پر ایک غصب ناک بدمعاڑ پر رہی ہے جو اس نے اس کے ڈر کے مارے روک رکھی ہے کہ کہیں اس کی بدمعاست دنیا کا بھی وہی حشر نہ ہو جو عاد اور نمرود اور نوح کی قوموں کا ہوا تھا۔ اور وہ تیری گربا سی بہن جس نے ایک ہاتھ سے ماں کا دام سختا ہوا ہے اور دوسرا ہاتھ سے تھیں والپس بلارہی ہے تاکہ کوئی راگیر تھیں زبردستی اُٹھا کر نہ لے جاتے۔ اس نئی مٹی کے پاؤں بھی ننگے ہیں۔ اس کے کپڑوں میں بھی سوراخ ہیں۔ اس کے سمندری بال ریشم کے اُنجھے ہوئے گچھوں کی طرح پریشان اور گھنگریاں

ہیں۔ ان خوبصورت بالوں میں ریت کے ذریعے اور کم طرح چکا رہے ہیں۔ اس کی پلکیں  
گھنی اور نوک دار ہیں۔ — اُداس آنکھوں میں نیلی سلی جھیلوں کی بے پناہ گمراہیاں  
خوابیدہ ہیں۔ — اگر نیچی آسمان پر پیدا ہوتی تھے۔ اور ہنی آدم اور ہنی اسرائیل  
کے ہاتھوں میں خدا کا یہ شاہر کار بھوک سے ..... مرحبا یا ہوا ہے بخوبی  
سے سما ہوا ہے، بے گھر ہے، بے سہارا اور بے حد اوس ہے .....  
اس نیچی کی بندنیوں کے تسلی کی طرح تازہ اور شفاف ہے۔ اس کی گھوٹوں میں جو  
خون گردش کر رہا ہے۔ اس میں ڈھانی ہزار سال سے فلسطین کے چشموں کا پانی اور  
فلسطین کے چھپوں کی نگہت اور فلسطین کے انگریزوں کا رس رچا ہوا ہے۔ اس لڑکی کے  
وجود میں یہ وہ سُم کی آن گنت صدیوں کے تقدس کی امانت پوشیدہ ہے۔ اس کی پروشن  
بڑے بڑے برگزیدہ پیغمبر دن کے زیر پایہ ہوتی ہے۔ اس کی تربیت بھی آسمانی صحیفوں  
کے ہاتھ ہے جو خدا نے اس ارض مقدس پر نازل فرمائے۔ اس لڑکی کے آبا اور اجداد ڈھانی  
ہزار سال سے فلسطین کی خاک میں دفن ہو رہے ہیں۔ لیکن آج یہ لڑکی روٹی کے ایک ٹھکٹے  
کے لیے ننگے پاؤں اور ننگے سر بریدت کی گلیوں میں پریشان حال ٹھوکریں کھا رہی ہے۔  
کیوں نہ ہنی اسرائیل کی بھٹکی ہوئی بھیڑوں کو اچانک وہ گھر پا دانے لگا ہے جہاں سے دواڑھا۔  
ہزار سال قبل خدا نے انھیں نکال باہر کیا تھا۔ یہودیوں کا سب سے نیا صحیفہ  
BAILEY'S LITERATURE 1914 ہے جو ڈنوبیر نے کوہ طانیہ کی وزارت خارجہ کی  
طرف سے نازل ہوا تھا اور جس میں بشارت دی گئی تھی کہ شاہ انگلستان کی حکومت فلسطین  
میں یہودیوں کے لیے ایک قومی گھر دیتا کرنے کے حق میں ہے اور اس سلسلے میں یہودیوں  
کی ہر ممکن مدد کرے گی۔

جس عقیدت مندی سے یہودی اس انسانی بشارت کی پیروی کر رہے ہیں۔ الگ اسی جذہ  
سے انھوں نے اپنی الہامی کتاب توریت کو اپنایا ہوتا تو شاید ہنی اسرائیل کو ان گنت صدیوں

تک در بدر کی خاک نہ پھانسی پڑتی۔

اسے بنی اسرائیل وہ دن یاد کر جب خدا نے تمہیں سائے ہمان کے لوگوں سے بڑھایا تھا۔ جب خدا نے تمہیں قوم فرعون کے بخوبی سے چھڑایا تھا جو تمہیں پڑے ڈکھ دیتے تھے۔ تمہارے پھول پر تو چھکری پھیرتے تھے لیکن تمہاری عمر توں کو پانی خدمت کے لیے زندہ رہنے دیتے تھے۔ جب خدا نے تمہارے لیے دریا کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور تم کو چاکر فرعون کے آدمیوں کو تمہارے دیکھتے دیکھتے ڈبو دیا۔ جب خدا نے تم پر ابر کا سایہ کیا اور تم پر من و سلوٹی اتارا۔ جب موسیٰ نے اپنی لاٹھی پھفر پر ماری اور اس میں سے تمہارے لیے پانی کے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔

اسے بنی اسرائیل وہ دن بھی یاد کر جب خدا نے تم سے عمد بیان خاکہ تم سخن کے ساتھ باطل کونہ ملاوگے اور خدا کی آیات کو سختے داموں نہ پھوگے۔ لیکن تم نے یہ وعدہ ایقان نہ کیا اور تم نے بڑی ہٹ دھرمی سے چھڑے کو اپنا خدا بنایا۔ تم نے من مسلمی کی نعمت سے اکتا کر ساگ پات اور کٹومی اور اس ان اور سور و پیار کی فرماںش کی۔ اپنی اکٹیں آگر تم نے بعض پیغمبروں کو چھڑایا اور بعض کو جان سے مار ڈالا اور خدا نے تمہاری نافرایاں کی پا داش میں کبھی تم کو خود اپنے ہاتھوں سے قتل کا حکم دیا۔ کبھی تمہیں آسمانی بھلی سے اپنی پیٹ میں لے لیا کبھی تم راندہ درگاہ ہو کر بند بنادیے گئے۔ کبھی تمہارے سر پر طور کا پہاڑ لٹکا دیا گیا۔ . . . . .

اسے بنی اسرائیل بے شک تمہارے دل پھر ہو چکے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت کیونکہ پھر وہ میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان سے نہیں جاری ہو جاتی ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں دراٹیں پڑ جاتی ہیں اور پانی رنسنے لگتے ہے۔

اسے بنی اسرائیل آج تمہاری نسل بھی اسی طرح مسخ ہو چکی ہے جس طرح کہ تم نے خدا کے کلام توریت کی شکل بدل دی تھی۔

تمہاری رگوں میں جلوگردش کر رہا ہے اس میں اسرائیل خون کی آمیزش بہت ہی کم ہے۔ ہزاروں سال سے تم دنیا کے گوشے گوشے میں مارے مارے پھر رہے ہو اور تمہاری نسل دوسری قوموں میں خلط مکھ طور کا اساب اپنی امتیازی حیثیت نہیں رکھتی۔ یوں بھی تم نے خدا کے رسولوں کی جگاب امریکہ اور انگلستان میں اپنی مرضی کے پیغمبر تلاش کر رکھے ہیں اور تمہاری موجودہ توریت QUR'AN & TAFSIR NABI HUSSAIN ہے، لیکن یاد رکھو اس عرب پنجی کا سہاول اور اس کی غفرانہ ماں کی دبی ہوتی آہ تمہارے سر پر کوہ طوڑ سے بھی زیادہ خطرناک پہاڑ کی طرح لٹک رہی ہے۔ اس معصوم پنجتے کی بے نس نکاہوں تک غصب ناک اور قرنک مجلیاں تڑپ رہیں ہیں۔ اگرچہ آج کل بند رکھانے کا رواج عام نہیں ہے۔ لیکن اگر خدا اپنی بات کا سچا ہے تو تم امکیہ اور انگلستان میں ڈھلنے ہوتے سوئے اور چاندی کے کچھ طوں کی جس قدر چاہے پوچھا کرو۔ لیکن عذاب کا جو چکر تمہارے پاؤں میں پڑا ہوا ہے۔ اور اس سے تھیں نجات نہیں بل سکتی۔

## ایک پنکھر

سوسرا م کا شہر کتی لحاظ سے تاریخی چیزیں رکھتا ہے۔ ایک تو یہاں شیرشاہ سوری کا مقبرہ ہے۔ دوسرے یہاں آغا جانی کا بازار ہے اور تیسرا اسی شہر پر ایک بار رانوی موترا کار کے دو طاڑے پنکھر ہو گئے تھے۔

جس طرح شیرشاہ سوری کی عظمت آغا جانی کے بازار کے پس منظر کے بغیر اُدھوری رہ جاتی ہے۔ اسی طرح رانوی کار کے بغیر سوسرا م کا شہر بھی اپنی تاریخی اہمیت کھو بیٹھا ہے۔ آغا جانی کے بازار کا قصہ یوں ہے۔ کسی زمانے میں اس مقام پر ایک قصبه آباد تھا۔ یہاں کے سردار کا لقب آغا تھا۔ اس کی ایک بیٹی تھی، جسے لوگ جانی کہتے تھے۔ غالباً جانی اس کا نام نہ تھا بلکہ اس لفظ کی ولفریب شارن مجموعیت سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ بے حد خوبصورت اور حسین و جمیل طرکی تھی جس پر بہت سے لوگ دل و جان سے فریفتہ تھے۔ ان میں سے ایک، فرید خاں بھی تھا۔

فرید خاں خواب دیکھنے کا شوقیں تھا۔ خوبصورت خواب، بھیانک خواب

جنگ و جدال کے خواب، ہندوستان کی بادشاہت کے خواب۔ جانی کے خواب، جانی کی آنکھوں، جانی کے بالوں کے، جانی کی سکراہٹوں کے دلخیر پسندے۔ اور جب اس کے خوابوں کی تعبیر ملکی۔ اور شیر شاہ نے ہندوستان کی بادشاہت کا تاج پہنا تو ایک تیز رفتار قاصدیہ پیغام لا یا کہ ”جانی! امیر انتظار کرنا۔“ یعنی بہت جلد اپنی ملکہ عالم کے حضور میں آرہا ہوں یہ شیر شاہ بادشاہت کرتا رہا۔ اور جانی انتظار۔ انجام کار، شیر شاہ پر ایک سنگلائخ تاریخی مقبرہ تعمیر ہو گیا۔ اور جانی کے نام پر جانی بازار کی بنیاد پڑ گئی۔ جہاں ہر روز اس شہید و فدا کی یاد میں بیسیوں جانیاں بن سنور کر، سولہ سنگار کر کے سوسو کینٹل پادر کے بر قی مقبروں کے عین نیچے کریاں جا کر۔ ..... خیر یہ تو ایک دوسری کہانی ہے۔ یہاں پر قصہ تو رانو کی موڑگار کا تھا۔ چھے پنچھی ہونا تھا تو سہ سارہ میں۔ اب اگر وہ شیر شاہ کے مقبرے یا جانی کے بازار کی طرف جانکلتی تو اُسے کون روک سکتا تھا؟ اگر وہ شیر شاہ کے مزار پر چل جاتی تو شاید وہاں پر سوئی ہوئی خاک کی چکلی میں ایک لمحہ کے لیے آگ سی بھرکل اٹھتی۔ اور اگر وہ جانی کے بازار کی طرف جانکلتی تو..... خیر یہ بھی حسن اتفاق تھا کہ وہ شیر شاہ کے مقبرے یا جانی کے بازار کی طرف جانے کی بجائے کچھ بیوں کی طرف چلی آئی۔

اس وقت عدالت کے سامنے چوری کا کوئی معمولی سامقدمہ زیر ساعت تھا پہلے  
کیسری نامہ شربراڑ سے جوش و خروش سے ایک گواہ پر جرح فزار ہے تھے۔ وہ مقامی عدالت  
کے سب سے زیادہ سر اور دہ، اخراج اور کہنہ مشق و کیل تھے۔ جب وہ گواہ سے کوئی  
مفید مطلب بات کھلا لیتے تھے تو بصد ادب و احترام، بھاک کر چرب زبانی سے فرماتے  
تھے کہ ”عالی جناب عدالت اس فقرے کو نوٹ کر لے“ یا لیکن ان کی ایک بھی اتنکھوں جو  
مدعی، عدعاً علیہ، گواہ اور مجسٹریٹ کو ایک ہی ترپھے زادی سے دیکھنے کی عادی تھی، پکار  
پکار کر کہتی تھی کہ اسے ادمجسٹریٹ کے نہ تھے، اس فقرے کو یاد رکھنا! گواہ کی جرح پورے  
طور پر ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ عدالت نے اچانک مقدار سے کی ساعت اگلی پیشی تک ملتوی

کردی۔ پنڈت کیسری نا تھہ شرمنے لائکھ کہا کہ ”حضر راجھی صفائی کے دو گواہ اور بھی موجود ہیں۔ جناب عالی! وہ بڑی مشکل سے کلکتہ سے بلاستے گئے ہیں۔ سرکار والا وہ آج رات کی کھاڑی سے واپس جانے پر مصروف ہیں... ...“ ان کی بھینگی لائکھنے بھی اپنی مخصوص زبان میں بہت سے الٹے سیدھے دار کیے۔ لیکن عدالت کا فیصلہ اٹھ چکا۔ ابھی ابھی عدالت نے ملاحظہ فرمایا تھا کہ آج اس کی سرزین پر سرخ ساشیے کے سینٹلوں والے دخول صورت اور نازک پاؤں یوں محظوظ ہے جیسے کسی ستار پر دو خلائق مخصوص ہمہ میں درباری کا الپ بجا رہی ہوں۔ کچھری کے احاطے میں اچانک ایک مدھوش سی شیمیں بھی تھی۔ اور سفید جا رجھ پر بڑے بڑے گلابی بچنوں والی ایک سارٹھی نے ساری فضائے گلنا کر دیا تھا۔ چاروں طرف ایک تاثما ساچا گیا جیسے کمشن صاحب بہادر اچانک کسی ہنگامی معلمتنے پر نودار ہو گئے ہوں! عدالت کو ایک حسین مقدمے کے تحیل نے رشاد کر دیا تھا۔ عبدالوہاب پیش کار کچھ حصے کے لیے پان کی پیک نگذا بچنوں گیا اور اس کے چند قطرے سامنے پڑی ہوئی تعزیزیات ہندی جلد پر میک گئے۔ جو اس نے نظر پہاڑ کرنے کے دامن سے پوچھ ڈالے۔ پنڈت کیسری نا تھہ شرمنے بھی اپنی لائکھ کا زادی بدلا اور اس دھڑکتی ہوئی خاموشی میں ساری دنیا نے ناکر ایک مویقار اواز کسی اردوی سے پوچھ رہی تھی۔ ”لکیا یہاں کسی کے پاس موڑ کا رہے؟“

یوں تو ہمسام کے مقدمہ یا زدنی۔ وکیلوں، مجھٹیوں، ہلکروں اور چپریوں کو اکثر یہ خیال آیا ہو گا کہ دنیا میں موڑ کار بھی ایک نعمت ہے۔ لیکن اس وقت انھیں یہ احساس نہیاں تھا۔ اس جنس نایاب کے فقدان نے کچھری کے احاطے میں حیران ناقابل تلاشی گناہ ہے۔ اس جنس نایاب کے فقدان نے کچھری کے احاطے میں حیران اور لشیمانی کا محل ساپیدا کر دیا اور ہر شخص اپنی ابھی جگہ ایک زبردست احساس بے ماہیگی سے آب آب ہونے لگا۔ ہلکے، عجیب جینگلی شہر ہے یہ۔ اسے بھی اگر

مودودیں تو پہنچ گئے کامان تو جو گاہی کے پاس ٹھاٹ رہتی تھی، جیک اور سلیمان وغیرہ  
وغیرہ، رانوبات تو اردنی سے کر رہی تھی۔ لیکن ہر شخص محسوس کر رہا تھا کہ وہ خاص اسی سے  
محاط ہے۔ اور ان کے لیشان چہرے زبان حال سے یہ فریاد کر رہے تھے کہ میری بیان!  
یہ ایک موڑ رہی ہمارے بیس کاروگ نہیں۔ درست تم کو تو ہم آسمان سے تارے نوجی لاں۔  
چاند تار کر تھارے پاؤں پر کھو دیں۔ کامل گھٹاون کو تھارے گیسوؤں سے لڑا دیں۔  
شیر شاہ سوری کا مقبرہ تھاری ٹھوکر میں لانچھائیں، جانی کا بازار تھارے آگے یچھے  
بسا دیں۔ لیکن اسے جان! یہ موڑ کا کا جوتا ہمارے منڈ پرندہ مارو۔ ہم رو سیاہ.....  
رانو جلدی میں تھی۔ اس لیے وہ اپنے آگے یچھے، دامیں باہیں بللاتے ہوئے کہستے  
ہوئے فریادی چہروں کی آواز نہ سن سکی اور نہ اس نے حسرت ویاس، شرمندگی اور بیسی  
کا وہ امتزاج دیکھا جو ایشرواں سائیکل ڈیلر کے منڈ پر گرم گرم کمل تار کی طرح تھہرہ تھہ  
بچھا جا رہا تھا۔ وہ دین بھر درجنوں مقدمہ بازوں، منتیوں اور مختاروں کے سائیکلوں  
کے پہنچ درست کیا کرتا تھا۔ لیکن اسے دانتے! کہ زندگی عزیز کے اس انمول لمحہ اس  
کام سارا مکال بے کار، بے سعد، رائیگان تھا۔ اگر خالی بریٹ کی بات ہوتی تو خیر وہ تو اپنی کھال  
سک کھینچ لیتے لیکن اس کے پاس نہ کوئی بڑا رتیخ تھا۔ اور نہ رہی جیک۔ چنانچہ اب وہ  
اپنی ماڈرن سائیکل ورکشاپ کے سامنے ایک بے یار و مدد گارا پا رتیخ کی طرح کھڑا تھا  
جس کا مال و متاع اس کے سامنے نوٹا جا رہا ہو۔ اب قسمت سے یہاں آگئی ہو تو  
اپنا نور پھیلاتی جاؤ۔ تھارے نور میں تو کوئی کمی نہ ہو گی۔ لیکن یہ زندگیاں غیر فارمی جو جایں  
گی۔ یہ گھر آباد ہو جائیں گے۔ آئنے والی نسلیں تھارے گیت بھی اسی شوق، اسی سود،  
اسی حسرت سے گائیں گے۔ جس طرح اب جانی کے قصے گاتے جاتے ہیں۔.....

”کون ہو مل، کونی ڈاک بھنگل، کونی ریسٹ ہاؤس؟“ ہاتے یہ بھی کیا مجھوں  
ہے۔ اس نکوڑی کا کوئی اسی جنگل میں پہنچ ہونا تھا۔ پھر ایک بھی نہیں، بیک وقت

وٹھا تر پنکھہ ہو گئے ہیں۔ شاید ایک ٹیوب بالکل ہی بچٹ گئی ہو۔ اب اس اجڑیہا بان میں نئی ٹیوب کہاں ملے گی ج بلا؟ ہلتے دن بھی ڈھلتا جا رہا ہے۔ بنارس یہاں سے کوئی ہچا سا ساطھ میں ہی تو ہو گا۔ اگر یہ کم خست کا ہے پنکھہ نہ ہوتی تو اب نک دہاں پہنچ بھی گئی ہوتی۔ بنارس پہنچ کر اس کو ابھی کتنے کام کرنے تھے۔

وکی یہاں پر رات گزارنے کے لیے کوتی اچھا ہو ٹل ہے؟

ارے ہو ٹل میری جان، تجھے ہو ٹل کی کیا حاجت؟ یہ دل دیکھو، یہ سینہ دیکھو، یہ انکھیں دیکھو۔ یہ سارے پڑت تھا رے ہی لیے واپس۔ آؤ یہ کاشٹ نے تھا رے ہی منتظر تھے۔ اب تم کہاں جاؤ گی؟ یہ سب تھا رے ہی گھر پیں۔ وہ آئیں ہماں سے گھر میں خُصلہ کی قدرت ہے.....؟

تم نہیں، یہ کسی کے پاس نہیں ٹھہرنا چاہتی۔ کیا یہاں کوئی ڈاک بنتا ہے جنہیں ہیں؟  
کوئی ریسٹ ہاؤس ہے؟

سہرا م کی کچھ ری کے احاطے میں جتنے دل دھڑک رہے تھے۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ ہو ٹل بیٹاں بنتا ہے اپنے کار تبدیل حاصل کرنے کی سرتوڑ کو شش کرنے لگے اور ان کے کواڑ بے قراری سے بار بار کھلتے تھے اور دامن چیلہا چیلہا کر فریاد کرتے تھے کہ آؤ گھر می دو گھر می کے لیے ان دیرالذول کو آباد کرن جاؤ۔ اگر یہ لا جواب ساعت بیت گئی تو کون جانتا ہے کہ پھر دو بارہ والپس آتے نہ آتے۔ اگر تم یوں ہی چلی گئیں تو یہ تاریخی جو تھا رے بعد تھیلے گی کبھی ڈورنہ ہو سکے گی۔

”خاک“ رانو جھلا سی گئی۔ درکیا نام اس شہر کا؟

سہرا م کا فردہ ذرہ پکارنے لگا کہ ہیں سہرا م کتھے ہیں۔ پہلے ہمارا نام سہرا م تھا۔ بادشا ہوں کے آرام فرماتے کی جگہ۔ وہ دیکھو، سلمنے جو ایک سنگلار خ عمارت نظر آ رہی ہے وہ ایک مقبرہ ہے۔ ایک بارشاہ کا مقبرہ۔ ہماری آغوش میں آج

بھی ایک جلیل القدر بادشاہ محسوس تراحت ہے، لیکن یہ قدر ناشناس لوگ پھر بھی ہیں  
سہرام ہی کئے جاتے ہیں۔ جاہل، پاگل، احسان فراموش۔ دیکھو تو سی۔ تھماری کار  
کے پنچھے نہیں جوڑ سکتے۔ گنوار، نالائق، نجتے.....

اُس روز موڑ سائیکل کو بار بار اچانک دھکے لگتے تھے۔ اسرافیل رہ رہ کے اپنا  
صور پھونکتا تھا جیسے پہاڑ بھرا گئے تھے۔ زمین اور آسمان ایک دوسرے سے مل  
گئے تھے اور اس نفس انفسی کے عالم میں رانو کے سر مریں بازو میری کائنات پر ایک  
مرغولہ نور کی طرح آؤزیاں ہو رہے تھے۔ لیکن پھر وہ بگڑنے لگی۔ غصیل ناگنوں کی طرح  
بل کھاتی ہوئی تیوریاں اس کی پیشانی پر یوں تملدانے لگیں جیسے برفانی بادلوں کے  
اُنچل میں بجلیاں ترپ پڑی ہوں۔ جیسے سرمکی سلوں پر چاندی کے تار سیاہ کی  
طرح جھملدار ہے ہوں۔ غصے میں بھی کیا کیف ہوتی ہے۔ کیا نشہ ہوتا ہے۔ کیسی رعنائی؟  
چنانچہ اگر اس روز قدم پڑھوکروں اور ہچکو لوں نے چارا استقبال کیا تو اس  
میں نہ میرا قصور تھا اور نہ موڑ سائیکل کا، نہ سڑک کا۔ بلکہ ساری کائنات اس شہابی  
غبار کو دیکھنے کے لیے بے قرار تھی جو غصے کی تمازت میں رانو کے گالوں پر فوری  
قرح کی طرح چھایا جاتا تھا۔ اور سخدا! وہ کیا ہی لا جواب، لا فانی انمول  
لحج تھا۔ جب اس کے ڈرائیور نے قطعی طور پر کہہ دیا کہ "دیم صاحب، اپنکچھ  
لگانے کا سامان نہیں مل سکا۔ جب تک یہ سامان نہ ملے، گاڑی بے کار ہے۔"  
رانو کی کار سڑک کے کنارے اس خاموش گاتے کی طرح کھڑی تھی، جس کی  
مانگ ٹوٹ گئی ہو۔ اور بیس میں کوئی سلو تری کا ہسپتال ملنا محال ہو۔ ڈرائیور  
کا فیصلہ سن کر رانو کے گالوں کا شہابی غبار آتش فشاں کی طرح لادے سے اگلنے  
لگا۔ اُس کی آنکھوں میں جو الامکھی کے شعلے سے بھڑکنے لگے اور اس کے نازک پادری  
سہرام کی اس خوش نصیب سرزین کو غصے سے یوں پیٹنے لگے جیسے فریضہ

بندوستان کا تخت پانے کے خواب بن گئی کہ جس سے ادھر سے اور ہر یادی مارتا تھا  
اور جیسے جانی انتظار کی گھنٹیوں میں بے بس، پریشان، مہجور ایسا یاں رکھتی تھی۔ آج شام  
تک رانو کا کلکتہ پہنچنا کس قدر لازمی تھا۔ اس کا احساس نہ ڈراپیور کو ملتا، نہ مولکار  
کو، جو ایک اپاہج گاتے کی طرح سڑک کے کنالے دم توڑے پڑی تھی۔ حالانکہ یہ  
اشد ضروری تھا کہ وہ شام تک کلکتہ پہنچ جائے کیونکہ آج رات جشن آزادی کی  
رات تھی اور رات کے عین بارہ بجے جب آزادی کی دیوبی آکا شہ سے اُتر کراس  
دھرتی پڑے گی۔ اس وقت گرینڈ ہوٹل کا باال روم اپنے پورے جو بن کے ساتھ  
اس کا استقبال کرے گا۔ یوں تو گرینڈ ہوٹل کا باال روم ہر شب شب برات ملتا ہے  
لیکن آزادی کی رات بھی کوئی روز رو نہ آتی ہے۔ اگر رانو نے یہ نہیں موقع کھو دیا تو نہ جلنے  
اسے یہ جشن دوبارہ منانے کے لیے کتنے سو کتنے ہزار برس انتظار کرنا پڑے۔ اور پھر  
ہنس نے اسے اس موقع پر خاص طور پر مدعا کیا تھا۔ ہنس اس کا منگیر تھا۔ بڑا البیلا،  
خوش باش خوش دل جوان تھا اور ناچتا بھی کیا خوب تھا۔ خصوصاً آج کی رات جب  
گرینڈ ہوٹل کا آگسٹھا انسٹی ٹیٹی سریلی موصنی بھائے گا۔ جب باال روم کی فضائی عطا اور یونیور  
شپیں، قہقہے اور خوبصورت نازک انداز، سیمیں اجسام ایک تیز و تند خمار کلہج  
چھا جائیں گے۔ جب رات کے بارہ بجے ہڑاں سال کے انتظار کے بعد آزادی کی  
دیوبی و سکی جن شیری کے گلاسوں کی خوشنما جشن کار کے ساتھ میں پر اُترے گی تو ہنس  
کے رمبا میں کیا کیا تریگ ٹنلے چکی۔ اس کے سبک قدم رقص گاہ کے شفاف اور  
لچکیلے فرش پر یوں پڑیں گے جیسے کسی بھیں کی بھروس میں کنوں کے پھول تیرتے چڑھتے  
ہوں اور اس کے گرسنے بے قرار بانو رانو کو ایک شعلہ بے قرار کی طرح اپنی پیسٹ  
میں بینے ناج گھر کے جھنگی میں گیوں رقصان ہوں گے، جیسے دیا سلامی گو بھڑکتی ہوئی اُنگ  
میں چاہکدستی سے تیز تیز گھمایا جاتے اور اسے اُنگ ز لگتے پاتے — لیکن تقدیر کا نوشتہ

کس نے مٹایا ہے اور کون مٹاتے گا؟ عین اس وقت جب ملکتے میں ہر چیز اپنے طور سوٹ کے کار میں لگانے کے لیے سفید گلاب کے ایک بڑے سے چھوٹ میں پلاں پیرس کا عطر پیش، سویوں سے چھوپھو کر بسا رہا تھا۔ رانوگر یہ ڈریک روڈ پر ایک خیراتی سراتے کی طرح بیسے ہوئے چھوٹے سے شہر سر ام میں سب ڈوپنل مجھریٹ کے چھوٹے سے تاریک سبک میں ایک ناقابل بیان، بے کسی پیزاری اور بالیوسی کے عالم میں اپنا سامان اتردار ہی تھی۔ لیکن اس جہان کی آمد پر صدیوں سے سویا ہوا بندگ اسکراںی سی سے کر بیدار ہو گیا۔ اس کی اونچگتی ہوتی ہے جان دیواروں میں زندگی کے آثار لامرنگے۔ جب ہوتی ہر کلیاں اور فرسودہ درستھے فرمیدہ کلیوں کی طرح کھلنے لگے۔ تاریک چھتوں پر جیسے چاندا و تارے طلوع ہو گئے ہوں اور جب رانو نے اپنے لاجواب ہاتھوں سے ڈرائیگ روم کی کرسیوں اور میزوں پر بکھری ہوئی کتابوں کو الماری میں رکھ کر صوفے کا رُخ قدر سے بدل کے رکھا تو اس بھولے بسرے، پریشان حال کمرے میں نشاط اور شالamar کی گل پوش روشنیں آ راستہ ہو گئیں۔ اور پھر آج کی تاریخی رات ملکتہ مہ پنج سکنے کا غام کھل کرنے کے لیے رانو نے اپنی پنکب بکس سے جن، رم اور وسکی مکال کر چند تیز عنابی رنگ کے کاک ٹیل بنکے نوش جان فرماتے۔ ان کا خمار گلابی ڈوروں کی صورت میں اس کی غزالی آنکھوں میں چھپک آیا اور اس کے گالوں پر آتش بازی کی مہتایاں انار چھوٹتے گے۔ اونچی رات کے قریب جب ہم شیر شاہ کے مقبرے کی چھت پر جا کے بیٹھ گئے تاکہ سر ام کے گلی کوچوں میں آزادی کا نفوذ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں تو اس وقت وہ ویران تقریباً گرینڈ ہوٹ کے بال روم سے زیادہ منور اور بار دلتی محسوس ہونے لگا۔ اور اس کے ساتھ میں ایک عجیب سادی سار کھڑا رنجھنے لگا۔ سر ام کی سرزین پر ایک نئے شیر شاہ نے جنم لیا جس پر تاریخ کبھی کوئی یادگار مزار تعمیر نہ کر سکے گی۔ اور ایک تی جانی نے ظلمت شب کو اپنے گیسوئے عنبریں سے تابانی عطا فرمائی۔ لیکن اس کے نام پر غالباً کوئی بازار

قائم نہیں ہوا۔ گھڑی کی سوئی بارہ بجھنے سے کچھ منٹ ادھر دھینے دھینے لرز رہی تھی جیسے کسی حسینہ کے ڈکتے ہوئے ہونٹ انکار اور اقرار کے مابین تھر تھرا رہے ہوں۔ شیرشاہ سودہ کے مقبرے کے گرد جو تلاab ہے، اس کی سیڑھیوں پر بہت سے بچے خوشی اور جوش سے لکھا ریاں مارتے ہوئے انار مہتابیاں، پچھوندیں اور پلٹاخے جمع کر رہے تھے اور انھیں تلاab کے گرد اس خوبی اور گوشش سے بجا رہے تھے جس طرح رانو نے میرے ڈارلنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر اپنے بیچیدہ کالکلوں کو آراستہ کیا تھا۔ ملکتہ گرینڈ ہوٹل میں بال دم اپنے جوں پر تھا۔ ہنس رانو کی آمد سے مالوس ہو کر اس پر میلا کو اپنی بانہوں کے حلقة میں لیے آزادی کا رقص ناق رہا تھا۔ ڈارلنگ مجھے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ تھا میں رکھو۔ رانی اپنی مخمور، موسیقار آزاد میں کہہ رہی تھی۔ جانی گاڑ، میں اس مقدس رات کو آسانی سے برداشت نہیں کر سکتی۔ جانی گاڑ، میں وفر جذبات سے مر جاؤں گی۔ آزادی کے انتظار میں رانو بھی ان بچوں کی طرح بے خود اور بے قرار ہو رہی تھی۔ جو بچے تلاab کی سیڑھیوں پر استبازی کی قطایریں سجا رہے تھے۔ ان ایک بچہ دھرم امام سے چیل کرنے والا فرش پر گر پڑا۔ اس کے ہاتھ کا انار تڑا خ سے بھیٹ گیا۔ اس کا چہروں گرم دھوپیں کے غبار میں لپٹ گیا۔ اس کی آنکھیں ججلس کر میں گئیں۔ اب وہ اپنی آنکھوں سے اس دیوی کی شان نزول نزدیکوں سکے گا جس کا استقبال کرنے کے لیے اس نے اپنی توتنی زبان سے انقلاب زدہ باو کے نفرے لگانا یکھے تھے۔ آسان پر ایک تاراٹوٹا اور ڈوتک ایک خط لوز کھینچتا ہوا غائب ہو گیا۔ جانی کے بازار میں طبلے پر زور کی تھا۔ پڑی گھنگرو نلچے شیرشاہ کے مقبرے کے سفلخ پھر سنگ مرمر بن گئے۔ بچت کے اندر ہرے میں ایک شمع فروزان بھڑکی۔ آزادی کی دیوی سوانیزے پر اُترائی تھی اور میرے کافوں میں ایک نازک سی تترم سی آواز کہہ بھی تھی۔ نچا گلیٹ سر؟

میں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو لکھے نیلے فرآک والی اُر ہو ٹس بسکٹوں چاکلیٹوں،

چو سنتے والی مٹھائیوں کی ٹوٹے لیئے میرے سیٹ پر جھکی ہوئی تھی اس کے احمد بالوں کی ایک  
لٹ ٹوٹے پر بے پرواٹی سے لہرا رہی تھی اور اس سے یا سیم کے سینٹ کی ہلکی ہلکی سی شیم  
یوں آر جی تھی جیسے پیٹوں کے کنج سے ٹھنڈی ٹھنڈی نسیم کے جھونکے چھپن رہے ہوں۔  
بی۔ او۔ اے۔ سی کا طیارہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر اپنے چار انجنزوں کی طاقت سے  
پُوری رفتار پر پرواز کر رہا تھا۔ راوی گز چکی تھی اور اس کے رومان بھی۔ اب ہم دریائے  
سندھ کے پاس پرواز کر رہے تھے، جس پر فقط سکھ سیراج ہی تعمیر ہو سکتے ہیں۔ اور  
گنگا اور جمنا، اور سونہرگل کے مرغزار بہت تیچھے رہ گئے تھے، جہاں کے صنم خانوں  
میں رانوازل تک راج کرے گی۔ لیکن آزادی کی دیلوی اب کبھی دھرتی پر نہ آتے گی۔  
سمسرا م کی سڑک پر کسی کار کو پہنچنے ہوں گے۔ شیشاہ کا مقبرہ اب پھر آباد نہ ہو گا۔ اس کے  
سنگلاخ پھر مر نہ بن سکیں گے۔ اس کی چھت پر کوئی شمع فروزان نہ بھڑکے گی۔  
سر و درفتہ بازاً آید کہ ناید

## نمبر پلینر

بہت سے لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ جب ٹیلیفون کے تاروں میں ایک نغمہ سالم رکھتے ہیں۔ جب رسیور میں ایک پائل سی ناچتی ہے تو وہ زو بی کی آواز ہوتی ہے جس وقت وہ سونچ بورڈ کا بڑا دباؤک "نمبر پلینر" پوچھتی ہے تو بہت سے صاحبِ دل نمبر تالے کی جگہ درد دل، درد جگہ اور غم جانان کی داستان سنلتے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ زو بی کی آواز میں ایک سمجھ پیار، ایک عجیب سوز، ایک حسین بے تکلفی ہے۔ جو منہنے دلوں کے درد ہاتے نہانی کو بے ساختہ چھپتے دیتی ہے اور انھیں دعوت دیتی ہے کہ مجھے اپنا غم بتاؤ، مجھے اپنے زخم دکھاؤ۔ شاید کہ میں تمہارے کام اسکوں ٹیلیفون کے تاروں میں زو بی کی آواز یوں چھپنے کر آتی ہے۔ جیسے رستے ہوئے زخموں اور جلتے ہوئے ناسوں پر اطراف اتنکت شعاعیں پڑ رہی ہوں۔ لیکن تم ظریغی تو یہ ہے کہ ادھر زو بی نے پوچھا "نمبر پلینر" اور ادھر نمبر کی جگہ نام بتایا گیا۔ ادنام کے بعد فرمائش ہوئی کہ دو ارٹن، تمہارا بیمارانام کیا ہے؟" دسویٹی، تمہاری ڈیلوٹی کے بچے سے کہ بچے تک ہوتی ہے؟"

”آج شام پھر؟“ ایسے موقعوں پر زندگی سوچ بورڈ سے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اور پھر کتنی تک  
گھنٹوں تک ٹیلیفون کے تار اس کی آواز کی موسیقی کے بغیر ویران رہتے ہیں اور نئی نیز  
السان ان تنفسی شعاعوں کی سیاحتی سے محروم ہو جاتی ہے۔

جس ایسچینخ میں زوبی کام کرتی ہے، وہاں ٹیلیفون کے کوئی سات سو اسات سو  
نمبر ہیں۔ ٹیلیفون آپریٹروں کی تعداد بچھد ہے۔ دو مرد اور چار لڑکیاں۔ زوبی کے علاوہ  
میں پر وین اور میں ڈی سوزا جوان اور خوبصورت لڑکیاں ہیں۔ چوتھی کا نام میں پری  
جمال ہے۔ میں جمال کے نام میں جولطا فت شلاش ہے، وہ صریحًا جھوٹ ہے۔ دھوکہ  
ہے، فریب ہے۔ نہ تو وہ میں ہے۔ کیونکہ اس کی شادی ہوتے بارہ برس ہو چکے ہیں۔  
اور وہ دو لڑکیوں اور تین لڑکوں کی ماں ہے۔ نہ ہی اسے کسی زاویہ خیال سے پری کہا  
جا سکتا ہے اور جمال اگر اس کے شوہر نامدار کا لقب ہو تو خیر، ورنہ جمال سے بھی اتنی  
بھی دور ہے، جتنا کوہ قاف سے۔ تاہم اسے اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ اور ابھی تک  
کسی نے محمد ٹیلیفون کے پاس اس امر کے خلاف احتجاج نہیں کیا۔ ان چاروں کے  
علاوہ ایسچینخ میں دو مرد ہیں۔ ان کی حیثیت اخباری ضمیموں کی سی ہے۔ چنانچہ جب  
تک کوئی خاص حادثہ دریش نہ آتے۔ ان کا وجود بے کار اور بے سود سارہ تاہے بن  
بھروہ اپنے اپنے سوچ بورڈ کے سامنے بیٹھ کر پان چباتے ہیں۔ بیڑی پیٹتے ہیں۔  
لڑکیوں کو گھوڑتے ہیں۔ اور کبھی کبھی میں پری جمال کے ہونے والے چھٹے بچے کا نام  
 منتخب کرنے میں بھی مدد دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک تیرتھ رام فیروز پوری کے ترجمہ  
کیکے ہوتے جا سو سی نادل پڑھنے کا شوقیں ہے اور دوسرا اپنے فرست کے لمحات میں  
تعزیرات ہند کی ایک کہنہ سال، بوسیدہ جلد کا مطالعہ کیا کرتا ہے۔ یہ بات نہیں کہ خدا خداستہ  
اے کسی کچھ ری وچھری سے واسطہ پڑتا ہے پاپنے کا احتمال ہے۔ بلکہ وہ ٹیلیفون کے  
نمبروں کا تعزیرات ہند کی مختلف دفعات سے مقابلہ کرنے کا ہے جو شوقیں ہے اور

اس عمل سے اسے ٹیلیفون والوں کے ماضی، حال اور مستقبل کے متعلق حیرت انگیز انکشاف کرنے میں بہ طبعی حاصل ہے۔

علم پتندس کی یہ نئی صنعت اکسیجن والوں کا محبوب مشغله ہے اور اس کی مدد سے انہوں نے بہت سے معززین شہر کے جماعتی، دماغی، جنسی اور روحانی رنجانات کی نسبت عجیب و غریب نظریات قائم کر رکھے ہیں۔ چنانچہ ٹیلیفون نمبر ۱۲۱۳۶۰۱۷ کا نام برکات جو مسجدوں میں شریعت لام کے متعلق نیچر فرماتے ہیں۔ ان کے متعلق یہ پیشگوئی ہے کہ وہ کسی روز خطبہ بغاوت ارشاد فرمائے کے بعد کاملے پانی کی راہ میں گے۔ پھر ہدایت عبید العزیز اڈسکٹ سول افسر کو بنے تکلفی سے رشوت لینے کا حق پہنچتا ہے۔ کیونکہ ان کے ٹیلیفون کا نمبر ۱۲۱۳۶۰۹۸ ہے اور ۱۲۱۳۶۰۱۷ کا نمبر سردار حشمت اللہ خاں سوزا پتی خوبصورت ہرخ سنگ کار میں جو ہر روز ایک نئی حسینہ اڑائے پھرتے ہیں۔ وہ یقیناً دوسرے لوگوں کی بیویاں ہوتی ہوں گی!

دوسرے مرد آپریٹر کی راستے ہے، کہ ڈاکٹر مس نیمہ اختر کے ٹیلیفون پر ۰۳۳ کا نمبر دلوں فٹ آئتا ہے جیسے اس کے بدن پر ۳۸۱ انج چھاتی والا بلاوز تا اس کے پاؤں میں بائما کا ۵ نمبر والا سینڈل۔ یہ تفصیلات اس نے ڈاکٹرنیمہ کی پوربِ آیا سے ہی می پاؤں میں بائما کا ۵ نمبر والا سینڈل۔ کیونکہ وہ اسی کے محلے میں رہتی ہے اور کجھی کجھی پان بڑی کاواش سے فراہم کی ہیں۔ کیونکہ وہ اسی کے محلے میں رہتی ہے اور کجھی کجھی پان بڑی کے لیے پیسے وصول کرنے چوری چھپے اس کے ہاں بھی آ جایا کرتی ہے۔ اس آپریٹر کا لفڑی یہ ہے کہ ڈاکٹر مس نیمہ کو قاتل نہ سمجھنا بھی حمد و جہ کی بے ذوق اور کور مذاقی ہوگی۔ کیونکہ ایسی انکھیں نہیں یہ تو تیر ہیں! اور یہ مصر عدگاٹے گاتے اس کے منڈ سے پانوں کی پیک میں غلطیدہ رال ٹپک کر منتظر تیر تھا رام فیروز پوری کے نادلوں کو زیگن سے زیگن ترکر لے لگتی ہے۔ البتہ ڈاکٹرنیمہ کے زنسگ ہوم اور اس کے شنگین ٹیلیفون نمبر کی رمز الگ کوئی سمجھتی ہے تو مس ڈی سوزا ہی پوری طرح سمجھتی ہے۔ کیونکہ ایک بار اس نے بھی چند بفتے اس کی زنسگ ہوم میں گزارے تھے اور اس نے یہ راز بڑی مشکل سے محسن مس پروں کو بتایا تھا۔ چنانچہ دلوں اپنے اپنے سوچ بوردوں پر بھک کر ایک دوسرے کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتی ہیں اور چکے چکے مسکلاتی ہیں، جیسے موقع واردات پر ملزم کو پکڑ کر پولیس کا تھانیدار اپنی لائبی گھنی موخچوں کے درمیان کامیابی سے مسکاتے۔

زوبلی ان قانونی موشکافیوں میں حصہ نہیں لیتی اور نہ ہی اسے دوسرے لوگوں کے جسمانی یا روحانی غلافوں کے نیچے جماں کے کا شوق ہے البتا اس امر پر ایک گونہ اطمینان ہے کہ ایک چینی کے بخوبی ۱۱، نمبر ۷ ٹیلیفون پر اپنی قانونی دوہیں لگانے سے قاصر ہیں۔ ایک روز اس نے چوری چوری تعزیرات ہند میں دفعہ نمبر ۱۱ تلاش کرنے کی بوشش کی جیسے کوئی شرمندی کنواری چھپ چھپ کر دیوان سے اپنے منگتیر کے نام پر فل کا لے لیکن زوبلی نے دیکھا کہ یہ غیر قانونی کی دسترس سے بھی باہر ہے۔ ہر جرم سے پاکیزہ

ہے۔ ہر لازم سے بڑی ہے۔ ہرگناہ سے بلند ہے اور اس خیال سے اس کے گالوں پر کچھ فخر کچھ جیسا کچھ سرد کی سُرخی غاز سے کی طرح پھیل گئی۔ کچھ الیسی ہی سُرخی، مس ڈی ہسوا کے پھر سے پر بھی نہوار ہوا کرتی ہے۔ لیکن اسی روز جب اس کے باپ سے پہنچی ہوئی رسم کی بوتل اس کے پتھر چڑھ جاتے یا اس کو کافی ہلال میں ڈانس اور تمبلو لا کے لیے جانا ہو۔ جس روز مس پر دین کے منہ پر گلابی ڈور سے جھلک رہے ہوں تو وہ پکار پکار کر کہا کرتے ہیں کہ آج تارگھر کی پٹھیوں پر ٹیلیفون پروانہ نے اسے زبردستی چوم دیا ہے۔ مس پری جمال کے پھر سے پرخون کی نیایاں گردش عام طور پر ایکستے بزرگدار کا پتوش خیر ثابت ہوتی ہے۔ لیکن جب زوبی کے گالوں پر شفق کھلے، جب اس کے ہونٹوں پر گلابی کتیاں بکھر جائیں، جب اس کی انہکھوں میں کتوں کے چھوٹی تیر نے لگیں تو انسان کے فرشتوں اور جنت کی سوروں کے سوا اور کوئی نہیں پہچان سکتا کہ اس وقت ٹیلیفون نمبر اے کے تار میں ایک نغمہ سالمراہا ہے۔ ایک پائل سی ناج رہی ہے اور زوبی اپنے سوچ بود پچھلکی ہوئی پوچھ رہی ہے: ”نمبر پلیز؟“ نمبر پتا مہم ہے۔

زوبی نمبر دہراتی ہے۔  
”شکریہ!“ وہ کہتا ہے۔

اور ان چار فقروں کے سحر سے ایک نتے آدم ایک نتی جوا اور ایک تی جنت کی تخلیق مکمل ہو جاتی ہے۔ زوبی کو یقین سا ہو چلا ہے کہ یہ ٹیلیفون اسی جگہ ہے جہاں اسے ہونا ہی چاہیے جس طرح تعزیر استہندا لے آپریٹر کو یقین ہے کہ اگر اس میں ہے، نمبر والا ٹیلیفون بھی ہوتا نہ وہ ضرور جامع مسجد میں نصب کیا جاتا۔

زوبی کا پورا نام زبیدہ ہے۔ زبیدہ رحم نخش۔ زوبی محض بے تکلفی اور پیار کا نام ہے۔ چونکہ بیشتر حضرات اس سے بے تکلف ہونے اور پیار کرنے کے شدت سے قابل ہیں۔

اس لیے عموماً اسے زبیدہ کی جگہ زوبی ہی کہا جاتا ہے بخشی فاضل اور دیب فاضل کے امتحانات پاس کرنے کے بعد اس نے پرائیویٹ میٹرک کیا۔ اور آج تک وہ الیف۔ اسے کی تیاری کر ہی ہے اسے کسی چیز سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ اور اس نے کبھی ٹیلیفون پر چوری چوری دوسرے لوگوں کی گفتگو سننے کی گوشش نہیں کی۔ چنانچہ اگر مس ڈی سوزا کھلم کھلا اپنے تجربات پر تبصرہ نہ کیا کرتیں، تو غالباً زوبی کو ساری عمریہ معلوم نہ ہو سکتا کہ جس وقت خاص صدر علی ٹیلیفون پر سیٹھ ہمت شاہ کی سیکھ صاحب سے پچھہ کہہ رہا تھا کہ مذاق آپ دونوں غریب خانہ پر کھانا تناول فرمائیں، تو اصل میں اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ آج شام خالی ہے۔ سیٹھ صاحب دور سے پر جا رہے ہیں۔ رات کے آٹھ بجے جنم خانہ کے باہر انتظار کر دیں گا۔ اسی طرح ٹیلیفون کی اصطلاح میں زکام کا مطلب درد دل ہوتا ہے۔ مسجد میں سے سینما کا کام لیا جاتا ہے۔ گھر سے کلب مقصود ہے۔ لاتم جوس سے وسکی کا ہپلو نکلتا ہے اور موسم کی گرمی سردی میں حسن یا سک بانیں ہوا کرتی ہیں۔ یہ باتیں اپنے دزدیدہ رومنوں کی قوس قزح سے آپسیں کی فضائی کوئی رنجیں کر جاتی ہیں۔ انھیں شن کر مس پر وین کی پکیں اس کی آنکھوں پر بوجھل ریشمی پر دوں کی طرح گھبائتی ہیں۔ مس ڈی سوزا کے ہونٹ انسدان کے سامنے پڑے ہوئے گھستنے کی طرح نمازت کھا کر خشک ہو جاتے ہیں اور کسی وقت مس پری جمال بھی دم بھر کر لیئے ایام نیچلی کی عبرت انگریز یاں جملہ کراپنے ماحول کی ترنگ میں بہرہ نکلتی ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک ٹیلیفون نے دوسرے ٹیلیفون کو لگنے لگانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔ ایک ریسیور نے دوسرے ریسیور کے ہونٹ چومنے کی گوشش کی تو اس وقت ایک قیامت سی آجاتی ہے۔ ٹیلیفون کے تاروں میں سمجھیاں سی کڑکنے لگتی ہیں۔ سوچ بورڈوں کی چاہیاں الجھنے لگتی ہیں اور مس ڈی سوزا اور مس پر وین بے تاب ہو کر ایک دوسرے کے بلا ذہنگ تار تار کر ڈالتی ہیں۔ کسی وقت مس پری جمال پر بھی رعشہ ساطاری ہرنے

لگتا ہے۔ لیکن زوبی پر ان طوفانوں کا کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ یہ زبردست آندھیاں اس کے آنچل کو ذرا بھی نہیں ہلاتیں۔ وہ اپنے سروچ بورڈ کے سامنے بیٹھی رہتی ہے۔ اگرچہ یہ بھی ایک قانونی خدا ہے کہ عورتوں پر نبوت کا نزول نہیں ہوتا۔ پھر بھی جب نمبر ۱۱ پر لکھا ہوا چھوٹا سا برقی قلمہ مٹھانے لگتا ہے تو طوفہ پر بھلی چمکتی ہے۔ زوبی موسیٰ کی طرح غش کھا کر گنجیں جاتی بلکہ موسیقار اور ازیں پوچھتی ہے۔ نمبر ۱۱ پر؟

وہ نمبر بتانا ہے۔

زوبی نمبر ہراتی ہے۔

”شکریہ“ وہ کہتا ہے۔

اور زوبی دل ہی دل میں سرشار ہو جاتی ہے۔

مس پر دین کو اس نمبر سے چڑھتا ہے۔ اور مس ڈی سوزا کو بھی۔ ان کا خیال ہے کہ اس ٹیلیفون سے ہندی سے ریگی ہونی وارٹھی اور دانت صاف کرنے سے خلاں کی جو آیا کرتی ہے۔ اس ٹیلیفون کا مالک دن بھر گا دلخیکھ کا سارا لیے بان چیتا ہو گا۔ اس کے پہلو میں ایک یا دو یا شاید تشریعی لحاظ سے چار بیگمات اپنا اپنا اگالداران سامنے رکھے بیٹھی ہوں گی..... والائیں درجن بھر پتوں کی فوج کریبا پر بخشانے بحال مکاراں کا تازان گاتی ہو گی اور وہ ہر کو روٹ پر شکریہ بسم اللہ ما شا۔ اللہ کی حمارت کرتا ہو گا۔ ..... لیکن زوبی کے پردہ خیال پر یہ نقوش کوئی نشان نہیں چھوڑتے۔ رات کے وقت جب وہ تار گھر کے عقب میں اپنے چھوٹے سے کوارٹر میں الیف۔ اسے کے امتحان کی تیاری کرنے ہی تو کبھی کبھی اس کا دماغ ٹیلیفون کے ناروں کا سہارا پھر کر نمبر ۱۱ کی طرف رینگنے کی خوشیں کرتا ہے۔ یہ طسی ہند سے اس پر طرح طرح کا سحر کرتے ہیں۔ کبھی وہ دب کر کی طرح جگلگاتے ہیں۔ کبھی ان پر کھکشاں کا نور برستا ہے۔ کبھی وہ تاریک دیر انولیں کھو جاتے ہیں۔ اور زوبی بیکتی جاتی ہے۔ گرتی جاتی ہے۔ ایک آندھے کنوئیں میں

ایک شیق ناریں۔ اور کوئی معذز فرشتہ اس کے دہنے پر وحی لے کر نازل نہیں ہوتا۔  
 کیونکہ عورتوں پر وحی کا نزول تقاضا نے خداوندی کے خلاف ہے۔  
 پکھو دنوں کی بات ہے کہ زوبی کے دل اور دماغ پر کچھ جیراں، کچھ پریشانی  
 کے مہم سے سائے رہنے لگے۔ نمبر ۱۱ کتی روز سے خاموش تھا۔ اس ٹیلیفون کے  
 پردہ ساز سے جو روح پرور نعمت پیدا ہوتے ہیں، ان پر سکوت طاری تھا۔ اور  
 اس کی خاموش کائنات کی ساری رنگینیاں صابن کے بلبلوں کی طرح مت رہی تھیں۔  
 رات کے وقت جب زوبی الیف اسے کے امتحان کی تیاری کرنے بیٹھتی تو ۱۱ کے  
 سحر کا رہنہ سے بھول کاروپ پھر بھر کر اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتے  
 ہیں۔ صبح سے شام تک وہ منتظر رہتی رہتی کہ نہ جائز کیس وقت سورج بورڈ پر نمبر ۱۱  
 پر لگا ہوا نہ ساقی قمر دوشن ہو کر ساری دنیا کو اپنے نور سے بیریز کر دے گا۔ لیکن  
 وہ تحلیل چکلی پر بچکلی۔ زوبی سوچتی رہتی کہ شاید وہ چلا گیا ہو۔ شاید وہ پیار۔ شاید.....  
 آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کی خیریت پوچھے؟  
 ایک چھوٹی سی ہمدردی کوئی لگتا ہی تو نہیں۔ اگر اس پر وہ اور مسٹر سوزانے دیکھ  
 دیا تو یہ شک وہ ٹری ٹری بانیں بنایں گی۔ اور اس پری جمال توحید سے جل بجھا ہی جائیں  
 گی۔ تعزیرات ہند والا آپریٹر بھی نریلب مسکراستے گا۔ لیکن بلاستے۔ یہ بھی کوئی جرم  
 ہے جعلا۔ اور آخر سورج سورج کر پچکچاتے پچکچاتے، کانپ کانپ کر زوبی نے سب  
 کی نظریں بچا کر نمبر ۱۱ کو ٹیلیفون کر ہی ڈالا۔ پلگ لگا کر اس نے رسیور اٹھایا اور دھڑک  
 ہوتے دل سے گویا اپنی قسمت کا فصلہ منئے لگی جو شاید ازال ہی سے لوح مقدس میں لکھا  
 جا چکا تھا! ۱۱ نمبر ۱۱ کی ٹیلیفون کی گھنٹی بجئے لگی۔ جیسے سجد کے صحراء میں جرس ناقہ لیلہ.....  
 یا جیسے کسی نے غفور الحیم کی زنجیر عدل کی ہلا دیا اور ساتویں آسمان پر گھنٹیاں بج رہی

”ہیلو، ٹیکلی فون تے کہا۔

”جی، معاف کیجیے، میں ٹیکلی فون آپریٹر بول رہی ہوں یہ زوبی نے اقبال جرم کیا۔

”کون آپریٹر؟ ٹیکلی فون کچھ حیران سا ہوا۔

”جی، زوبی، میرا مطلوب ہے، زبیدہ حسین بخش یہ اس کی زبان لڑکھڑائی۔

”ہا ہا ہا، ٹیکلی فون میں ایک بلند قدر سہ صوراً صرافیل کی طرح گونجایا گریں۔

گریں۔ فرمائیے، فرمائیے؟

زوبی کچھ حیران ہوئی، کچھ پریشان ہوتی۔ لیکن دل پر قابو پا کے اس نے کہنا شروع کیا۔ ”جی، معاف فرمائیے، مجھے فکر ہوا..... جی، میرا مطلوب ہے کہ اپ کا ٹیکلی فون کتی روز سے خاموش تھا۔ میں نے سوچا کہ نصیبِ دشمنان کہیں آپ کی طبیعت خراب نہ ہو۔ جی، محسن انسانی سہزادی کے.....“

”ہا ہا ہا، صوراً صوراً صرافیل اور بھی زور سے گونجایا“ میں سمجھا۔ تم شاید نصیب صاحب کے متعلق پوچھ رہی ہو۔ دیکھو ماتی ڈیر، وہ تو یہاں سے تبدیل ہو چکا ہے لیکن خدا کی قسم! میں اپنے دوست کی ساری ذمہ داریاں بعنوانِ شناشیتہ سنبھال سکتا ہوں۔ ہا ہا۔ زوبی ڈار رنگ، میں ٹھیک چھوٹے بھے ایک چھوٹے بھے کے باہر انتظار کر رہیں گا۔ مالی لکھیں گے شنس۔ وہاٹ اسے لائف۔ وہہٹ اسے ڈیم گلوریس لائف.....“

شام کے عین چھوٹے بھے ایک چھوٹے بھے کے دروازے پر ایک نیلے رنگ کی خوبصورت والٹر بیوک اسکے رُکی اور رحمت ایزدی نے زوبی پر اپنا نور کا مل کر دیا۔

## پکے کسے آم

علی الصبح جب ریل گاڑی جھوں توی کے قریب منچی، تو ڈاہسین منظر تھا پنجاب  
 کی جھلسٹی ہوتی لوکی جگہ خنک ہوا کے جھوٹکے اُر ہے تھے۔ سامنے ایک پہاڑی چھوٹ  
 کا شہر کا دھننا۔ جیسے کسی نشیب پر کلیاں اُگی ہوتی ہوں۔ پس منظر میں پہاڑوں کی چوٹیاں  
 تہہ در تہہ متوازی خطوط کی طرح بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھیں۔ اور انہی کا نکتہ عروج بڑ  
 پوش چمایہ کا وہ سلسلہ کوہ سے تھا، جو ان سب کے پیچے ایک سنگلاخ چنان کی طرح  
 ایستادہ تھا۔

جس طرح جھوں کے پس منظر میں پہاڑوں کی بلند سے بلند تر چوٹیاں ہیں۔ اسی طرح  
 جھوں شہریں سب سے فیساں چیزیں اس کے مندر ہیں۔ کالے مندر۔ سُرخ مندر۔ سفید مندر۔  
 سونے کی چادریوں میں پیش ہوتے زکار مندر۔ رابرٹ لانگ نے مُوریں لگا کر ان کے  
 کھلساں گئنے کی گوشش کی لیکن جس طرح تارے گئتے وقت ہر خالی جگہ پر ایک نیاستارہ  
 جھملانا نے لگتا ہے، بالکل اسی طرح ہر لمحہ کسی مکان یا دخالت یا دیوار کی اوٹ سے

ایک نئے مندر کا مکس نہوار ہو جاتا تھا اور اس کی گوشش رائیگاں جاتی تھی حکیم گوراندہ مل جو لاہور سے سوار ہوتے تھے۔ رابرٹ کی مشکل بجانپ کراول مال شفقت سے اس کی معلومات میں اضافہ فرمائے گئے۔ وہ ایک بخاری بھر کم کوٹ میں ان دو ایوں کی شیشیاں اور پیکٹ بھر رہے تھے جو وہ لاہور سے خرید کر لائے ہوئے تھے۔ اس کوٹ کے اندر کی طرف بے شمار تھے خلنسے اور چوپیسیں بنی ہوئی تھیں اور وہ ٹھوں ٹھوں کر ہر خالی جگہ شیشیاں اور ڈبے ٹھونس رہے تھے۔ اس حرکت کے جواز میں فرمایا کہ ریاست میں دو ایوں پر تین سو فیصدی تک کشم ڈیلوٹی عالیہ ہوتی ہے۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے چنانچہ حکیم گوراندہ ایسا ایماندار اور شریف انسان بھی مجبور ہے کہ وہ اپنے عجیب و غریب کوٹ کی جیلوں میں دو ایوں کو چھپا کر کشم ڈیلوٹی پہچاتے۔ وہ اپنے شہر کا سیاح نفس اور ہر داعزین طبیب ہے۔ اس کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ وہ مفلس و نادار ملکیوں کو کم سے کم قیمت پر دو ایسا فراہم کرے۔ اس فرض کی انجام دہی میں اگر اسے کشم سے بچنے کے لیے چوری یا دھوکہ دہی کا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے تو یہ کوئی جرم نہیں، بلکہ عین ثواب ہے اخلاقیاً پر طبع آزمائی کے بعد حکیم صاحب مندوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور رابرٹ لانگ کو اطلاع دیتے ہیں کہ جموں شہر میں ۲۰ مندر ہیں۔ سونے کی چادر میں منڈھا ہو اگھنا مندر جس میں ضرورت کے وقت حضور عما راجہ ہما در بنفس نفس قدم رنجہ فرماتے ہیں۔ دیوالوں کا مندر۔ وزیروں کا مندر۔ تختہ کے راضپتوں کا مندر، منادر کے ذیلداروں کا مندر..... ذات پات رتبہ پر رتبہ، بننے ہوئے مندوں کی تفصیلات کے ساتھ حکیم گوراندہ مل جبوں کے نام کی وجہ سیمیہ پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ اور راجہ جامبو لوحن سے لے کر مہاراجہ ادھیراج شری ہری سنگھ تک بہت سی تاریخی اور بخرا فلائی تفصیلات میں کچھ اس طرح اُبھجھ کر ان کی تقریب کا مفہوم رابرٹ لانگ کی سمجھ سے بالآخر ہو جاتا ہے۔ دراصل حیکیم صاحب کا قصور نہیں کیونکہ وہ رابرٹ سے زیادہ اپنے مداری کے تھیں

ایسے کوٹ اور دواں کے ڈبے کے ساتھ زیادہ مشغول ہیں۔ یوں بھی ایک خاندانی حکیم کا یہ فرض ہے کہ وہ کسی غیر ملکی نامنگار پر وقت ضائع کرنے کی بجائے اپنے غریب مرضیوں کے لیے سستی دعائیں فراہم کرنے کی زیادہ گوشش کرے۔

اس ڈبے میں ایک مردا جی بھی ہیں۔ غالباً کپڑے کے تاجر ہیں اور اپنے غریب گاہوں کے لیے سلک، بوسکی اور جارجٹ سستے داموں فراہم کرنے کی سرفوڑ گوشش فرمائے ہیں۔ اپنے کپڑے اتار کر وہ ننک، بوسکی اور جارجٹ کے ٹکڑے اپنی ٹانگوں، پیٹ، چھاتی اور بازوں پر تہہ در تہہ لپیٹتے ہیں اور ان کے اوپر پاجامہ، قیض و اسکٹ اور کوٹ چوتھا لیتے ہیں۔

جس کے جسم کی ساری ٹپیاں کبھی حداثت میں ٹوٹ گئی ہوں اور پلاسٹر کاف پیرس لگا کر اسے سر سے پاؤں تک پیشیوں میں باندھ دیا گیا ہو۔ حکیم گوراندہ مل بھی اپنے کوٹ میں عجیب الخلقت چیز نظر آتا ہے۔ لیکن کیا کریں۔ بچارے دونوں اپنے احساس فرض سے بچ جبکہ مجبور ہیں۔

جموں میں ٹیکیسوں کا رواج نہیں۔ اس لیے رابرٹ لانگ حکیم گوراندہ مل اور اپنے ہم سفر استاد جی کے ساتھ ایک تانگے میں سوار ہو جاتا ہے۔ کشم ہاؤس کے سامنے ایک دردی پوش محلہ رٹانگے کو روکتا ہے۔ اس کے آگے دواڑتا نگوں کی تلاشی ہو رہی ہے۔ ٹرنک، سوت کیس اور بسترنر ٹرک کے عین درمیان کھلے ٹپے ہیں۔ کشم ہاؤس کا ایک جوان سال افسر جس نے کھلے گلے کی زرد قیض اور سفید پتوں ہپنی ہوئی ہے ایک برقعد پوش عورت کے بر قعے کے اندر ہاتھ ڈال کر اس کی کمر اور سینے کی تلاشی ہے۔ ایک دبلا پتلا مریل سا آدمی جواس کا خاوند یا بھانی ہے پاس گھر عختے سے بل کھا کھا کر احتجاج کر رہا ہے۔ لیکن ایک دردی پوش سپاہی اپنے باغھر کا موٹا سا ڈنڈا دکھا کر اسے خاموش رہنے کی تلقین کرتا ہے۔

را بربٹ لانگ حکیم گوراندہ مل سے پوچھتا ہے کہ کیا اس ریاست میں عورتوں کے جسم پر بھی محصول لگتا ہے؟

حکیم گوراندہ مل حسبہ معقول اس کے سوال کی طنز آئینہ تلمذ کو محسوس نہیں کرتا۔ وہ دہانہ پھاڑ کر ہفتا ہے اور رابرٹ کو ایک راز کی بات بتاتا ہے کہ مسلمان عورتوں کے ساتھ یہ حکمت جائز ہے کیونکہ ممکن ہے کہ سرکار کے خواجے کو دھوکہ دیتے کے لیے انھوں نے اپنے برقوں کے اندر بال چھایا ہوا ہو۔

برقعہ کے اندر اچھی طرح ٹول کر کشم ہاؤس کا جوان سال افسر ناک بھنوں چڑھاتا ہے اور اپنے پاس کھڑے ہوتے دردی پوش سپاہی کو حکم دیتا ہے۔ "رام لال! جانے دو۔ وہاں پلے آموں کے سوا کچھ نہیں۔ جاؤ گڑوی میں پانی لاڈ اور میرے ہاتھ دھلا دیخواہ مجھوں بد منہ ہو گئے صبح صبح"۔

دوسرے ٹانگے میں ایک شخص واڈیا مچار ہاتھا کر وہ اپنے بیگوں کے لیے سیاکوٹ سے سیر بھر مٹھائی لیتا آیا ہے۔ اب کشم دا لے ڈیڑھ روپیہ کی مٹھائی پر پا۔ آئے محصول طلب کر رہے ہیں۔ اس بارے پنچھے کے لیے وہ ٹانگے میں بیٹھے پنچھے جتنی مٹھائی کھا سکتا ہے کھا لیتا ہے۔ اور باقی ماندہ پر اس پاس منڈلاتے ہوتے دردی پوش سپاہی ہاتھ صاف کرتے ہیں۔

جب رابرٹ لانگ والے ٹانگے کی باری آتی ہے تو حکیم گوراندہ مل ہاتھ جو ڈر کر کشم ہاؤس کے جوان سال افسر کو سلام کرتا ہے کیلاش جی نہستے۔ یہ صاحب بہادر رینڈیہ ستے آئے ہیں۔ شاید سرکار کے لیے ضروری کاغذات لاتے ہوں۔ معلوم نہیں گیسٹ ہاؤس کا کیا راجح ہاں کیوں نہیں پہنچی۔ جب سے سرکار نے کنیل عدالت خان کو گیسٹ ہاؤس کا انچارج بنایا ہے۔ سارا انتظام ہی درہم برہم ہو گیا ہے۔ خیر میں دکان پر پنچھے ہی سارا انتظام کر دوں گا۔ بھلا سوچیے تو سی کیلاش جی۔ ہم سرکار کی بدنامی کیسے برداشت کر سکتے

میں۔ اچھا کیلاش جی نہستے۔

کیلاش اپنی فیڈت ہیئت اٹھا کر رابرٹ لانگ کو سلام کرتا ہے۔ اور ان کا مانگہ بڑی عزت اور رعوب کے ساتھ کشم ہاؤس سے روانہ ہوتا ہے۔ رابرٹ لانگ حکم گواہندہ نہ مل کے سفید جھوٹ پر کسی تسلیم کا احتجاج نہیں کرتا۔ کیونکہ یہ چال چلنے سے اس کے دوکھیرے، نصف درجن فلمیں، ڈور بین اور دیگر بہت سی اشیاء بھی بڑی صفائی کے ساتھ کشم کے جھنجھٹ سے بچنے ملکتی ہیں۔

ڈاک بندگوں پہنچ کر حرب رابرٹ لانگ شیلو اور غسل سے فارغ ہوا تو حسن علی خان سامان  
اپنی کتاب اٹھاتے اس سے ناشدہ، بچ اور ڈنر کا آرڈر لینے آیا۔

”جناب بریک فاست پر پور بچ، ٹوست، مکھن، جیم، چائے یا کافی اور فروٹ  
تیار ہو گا۔ صاحب ائمہ ابوائل مانگتا یا فرانی؟“ حسن علی خان سامان بچے اور زبان کے حساب  
سے جان میفرسن کے بیرے افضل کی برادری کا قریبی رشتہ دار معلوم ہوتا ہے۔

راابرٹ لانگ نے کافی اور تک ہوئے امدوں کی فرماش کی۔

بچ کے لیے حسن علی خان سامان نے سوپ، مچل، کولڈ ٹھن، سبزی، پلاقوں نامزدی ڈنر  
اور کافی کا حکم لگایا۔

راابرٹ لانگ نے تسلیم حکم کیا۔

جب ڈنر کی باری آئی تو حسن علی خان سامان اچکن کی بیٹھی پر با تھباندھ کے رابرٹ لانگ  
کے حکم کے انتظار میں ہمہ تن گوش کھڑا ہو گیا۔

راابرٹ لانگ بھی سنبھل کر سیدھا ہو گیا۔ معاں سے شاہد کی بات یاد آئی کہ جھوں اور شیرہ  
کے ڈاک بندگوں میں ڈنر کے ہر کو رس میں ایک نیار و مان پوشیدہ ہوتا ہے۔ چنانچہ جب چکن  
کا حکم دیا جاتے تو خان سامان محض مرغی پکانے کے ہے۔ لیکن اگر چوڑے کی فرماش ہو تو ۵۰ یا ۶۰  
برس کی تازہ چھوکری حاضر ہوتی ہے اور مرغی مانگنے کے تو اس سے زیادہ ہر عمر اور ہر سائز کی

عورت ملتی ہے۔ رابرٹ لانگ کے چہرے پر شرارت کی سکراہٹ پیدا ہوئی اور اس نے حسن علی خان سامان پر کچھ طبع آزمائی کا فیصلہ کر لیا۔

”خان سامان تحدی نام کیا ہے؟“ رابرٹ لانگ نے کچھ کچھ بیٹھکنی کی ابتدائی۔

”صاحب، ہمارا نام حسن علی خان خان سامان ولد جشن علی خان خان سامان ہے تین لپشت سے ہم برابر اس ڈاک بیٹگلے میں کام کرتا ہے؛ حسن علی اپنے نام کے ساتھ خان القزام سے لکھا تھا۔ جیسے شاعر غلچس کو استعمال کرتا ہے۔“

”بہت خوب انہم بڑے خاندانی شخص نظر آتے ہو؟“

”ہمارا کیا منہ، جناب! ہم تو صاحب لوگ کی خدمت کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ آپ کی دعا سے تین لپشت سے پیلس کاسارا پسلائی تجھی برابر ہمارے ہاتھ سے جاتا ہے۔“

”آہا، پھر تو تم بڑے کار آمد اور ستر بکار انسان ہو۔“ رابرٹ لانگ نے خان سامان کو نشیونی۔

”صاحب! ہم اپنے منہ سے کیا بول سکتا ہے۔ ہم صاحب لوگ کا خدمت برابر اپنا

فرض سمجھتا ہے؟“

”اچھا تو خان سامان، پیلس میں چوزہ زیادہ چلتا ہے یا سرخی؟“ رابرٹ لانگ نے دریافت کیا۔

اس سوال پر خان سامان ذر سنبھل کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کن انکھیوں سے بغور رابرٹ لانگ کا جائزہ لینے لگا۔ رابرٹ اس کی بچکچاہست کونٹاڑ گیا۔

”گھبراو نہیں، خان سامان!“ اس نے کہا۔ ”میں کوئی رینڈیڈنسی سے نہیں آیا بلکہ محض ایک ٹورست ہوں اور امریکہ میں نکھنے کا کام کرتا ہوں؛“

”صاحب امریکی ہے؟ صاحب ٹورست ہے؟ صاحب برلن کا صاحب رینڈی  
نہیں آیا؛“ خان سامان نے مزید اطمینان کے لیے تفتیش کی۔

”ہاں خانسماں اب تھارا خیال بالکل درست ہے“

اب حسن علی خاں نے کچھ اطمینان کا سائنس لیا۔ صاحب پوچھنا ملتا ہے کہ پیش میں  
مرغی زیادہ لگتا ہے یا معدود؟“  
”ہاں خانسماں بالکل ٹھیک“

جواب دیتے سے پہلے خانسماں نے بڑی احتیاط سے دائیں باتیں آگئے بچھے گھوم کر  
جاائزہ لیا کہ کوئی ان کی باتیں تو نہیں سن رہا۔ اس نے دیکھا کہ برآمدے میں گلا بموہر جھاڑو  
دیتے کے بہانے ان کی طرف لپکا۔ ”ختم خنزیر تم اس طرف اپنی ماں حرامزادی کے پاس آتا  
ہے؟ جاؤ دوسری طرف کام کرو۔ لعین۔ بے شرم کمیونہ؟“  
گلا بموہر سے نپٹ کر خانسماں والپس آیا اور دوبارہ گرد و بیش کا جائزہ لے کر اس  
نے رابرٹ لانگ کو اس بحید سے آگاہ کیا کہ ہمارا جسکے محل میں کم سن ٹرکیاں اور جوان  
عورتیں دونوں برابر کام کرتی ہیں۔

”صاحب پہلے ہم برابر مسلمان چھوکری سپلانی کرتا تھا کیونکہ اس وطن میں یہ جنس  
غیرستا ہے۔ اس دن سے ہم کو بہت منافع پختا تھا۔“ حسن علی خانسماں نے  
اپنے منہ پر زور سے تھپٹہ مار کر کہا۔ ”صاحب اس وقت ہم کافر تھا۔ ہم خنزیر سفا۔ ہم  
شیطان کا بچہ تھا۔ اپنی شان میں ہر لمحے پر خانسماں اپنے دائیں اور باتیں رخساروں پر  
اس زور سے تھپٹہ مار رہا تھا کہ اس کی آنکھوں سے بے اختیار پانی نکل آیا۔

”لیکن صاحب! باخدا اب ہم نے تو بکر لیا ہے؟“ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر  
کہا۔ ”اب ہم مسلمان چھوکری کو اپنا مام بہن سمجھتا ہے۔ اب ہم پیس سے لے کر ڈاکن بنگلے  
تک صرف ہندو چھوکری لگتا ہے۔ اس میں ہم کو منافع بہت کم پختا ہے۔ لیکن جناب  
پروا نہیں۔ اب ہم نے تو بکر لیا ہے۔ باخدا۔“ حسن علی خانسماں نے کندھے پر سے کاپیاں  
صاف کرنے والی اسکو چھا اتار کر پہلے اس سے آنکھیں پوچھیں اور پھر اس میں زور سے اپنی

نگ صاف کی۔

”صاحب جب حق تعالیٰ سے ہمارا حساب ہے باقی ہو جائے گا تو ہم فوڑا یہ دھندا چھپوڑے گا۔ صاحب ہم ہجرت کر کے مدینہ شریف چلا جاتے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک پر سڑک پٹک کے اپنا گناہ کامعاںی مانگے گا۔ صاحب ہم طامزوی گنگا رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر حسن علی نے شہادت کی انکھیاں ملا کر چما اور بُری عقیدت سے اپنی انکھوں پر لگایا۔

عورتوں کی ولائی اور روحانیت کے ذکر کے بعد حسن علی خان سماں نے سیاحت کی طرف توجہ مبذول کی اور بڑے بڑے راز دار نہ لجھے میں رابرٹ لانگ کو آگاہ کیا کہ پہلے وہ نیشنل تھا، لیکن اب مسلم کا فرنی ہے۔ ”صاحب جب حضرت جناح صاحب جمتوں شریف لایا تھا تو اللہ تعالیٰ کی برکت سے اس ڈاک بنسکے میں ٹھہرا تھا۔ صاحب ہم نے خود اپنے ہاتھ سے حضرت جناح صاحب کا کھانا پاکیا تھا اور بوٹ صاف کیا تھا اور سوت پر اتری کیا تھا۔ حسن علی خاں نے اپنے ہاتھ اٹھا کر انھیں بڑے پیار سے دیکھا اور پھر انھیں اپنی سفید دار صھی پر ملا۔

ان ایشافتات کے بعد حسن علی خاں خان سماں نے ایک بار پھر رکابیاں صاف کرنے والے انگوچھے سے نگ صاف کی اور پھر چکن اور پیشی کو درست کر کے اپنے آبائی انداز میں کھڑا ہو گیا۔

”صاحب، آج رات جناب ڈنر پر چکن مانگتا یا چڑھا مانگتا یا سر غنی مانگتا؟ ہم ہر چیز صاحب کی سرضی کے موافق بیش کرے گا؟“ اس نے دریافت کیا۔  
رابرٹ نے صرف چکن کی فرمائش کی۔

اُرڈر یعنی کے بعد جب خان سماں رابرٹ کے کمرے سے نکلا تو اس نے دیکھا کہ گلابیو مہتر دروازے کے پیچے دیوار کے ساتھ چپکا کھڑا ہے جس علی نے پاک کر اس کو

گردن سے پر ڈیا اور اس کے منہ پر زور زور کے طما پخوں اور گھوٹسوں کی بارش بر سلنے لگا۔  
جب اس کے ہاتھ تھک گئے تو اس نے حسب توفیق پاؤں سے بھی گلا بُو جھنگی کی مرمت  
کی لیکن یہ حرہ کچھ زیادہ کام نہ آیا۔ بیونکہ حسن خان سامان ایک ٹانگ سے نگذاشتا۔  
مار کھانے کے بعد گلا بُو مہتر نے اٹبینان کی سائنس لی۔ اور خان سامان کے پاؤں پر سر  
رکھ کر گڑ کر ڈاک کر لیا۔ خان سامان جی، اب تو اس غریب پر عمر بانی کرو۔ تمہارے سر کی گود  
اب تو نتھیا بالکل تیار ہے۔“

تھم خنزیر، ابھی اس کا عمر بارہ برس ہے۔ تم اس کو کیسے تیار بولتا ہے؟ دو برس اور  
صبر کر د۔ قانون میں لڑکی ۲۳ برس سے پہلے بالغ نہیں ہوتا۔“  
گلا بُو مہتر نے کچھ اور گڑ گلا ناچاہا۔ لیکن حسن علی خان سامان نے اس کے منہ پر ٹھوک کر  
خاموش کر دیا۔ حرامزادے کے نچے، تم ہم کو جیل بھینجا چاہتے ہے؟ ہم نا بالغ چھوکری کو  
ثرا ب کر کے اپنی عاقبت نہیں بھاڑے گا.....؟

خان سامان بُر بڑا تھا، لندگا تھا، اور اپاں سے چل دیا لیکن گلا بُو مہتر اپنی جگہ کھڑا رہا۔  
دیتک اسے حسرت دیاں سے دیکھتا رہا۔ نتھیا اس کی پانچ بیشیوں میں سب سے بڑی  
لڑکی بنتی۔ اور کالوں اسے بڑے ارمانوں سے پلا سکتا۔ زندگی کا ہر سال جو نتھیا کے خون میں گئی  
اوہ اس کے بڑھنے ہوتے جسم میں تناو پیدا کرتا تھا۔ کالوکے لیے بڑی خوش آئند توقعات کا  
پیش نہیں ہوتا تھا۔ نتھیا سارے خاندان کی امیتیوں کا سہارا تھی۔ جب وہ بوان ہو گئی تو حسن علی  
خان سامان کی مدد سے وہ ضرور ڈاک بنگلے میں دھنڈے پر لگ جاتے گی۔ پھر تو اس گلا بُو کے  
دین بھی پھر جائیں گے۔ وہ تو نزکی چھوڑ کر چین کی بنیسی بجا تے گا اور دن رات جی کھول کر  
اپنی محبوب چرس پیا کرے گا۔ نتھیا کی کمائی سے اس کی چار چھوٹی بیسوں کی بیاہ شادی کا سامان  
بھی ہو جاتے گا اور شاید نتھیا کی ماں کا علاج بھی ہو جاتے جو کتنی برس سے چار پانچ پر گنگی تپتی ق  
کے مرض میں گھٹ کھل کر دم توڑ رہی ہے۔ وہ نتھیا کی جوانی کا بڑے شوق اور بڑی بے صبری

سے منتظر تھا جس طرح آم بھینے والا کچھے امور کو بھوس سے میں دبکران کے کنے کلہی قرار دی سے انتظار کرتا ہے۔

اس وقت گلاب بھنگی کو مداراج اور صیراج کے خدا نے سے مبلغ سات روپے آٹھ آنے ماہوار ملتے تھے پچھے سال جب سرکار ولایت سے پولکا میج جیت کر والپس آئے تھے تو اس خوشی کی یاد کریں اس کی تنخواہ میں چار آنے ماہوار کا اضافہ بھی ہوا تھا لیکن ان پر نے آٹھ روپوں میں سے بارہ آنے میں پسلٹی کا دروغہ وصول کر لیا کرتا تھا۔ ایک دبیہ سونے کے ملسوں والے رگونا تھے مندر کے مکار و حرم ارتحمیں داخل ہو جاتا تھا اور باقی چھ روپوں میں نتو گلاب بوجی بھر کر چرس لٹتی تھی۔ نہ اس کی میشیوں کی شادی بیاہ کا سامان ہوتا تھا اور نہ ہی اس کی مدقوق بیوی کا علاج ممکن تھا جنما پچھے گلاب بھنگی اور اس کا سارا خاندان کچھ عرصہ سے گلاب بوجی یہ دیکھ دیکھ کر باخ باغ ہو رہا تھا کہ تھیا کا جسم جوانی کے تباہ سے لکان کی طرح کچھ گلیا تھا۔ اس کی بیاہ جلد کے نیچے گرم گرم خون کی سرخی بخش کھارہ ہی تھی۔ اس کی اٹھیں بیفارام تھوڑی رہنے لگی تھیں۔ اور چال میں بھی ایک مستانہ سی لچک اور بے باکی آگئی تھی۔ یہ علامات گلاب بوجی کے مستقبل کا پیش خیر تھیں۔ لیکن خانسماں کی بالوں نے اس کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ وہ حرامزادہ اسے ابھی دو برس اور صبر کرنے کی تلقین کر رہا تھا۔

اگرچہ جب پشاپریلی بار پلیس گئی تھی تو اس کی عمر گیارہ برس سے ایک دن بھی زیادہ نہ تھی اور کملا اور نیکا اور شانتی اور پریتم اور جتنا..... اور یوں بھی گلاب بوجہتر کو نہ لانے کے اس عجیب انصاف پر ٹرا غصہ ایک کہ قانون میں لا کی ۳۰ برس سے پہلے جوان ہی نہیں ہو سکتی۔ کاش کہ قانون بنانے والوں نے ایک نظر اس کی تھیا کو بھی دیکھا ہوتا۔

## پھوڑے والی طاںگ

نندہ بس سروس کی جس اسٹیشن ویگن میں رابرٹ لانگ کو جگہ ملی۔ اس میں پانچ سواریاں اور بھی تھیں۔ پرانس آف دبلن کالج جگتوں کے ایک کشمیری پنڈت پروفیسر صاحب تھے جو کالج میں گرمیوں کی چھٹیاں ہونے پر سری نجگوار ہے ہیں۔ ان کے ساتھ ان کی پنڈتیہ بیوی صاحب تھیں۔ اگرچہ اس وقت جھوٹ میں کوتی ۱۰۰ اور جگہ گرمی تھی لیکن حفظِ ماقدم کے طور پر پروفیسر صاحب نے نسواری رنگ کے پٹو کا چوڑی دار پاجامہ، اس کا ہم رنگ مگلے کا گرم کوٹ اور سر پاؤ نیکنٹوپ پہنا ہوا اتنا۔ کندھوں پر اعلیٰ الشیخیت کی تھتی رنگ کی کاڑھی ہوئی چاہر تھی۔ پروفیسر صاحب کے کوٹ کی جیسیں پھول کر یا ہنگلی ہوئی تھیں۔ ایک میں نمک، الچھی، سیاہ مرچ، ادک، لونگ اور دارچینی کی پٹیاں تھیں۔ دوسرا جیب میں لیبوں اور امرت دھارے کی شیشیوں کے قلبے تھے۔ یہ انتظامات پروفیسر صاحب کی بیوی کے لیے تھے جسے بانہال روڈ کے پے دار پے موڑوں پر شدید چکرایا کرنے تھے۔ پنڈتیہ نے سفید لٹھے کا فرن پہنا ہوا احتاج کلیسا نی راہباؤں کے لبادے کی طرح

ٹھنڈوں ٹھنڈوں تک آتا تھا۔ پاؤں میں لکڑی کی کھڑاویں تھیں۔ سر پر گھرے سُرخ پیشہ کی خوبصورت  
چادر تھی جس کے بینچے سے اس کی دراز زلفوں کا جوڑا سانپ کے بھین کی طرح جھانکتا تھا۔  
ان کی عکولی تیس برس کے قریب ہوگی۔ رنگ گورا تھا جس میں مکلاںی رنگ کی بلکی سی  
تری ری جھلک رہی تھی۔ جھوٹوں کی تمازت سے رخساروں کے مغلاب مر جاتے تھے۔  
اب سر پیغمبر پختے ہی ان پر تازگی آ جاتے گی اور اس کے گال پھر کا نگڑی میں دھکتے ہیں  
کوتلوں کی طرح تمنا نے ٹگیں گے۔ پنڈتانی کے چہرے پر سب سے نمایاں چیز اس کی ناک  
اور آنکھیں تھیں۔ اس کی ستواں ناک میں ایک ناقابل بیان نزاکت تھی، جیسے دودھی  
بلور کو تراش کرائے سانچے میں ڈھالا گیا ہو۔ اس کی گہری نیلگوں انکھوں میں طہیں  
حرن تھا۔ جیسے سکوت شام میں کسی دور دراز بھیل پسکون کی اداسی چھاتی ہوئی ہو۔  
ماتھے پر شقد تھا۔ ناگ میں سماں کے سیندوں کی لکیر تھی اور روٹوں پر اخروٹ کے چھلکے  
کی سُرخی کبوتر کے خلن کی طرح چمک رہی تھی۔ پنڈتانی کے ہاتھ میں سُرخ، سبزادہ نیلے  
ابرک سے منڈھی ہوئی ایک کا نگڑی تھی۔ اس میں وہ گھرے راکھ بھر کے لائی تھی تاکہ  
بانہال برٹک کے موڑوں پر جب اس کا جی متلاستے تو وہ آسانی سے اس میں قے کرے۔  
اسی شیشن فیگن میں پرنس عبدالحیم سمرقندی بھی تھے۔ ان کے ساتھ ان کی  
بیگم صاحبہ کے علاوہ ایک حسین وحیل جوان پارسی خاتون تھی۔ اس کا نام بولو تھا اور  
وہ پرنس سمرقندی کے ساتھ مسوروی سے ہمارا جہنمادر کے نہمان کی جیشیت سے کشمیر  
میں موسم گرگزارنے آ رہی تھی۔

پرنس عبدالحیم سمرقندی نے گیبریلین کی جودھی پر بس اور بندہ لگلے کا کوٹ پہننا چڑا  
تھا۔ سر پر پہنکے فاختی رنگ کی فیلٹہ ہبیت تھی۔ جس پر موتیوں اور ہیروں سے جڑا ہوا  
مور کے پر کا برقچ آؤزیں تھا۔ پرنس سمرقندی کی عین بتائیں برس سے زیادہ نہ تھی لیکن  
دیکھنے میں وہ کافی عمر نظر آتے تھے۔ ان کے سُرخ دسفید چہرے پر رشیم کے سلوٹوں کی

طرح جھپڑاں ہی جھپڑاں تھیں اور انہوں کے پتوں کے نیچے سیاہی مائل حلقوں کے درمیان سوچے ہوئے گوشت کی تھیلیاں سی لٹک رہی تھیں۔ اگر غور سے نظر جما کر دیکھا جاتے تو پنس سر قندی کے ہاتھوں میں رعشہ کی ہلکی سی کپکاپا ہٹ بھی تھی یہ سے چھپا نے کے لیے وہ باتیں کرتے وقت اپنے ہاتھوں کو بار بار بڑے ڈراماتی اندازیں جھکھا کرتے تھے۔ جب وہ باتیں نکر رہے ہوں تو ان کے ہاتھ عموماً ایک خوبصورت ریشمی اسکارف سے کھیلتے رہتے تھے جو در وقت اس مقصد کے لیے ان کی جیب میں موجود رہتا تھا۔

بیکم سر قندی کی عمر اپنے خاوند سے کوئی دس برس کم تھی۔ لیکن شکل و شاباہست سے وہ چھیس پھیبیں برس کی نوجیز دلمن سے زیادہ نظر آتی تھی۔ اس کا قد سرو کی طرح بلند اور جسم چنان کی طرح سخا۔ انھیں بڑی بڑی غزالی تھیں جلدیں ایلین قالین عن ایسی زرمی اور دبازت کا احساس تھا۔ اور رخسار قندھاری اناروں کی طرح دیکھتے تھے۔ بیکم سر قندی کے بال کمر تک لمبے تھے۔ اور وہ انھیں بڑی خوبصورتی سے گھندا چھوڑ دیتی تھی۔ اس کے سراپا میں جوانی اور صحت اور لشوائیت کی بڑی دلکش تکمیل نظر آتی تھی۔

پونس عبدالحیم سر قندی نے اپنا شجرہ نسب اصلی اگرث پیر پسندری حروف بیکھپولیا ہوا تھا۔ جس کے مطابق ان کا حسب نسب چنڈ پشت پہلے سر قندھار کے شایخ خاندان کے ساتھ ملتا تھا۔ جب ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کا آفتاب غروب ہوا۔ تو پنس عبدالحیم کے آبا اجداد غالباً اس ڈوبتی ہوئی مشتعلی کو سہارا دیینے کے لیے ہندوستان میں وارد ہوتے۔ یہاں انگریزوں نے کمپنی بھادر کے نیچے بڑے بڑے عدےے حاصل کیے ان کی دانست میں کمپنی بھادر مکہ و کثوریہ اعظم کے فرزند رجمند کا اسم گرامی تھا جو اپنے والہ ماجدہ کا سکھ چلانے کے لیے پنفس نفسیں ہندوستان پھیجھے گئے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ جب

انھیں معلوم ہوا کہ مپنی ہمارے توجوں کی ایک جماعت کا نام ہے، تو اس کی ملازمت کو انھوں نے اپنی شاہی خاندان کے روایات کے مٹانی سمجھ کر ایسٹ انڈیا مپنی کو تحریر ہاد کہا، اور سنوستانی راجوں ہمارا جوں سے تعلقات پیدا ہیں۔ یہاں بھی انھیں خاطر خواہ کامیابی نصیب ہوتی۔ چنانچہ پنس عبدالرحیم سمرقندی اب تک بڑی وفاداری سے پنے خاندان کی روایات پر گامزد تھے اور ہمارا جگہان کشمیر ٹیپیالہ، الور، جے پور، بیکاریز وغیرہ سے ان کے بڑے گھر سے تعلقات تھے۔ ان میں سب سے زیادہ لگاؤ انھیں حملہ کشمیر کے ہمارا جوں کے ساتھ تھا اور وہ کچھلے تائیں برس سے بابر اس کی مصاحبۃ میں چلے آ رہے تھے۔ اس وفاداری اور دوستی کے صدر میں سرکار نے انھیں سرٹیکس کے قریب ایک دیسخ و عریض باغ، ایک شاندار کوٹھی، دو پیکار ڈسٹرکٹوں کے علاوہ دربار میں کرسی فشین درجہ اول کا اعزاز عطا فرمایا تھا۔

راجوں ہمارا جوں کی بارہی میں پنس عبدالرحیم سمرقندی کی بڑی مانگ تھی۔ ایک ماہرا درجذی دیشی درباری ہونے کے علاوہ وہ ایک اچھے دوست اور وفادار ساتھی بھی تھے اور ان کے کمالات کا شہرہ یورپ اور ہندوستان کے شاہی حلقوں میں عام تھا۔ ہمارا جگہان اور ہمارانیوں کی مشکلات اور ضروریات کو فوراً جہاں پ جانا اور پیش نہیں میں ان کے حل فراہم کر دینا ان کے بایں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ہمارا جوں کی ضروریات کے پیش نظر پنس عبدالرحیم سمرقندی نے ان کو یہ مشورہ دیا تھا کہ ریاست میں ہر سامی کے لیے دنخواست کے ساتھ امتیزداروں کی تازہ ترین فوٹو بھی ضرور آنا چاہیے۔ یہیں مشورہ کچھ ایسا کار آمد ثابت ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے راج پلچھتیس گڑھ اور ایشڑن ٹشیں ایکسی کے سب راجوں اور رانیوں نے اس رسم کو بڑے شد و مد سے اپنالیا۔

ہمارا ج ٹیپیالہ کی اکتا لیسوں سالگرہ پر پنس عبدالرحیم سمرقندی نے انھیں ایک بھلی کی مشین تحفہ دی تھی۔ جو انھوں نے خاص فرماںش کر کے پیرس میں بنوائی تھی۔ اس مشین

کی مدد سے ہمارا جو صاحب اتنا لیس سال کی عمر میں بھی گیارہ عورتوں کی طیم کے ساتھ دیڑھ دیڑھ گھنٹے فٹ پال کا سچ کھیل سکتے تھے۔ یوں بھی شاہی خاندانوں پر پنس سمر قندی کا فیض، بڑا عام تھا۔ باخچہ ہمارائیوں اور پیدائشی نام و ہمارا جوں کے ہاں ولی عہد پیدا کرنا ان کا خاص کمال تھا۔ جس کی برکت سے وہ ہندوستان کے بے شمار شاہی خاندانوں کی نسل برقرار رکھنے کے ذمہ دار تھے۔ ریاست جموں و کشمیر پر بھی ان کا بڑا احسان تھا۔ جب جنہوں نے ہمارا جو بہادر کی عمر چالیس برس ہونے کو آئی اور یہکے بعد دیگرے چار ہمارائیوں کے باوجود راج محل میں ولی عہد کے کوئی انتشار نظر نہ آئے، تو راج دربار میں بڑی تشویش پیدا ہونے لگی۔ خاندان کی بڑی بڑھیوں نے ہر دوار جاکر حلپر کشی کی۔ راج گرد نے سونے اور چاندی کی جھنکار سے اپنے سوتے ہوئے خداوں کو جگانے کی گوشش کی۔ سونے کے کلس والے رگھنا انتہمندر کے پھجایوں نے بھی حسبِ توفیق ہاتھ پاڑیں مارے۔ فرانس، ہجرتی، انگلستان اور امریکہ سے بڑے بڑے ڈاکٹر بھی آئے۔ ایک یوں گی کے کھنپنے پر خود ہمارا جو بہادر بھی صبح سویرے لنگوٹ باندھ کر شفی گھاس پر..... اُس کی مشق فرمانے لگے۔ لیکن شاہی نسل کے جو ناکے بندہ ہو چکے تھے، وہ بندہ ہی رہے۔ ساری ریاست کی ڈوگرہ اور راچپوت براوری پر مالیوسی کا عالم چھانے لگا۔ ولی عہد کا نہ ہونا زصرف راج گردی کے لیے پیچیدگیوں کا موجب ہو گا۔ بلکہ ڈوگرہ اور راچپوتوں کی مروانی پر بھی کلنک کا زبردست ٹیکا تھا۔ چوتھی ہمارائی کا ٹیکا کی تھی اور دہاں کے راچپوت ابھی سے جموں کے ڈوگرہ راچپوتوں پر طعن و تشنیع پر آتا تھا۔ اس نازک وقت پر پنس عبدالرحیم سمر قندی نے اپنی کرامت دکھانی اور ہمارائی شارادبیوی کے بطن سے ایک خالص سو فیصدی راچپوت خون والا ولی عہد براہم کے انخوں نے ریاست جموں و کشمیر کے ڈوگروں کی لاج رکھ لی۔ یہ معجزہ پیرس میں سرخجام دیا گیا تھا اور اس کی برکت سے ہمارا جو کبیل راج ہمارائی کو بیٹا۔ ٹھاکر جموں سنگھ کو دیڑھ لاکھ سالا نہ جاگیر اور پنس عبدالرحیم سمر قندی کو سری نگر کو بیٹا۔

کے مضافات میں پھولوں اور پھلوں کے وسیع باغات عطا ہوتے رہتے۔

اسٹیشن ویجن میں داخل ہوتے ہی بیگم سمر قندی نے ناک بھنوں چڑھا کر احتیاج کیا ہڈوارانگ ہم اس کیاڑخانے میں کیسے سفر کریں گے؟ ہاتے میرا تو یہاں دم گھٹتا ہے۔ بیگم سمر قندی کے لمحے میں ایک خوبصورت سی بیگانگی تھی جو سمر قند اور خارا کے شاہی خاندان کے افراد کے لمحے میں بھر جال ہونی ہی چاہتی ہے۔

پرانس سمر قندی نے اپنی بیگم کو کم اور اسٹیشن ویجن کے دوسرے مسافروں کو زیادہ مخاطب کر کے اس بات کی صفائی پیش کی، کہ آج اپنی دودو پیکارڈ کاڑیاں پھپوڑ کر لائے کی اس ویجن پے سوار ہونے کے لیے کیوں مجبور ہوتے ہیں۔ ایک پیکارڈ جس پر وہ مسوی سے اُر ہے تھے جو تو پہنچ کر غراب ہو گئی۔ اگر وہ مسری نگر تبلیغون کر دیتے تو شام تک ان کی دوسری پیکارڈ بھی اچاقی۔ لیکن جتوں کی گرمی میں سارا دن کون بس رکتا ہے یوں بھی ان کے ایک اشارے پر صوبہ جتوں کے سارے افسر، چاگیر داہ، سفید پوش اور کرسی فشین اپنی موڑ کاڑیاں ان کی خدمت میں پیش کرنے میں بڑا فخر محسوس کرتے لیکن اپنے آرام کے لیے دوسروں کو تبلیغ پہنچانا ان کے اصول کے خلاف ہے۔ صاحبِ مہربان، صرف اُنہوں نو گھنٹے کی قوبات ہے۔ شام تک ہم لوگ مسری نگر پہنچ جائیں گے۔ اس وقت ناک جس طرح گواہ ہو سکے گزارا کرنا چاہیے؟

اس تقریر کے بعد انھوں نے مسافروں کے چھر سے پرائے ہوتے تاثرات کو غور سے بھانپا۔ کشمیری پنڈت پروفیسر صاحب نے ان کا رتبہ پہچان کر پرانس عبدالحیم سمر قندی کو خوب جھک کر سلام کیا۔ خادنکا اشارہ پاکران کی پنڈتی نے بھجو اپنے مرمریں مخدوٹی ہاتھ جوڑ کر بیگم سمر قندی کو پر نام کیا اور وہ دلوں میاں ہیوچیلی سبیٹ پر یوں سمت کر بیٹھ گئے، جیسا انھوں نے ویجن پے سوار ہو کر پرانس سمر قندی کی شان میں کوئی بڑی گستاخی کی ہو۔

را برٹ لانگ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ جہاں سفید چڑی سے  
واسطہ ہو۔ وہاں پرنس سمر قندی ایک مختلف  
چنانچہ انہوں نے خود پیش قدمی کر کے رابرٹ کے ساتھ اپنا تعارف کرایا۔ اور ہبڑی  
نیازمندی سے معدودت کی کہ ان کے ساتھ زیادہ سامان ہونے کی وجہ سے شاید  
اسے تکلیف ہوئی ہو۔ رابرٹ لانگ نے خوش اخلاقی سے انھیں یقین دلایا کہ اسے  
مطلقًا کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ اور حقیقت میں وہ بڑے آرام میں ہے۔ اس تعارف  
کے بعد پرنس سمر قندی نے رابرٹ لانگ کو کدر کے ڈاک ٹکالے میں اپنے ساتھ لے کھانے  
کے لیے مدعو کیا۔ بیگم سمر قندی نے بھی تائید کی اور رابرٹ نے شکریہ کے ساتھ دعوت  
قبول کر لی۔

جمتوں شہر سے نکل کر جب گاڑی مہاراجہ بھادر کے موسم سرما کے محلات کے قریب  
پہنچی۔ تو پرنس سمر قندی نے ٹلایا یور کو حکم دیا کہ تعظیماً اس مقام پر گاڑی کی رفتار بہت کم  
ہوئی چاہیے۔ جب تک محلات کے سامنے سے گزرتی رہی۔ پرنس سمر قندی اپنی فلیٹ  
بیٹھ باختہ میں رہیں گے مدد بانی بیٹھے رہے۔ بیگم سمر قندی نے بڑے شوق سے بولو کو سرکار  
کے بیٹھنے، کھانے، اور سونے کے کروں کی کھر کیاں دکھائیں۔ کشمیری پنڈت پروفیسر صاحب  
نے رومال منڈ کے سامنے کر کے پرنس سمر قندی کے اس اظہار دفادری پر خوب ناک  
چڑھائی، اور کہنی مار کر اپنی جیوی کو بھی یہ تماشا دیکھنے کی تلقین کی، لیکن بیچاری پنڈت تانی یہ  
منظرنہ دیکھ سکی، کیونکہ وہ اپنے فری کے گریبان میں منہ ڈال کر کانگڑی میں بڑی شدت  
کے ساتھ قے کرنے میں مصروف تھی۔

جمتوں سے اوصم پور تک بے آب و گیاہ پہاڑوں کا سلسہ لکھہ تھا۔ نزیبادہ چڑھائی  
تھی، نہ اُڑتا۔ لیکن مرٹک بڑی پیچیدہ اور گنگریاںے بالوں کی طرح بل کھاتی ہوئی جا رہی تھی۔  
کہیں کہیں بجیاں پہاڑ کی ڈھلوان پر جھاڑیاں چرتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ کہیں کہیں

اچانک کوئی پہاڑی جھننا آ جاتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں چنانوں پر ایسا جو دھپایا ہوا تھا۔ ہمیتوں میں خوشخواص صورت اور بڑی بڑی منچھوں والے ڈوگرے بیٹھے چلپی رہتے تھے۔ یا اپنے جو تے ہاتھوں میں اٹھاتے نگے پاؤں مٹرگشتی میں مصروف تھے کبھی کبھی کسی پہنچنے والی یا سوڑ پر اچانک کوئی ڈوگری آ جاتی تھی تو فضائیں ایکس بھلی سی کونہ جاتی تھی۔ لانبے لانبے قد رنگ برنگے چیخت کرتے، سدول ٹانگوں پر سانس کی طرح بل کھاتے ہوئے چوری دار پا جائے۔ قوس قزح کی طرح فضائیں لمبائی ہوئی رنگین پیڑیاں گدوگوڑا رنگ، تین تیر عقابی آنکھیں۔ اس حسن میں ایک عجیب جلال تھا۔ سر پر دودھ کی مشکیاں یا لکڑی کے گھٹھے اٹھاتے جب یہ ڈوگریاں مستانہ چال سے پہاڑی پہنچنے والیوں پر چلتی ہیں تو فضائیں ایک ارتعاش سا چھا جاتا تھا۔ پرانس سمر قندی بڑی فصاحت اور بلاغت سے ڈوگری نسل کی فضیلیت پر تبصرہ کر رہے تھے۔ کیوں کہ حضور مہاراجہ بہادر بھی اسی نسل کے چشم و حراغ تھے۔ دو مردان صاحب یہ سمجھ لو کر دنیا میں بس دو خاندانوں کا خون اب تک ناپاک نہیں ہوا۔ ایک تو سرکار کا خاندان مبارک ہے اور صاحب مہراں دوسری خاندان شہزادگان سمر قندی کا ہے۔ ڈوگرہ نسل گنگا جل کی طرح پوتا ہے۔ اور خان صاحب مہراں، شاہزادگان سمر قندی کا خون آب نہ زرم کی طرح مصقا ہے.....؟

پرانس عبدالرحمیں سمر قندی نے جموں شہر سے نکلتے ہی اپنے ہمینڈبیگ سے کاک ٹیلشیکر، جن، بیڑزا اور ستروں کی بوئیں بکالی تھیں اور خانم سمر قندی تھوڑے تھوڑے دتفہ کے بعد اپنے سرتاچ کو لندید سے لذید کاک ٹیل تیار کر کے پیش کر رہی تھی..... پرانس سمر قندی بڑی فصاحت سے سرکار کے شکار کے شوق کی داستانیں سناتے تھے۔ جب انھوں نے سرکار کے بیٹے سور، شیر، چیتے اور بیچھوڑ کے شکار کے لا جواب انتظامات لیکے تھے۔ کوئی آرھی درجن نوش جان فرمائے پرانس سمر قندی نے سرکار کو تھوڑے کر لولوکی طرف رجوع کیا، ہجو بیڑزا کے حالم میں مبیٹھی مہاراجہ کے شکار کی تفصیلات اور خانم سمر قندی سے

مہاراجہ کے محلات کے مختلف کروں کی کلرکسیم، فرنچر، قالینوں اور پروڈوں کے حالات میں شن رہی تھی۔ اُنھے کی تریگاں میں اُگر پرنس سمر قندی نے لوو کے دامیں رخسار کے تل پر انگلی رکھ کے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بڑی رقت سے فرما�ا:

”صاحب مہربان! اس دل آدیز تل کی کیا بات ہے۔ لوو میری جان!

ہمارے آبا اور اجداد نے تمہارے اس خال پرنس سمر قند اور بخارا کی پادشاہی

قریان کر دی تھی۔ ہمارے صاحب مہربان! بخال ہندو شہنشہم۔ سمر قند و

بخارا!

لوو نے غصتے سے پرنس سمر قندی کا ہاتھ ایک طرف جھٹک دیا اور احتجاجاں کی بیوی کی طرف دیکھا۔ خانم عسکرانے لگی: ”لوو! تو ان کی باتوں کا خیال نہ کر، یہ تو تیرے باپ کی جگہ ہیں۔ ایسے ہی مذاق کرنا تو ان کی عادت ہے۔ سرکار کو ان کا مذاق بہت پسند ہے۔ ایک روز انھوں نے سرکار کے سامنے ہر راتی نس کو چوم لیا تھا۔ پیس میں بڑا شور ہوا، لیکن سرکار نے کہا، کوئی بات نہیں، پرنس سمر قندی تو مہارانی کا جانی ہے.....“

لیکن لوو پر ان دلائل نے کچھ اثر نہ کیا۔ پرنس سمر قندی اب اس کے رخسار کے تل سے ہٹ کر کی گولائی ناپسے پا تر آئے تھے اور اس عمل میں بار بار اسے اپنی گود میں بھانے کی گوشش کر رہے تھے۔ برسر عام یہ انہما عشق دیکھ کر لوو کا منہ غصتے سے لال ہو گیا۔ اس نے ہاتھ گھا کر پرنس سمر قندی کے منہ پر ایک زتابے کا طباخچہ رسید کیا اور ”اوہ یو ڈیم سوان،“ کہتی ہوئی ان کے پاس سے اٹھ کر دوسرا سیٹ پر آیا۔

لوو کے طباخچے نے پرنس سمر قندی پر خاطر خواہ اٹر کیا۔ یکے بعد دیگرے دو اور کاک ٹیل اپنے گلے میں انٹریل کر دہ اپنی خانم کے ساتھ پیٹ گئے اور اس کی گردان پر منہ رکھ کے بے اختیار رہنے لگے۔ خانم بڑی شفقت سے اس کا سر سولانے لگی اور رفتہ رفتہ ہچکیوں کے درمیان پرنس سمر قندی ایک معصوم پتھے کی طرح سو گئے۔ خانم نے ان کا

سرخی احتیاط سے اپنی گردن سے اٹھا کر اپنے زانوں پر رکھ دیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے سرفندی اس گدار تخلیق کیے پر لیٹے لیٹے خراٹے لینے لگے۔ خراٹوں کی شدت سے پرانہ سمر قندی کا جھوپڑا ندہ پھرہ ایک پڑا نے فٹ بال کی مانند پھیلتا اور سکرتا ہتا جس میں بڑی گوشش سے ہوا بھری جاتے، لیکن وہ ہر بار تکل جاتے۔ رخساروں اور ہونٹوں کے اس زیر دمہ کے ساتھ ان کے صنوعی دانتوں کا جبڑا بھی ڈھیلا ہو گیا تھا اور ہر خراٹے کے ساتھ یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ کھٹاک سے باہر آ پڑے گا۔ خانم سمر قندی نے اپنے لیشی دوپٹے کا پلو اپنے سر تاج کے چہرے پر ڈال دیا اور پھر ملامت سے پاؤں نکھوں سے لو لو کی طرف دیکھا۔

لوسویٹ کے کنارے یوں بیٹھی تھی۔ جیسے خطرہ کا اشارہ پاتے ہی اٹھ کر جلانے پر آمادہ ہو۔ غصے سے اس کا جھرو تناہ ہوا تھا اور اس کے رنگ کی قدر تی پہلا ہشت میں اب ایک ہلکی قمزی جھلک بھی نمایاں تھی۔ خانم سمر قندی کو اپنی طرف گھوڑتے دیکھ کر لو لو نے خود بھی پیش قدمی کی۔ مجھے افسوس ہے لاشی۔ لیکن یہی سری نگر نہیں جانا چاہتی۔ میں کہ کسی بیس پر والپس آ جاؤں گی؟

لوکا عرم سن کر خانم سمر قندی کی آنکھوں سے ملامت کی خشونت یوں غائب ہو گئی جیسے ابلتی ہوئی ہٹھیا کی بھاپ ہوا میں اسکی کیا یہ تخلیق ہو جاتی ہے۔ ملامت کی جگہ اب اس کی آنکھوں میں لجاجت، خشامد اور عاجزی کے مرٹے مرٹے انسو آگئے۔ وہ جلدی سے اٹھی کلاؤ کو گلے سے لگائے۔ اس عمل میں اس سے سر تاج کا بھی خیال نہ ہا جو اس کے زانوں کے سیکھے پر ٹھکاتے مزے سے ٹپا سور ہاتھا۔ بیگم سمر قندی جب مرعت سے اٹھی تو پرانہ سمر قندی کا سرتبوز کی طرح ہوا میں اچھل کر پہلے سیٹ کے گذے پر گرا اور پھر کے سیٹ کی چوبی پشت کے ساتھ کٹاک سے ٹھکرا۔ لیکن بیگم سمر قندی کے مشاق ہاتھوں کے بنائے ہوئے اٹھ کا کن ٹیکڑا کا نشہ اتنا کچا نہ

خاکہ اس مہمولی سے چھکلے سے ٹوٹ جانا۔

”میری پیاری ندو جان“ بیگم سمر قندی نے دلو کھنگلے سے لگا کر کہا ہوتا تھا اتنی سی بات پر لگائتیں۔ تو تم میرے منہ پر ختنے طلبانچے جی چاہے مار دو۔“  
بیگم سمر قندی نے اپنے گالوں کے تند حصاری انار دلو کے سامنے جھکا دیے لیکن یہ پیش کش بھی دلو کے غصہ کو ٹھٹھا نہ سکی۔

”میری جان دلو۔“ بیگم سمر قندی نے اب اپنی آواز میں رقت پیدا کر کے کہا ہوتا نے اس درد پیش کی بات کا بُرا مثالیا؟ دیکھو تو میرا فقیر کس طرح ایک بے ضر خرگوش کی طرح سویا پڑا ہے۔ میں نے پُرے پھیس سال اس کے ساتھ گزارے ہیں۔ خدا کی قسم، اس میں عورت کو ضرر بینچا نے کامادہ ہی نہیں۔ یہ کہہ کر بیگم سمر قندی نے دلو کو معنی خیر انداز سے چھنجھوڑا اور اپنا چنارا بیسا جسم تنان کو بھر بھری سی لی۔ اپنے خادم کی معصومیت کا دعویٰ کچھ بھوٹانہ تھا۔ کیونکہ بھیس سالہ ازدواجی زندگی کے باوجود پیش سمر قندی اپنے آبا و اجداد کی شاہی نسل برقرار رکھنے کے لیے کوئی صورت پیدا نہ کر سکے تھے۔ یہ بھی قدرت کی ستم ظریفی تھی کہ ہندوستانی ریاستوں کے لیے ولی عهد فراہم کرنے والا پرنس سمر قندی خود اس نعمت سے محروم تھا۔

پرانی سمر قندی کی جسمانی اور جنسی صلاحیتوں کا تفصیلات نے بھی دلو کے دل کو نرم نہ کیا۔ وہ بدستور منہ پھلائے مبیٹھی رہی اور کہتے کہیں بس پر والپس آنے کا دوبارہ اعلان کیا۔

دولوکی اس ضد نے خانم سمر قندی کے اعصاب کو شل کر دیا۔ اس کے جسم کے شاندار چنار پر پت بھڑکی سی ہے رونقی چھاگئی۔ آنکھوں کے بڑے پیالے میں آنسو چھکا آئے اور خانم سمر قندی کو اپنے شاہی خاندان کا مستقبل بڑا تاریک نظر آنے لگا۔ لیکا کیا جتنا کر کے انکھوں نے دلو کو سر کار کا مہمان بننے پر آمادہ کیا تھا۔ اب، اگر وہ بات

ہی میں واپس نوٹ گئی، تو وہ سری نگر جا کر سرکار کو کیا منزد کھائیں گے۔ اپنے خطوط میں انھوں نے لو لو کی دلاؤز رعنائی، اس کے چھر بھر سے بدن کی نزاکت اور اس کے لئے کی طرح دیکھنے زنگ کو نہ نہیں زادیوں سے میں کیا تھا۔ اور ان سرکار بڑی شدت سے اس کی آمد کا انتظار فرمائے ہوں گے۔ اگر لو لو سری نگر نہ گئی تو شاہزاد سمر قند کی تاریخی بناک کش جاتے گی۔ اور راج دربار میں ان کے رتبہ عالی کو بڑا صدم پہنچے گا۔ راج دربار کا متور تھا کہ ہر سال بہار کے موسم میں سرکار کے مقربین خاص بڑی جتو کے بعد جما راجہ بہادر کے بیٹے حسین وجیل محمدان لایا کرتے تھے جسنوں جما راجہ بہادر کی ذات مبارک تو افلاطونی عشق کی اس منزل پر پہنچ چکی تھی جسے مزا عالمت نے یوں ادا کیا ہے۔  
گھر ہاتھ میں جنبش نہیں آئنکھوں میں قوہم ہے

رہنے دا بھی ساغرو بینا میرے آگے

چنانچہ جنسی لمحات سے ان مجاہوں پر نند کیر قنایت کی کوئی قید نہ تھی جسے لاذ ملتا تھا، وہ ساغر لے آتا تھا۔ جسے مینا میسر ہوتی تھی، وہ مینا حاضر کرتا تھا اپنے بھیلے ستائیں بوس سے پرنس سمر قندی بڑی باقاعدگی سے ساغرو بینا کے اس کار دربار میں بڑھ چڑھ کے حصہ لے رہے تھے۔ سرکار کو ان کے حسن معاملہ پر بڑا بھروسہ تھا اس وجہ سے در بے درباری دل ہی دل میں پرنس سمر قندی اور خانم سمر قندی کے خلاف بہت گھوڑتھر تھے۔ اب اگر وہ لو لو کے بغیر سری نگر پہنچے تو ستائیں برس کے لئے داغ اور شاندار بیکارڈ کے بعد ان کی یہ پہلی شکست ہو گی۔

خانم سمر قندی کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو ٹک رہے تھے جو اس کے لئے بلاؤز پر بھیل کر جذب ہو جاتے تھے۔ دلو بستور غصہ کے جوش سے کمان کی طرح تھی بیٹھتی رہی۔

مجھے انہوں ہے آئٹی امیرا ذرہ بھر بھی ارادہ نہیں کہ آپ کوئی رنج پہنچے۔ لیکن

میں آگے نہیں جا سکتی۔ مجھے کہ سے والیں آنا ہی ہو گا؟“

”لو لو، میری جان! تم بہت غصے میں ہو۔ اس وقت تم میری کوئی بات نہ انوں کی۔

میرے درویش کو اُٹھنے دو۔ وہ تھیں ضرور نہ لے گا۔ میرا فقیر سب کو منایتا ہے۔ لو لو میری جان! دیکھ راب چڑھائی شروع ہو گئی ہے۔ یہ لو، ایک فروٹ ڈریپ چوس لو، تمھاری طبیعت بشاش رہے گی؛ خانم سمر قندی نے اپنے پرس سے ایک نیمن ڈریپ نکال کر لو لو کویا اور پھر آئینہ دیکھ کر اپنے چہرے پر مخلی پھر کے سے پوٹ دیا۔

اوہم پور کے بعد بانہال روڈ کی چڑھائی شروع ہو گئی تھی۔ یعنی چکر کھلانی ہوئی۔

مڑک مہیب پہاڑ کے گرد ایک سیاہ اڑد ہے کی طرح پیٹھی ہوئی جا رہی تھی۔ کشیبر پرنسیس کی پنڈتیانی بیوی کاجی اب اور بھی متلا نے لگا تھا۔ پروفیسر صاحب خود ہمدرن گوش بنے بیٹھے تھے۔ اور پرنس سمر قندی خانم اور لو لو کے ڈرامے کا ہر لفظ اور ہر سین پڑھی محنت سے ذہن نشین کر رہا تھا۔ پے در پے چکر دوں کی وجہ سے رابرٹ لانگ کاجی بھی کچا ہونے لگا تھا، اور وہ سیٹ پر سرٹیک کر آئیں ہیں۔ یہ آرام کرنے کی گوشش کر رہا تھا۔

کون ایک بچے کے قریب جب اسٹیشن ویگن کر کے ڈاک بیٹلے کے سامنے جا کر رُکی تو خانم سمر قندی کا مخصوص درویش بھی اپنے مراقبے سے بیدار ہو چکا تھا اور پرنس سمر قندی اپنی پیشہ ہاپسٹ کی دربارداری کے آداب جمع کر کے لو لو کی خوشامدی میں لگے ہوتے تھے۔ ان کی زبان کی مٹھاس میں بہت سی ریاستوں کے تخت اور تاج اپنے تاجداروں سمیت ایک مکھی کی طرح بے دست دیا گرفتار تھے۔ بیچاری لو لو کی کیا مجال تھی کہ ان کے سحر سے نجٹھلتی۔ چنانچہ جب پرنس سمر قندی اپنی خانم، لو لو اور رابرٹ لانگ کے ساتھ ڈاک بیٹلے میں لمحہ پر بیٹھے، تو ساری رنجشیں بیڑ کے جھگاگ دار کلاسوں میں ڈوب کر سٹپ چکی تھیں۔ اور مچھلی مرنغ، پلاو کو فتنے اور بلائی دار سوئیوں کے ہر

کو دس کے ساتھ دوستی اور وفاداری کا ایک نیا باب کھل رہا تھا۔

لنج کے بعد قیلووں کا اہتمام تھا۔ پرنس سرفرازی اور خانم لباس شب خوابی زیستیں کر کے ایک کرسے میں چلے گئے۔ لوٹنے برآمدے میں آرام کر سی کو انتخاب کیا اور رابرٹ لانگ کو نظم دین سبق کی جگہ ہوئی، جو اس ڈاک بندگی میں پانی لایا کرتا تھا۔ اس نے ڈاک بندگی کے بیرے سے نظام دین کے گھر کا پتہ پوچھا۔

بیرابرٹ لانگ کی معلومات کی وسعت اور اس کے انتخاب کی صحت پر مسکرا یا، "صاحب، اس کی لانگ میں بھولنا تکالہ ہوا ہے۔ دس بارہ روز سے وہ چلنے پھرنے سے معذد ہے۔ اور ڈاک بندگی میں پانی نہیں لاتا۔"

"کوئی بات نہیں،" رابرٹ لانگ نے کہا، "تم مجھے اس کے گھر کا پتہ بتا دو یہیں خود اسے دیکھنے جاؤں گا"

بیرے نے سڑاکر مایوسی کا اظہار کیا۔ "کوئی فائدہ نہیں صاحب۔ اس کے پاس بڑا اچھا آزاد ہے، لیکن وہ اسے ہوا بھی نہیں لگنے دیتا۔ دنیرو وزارت صاحب، پولیس کپتان صاحب، تھیلیڈار صاحب، تھانیدار صاحب، سب گوشش کر رہے ہیں ہم نے بھی آپ جیسے صاحب لوگوں کے لیے بڑے بڑے جتنی کیسے ہیں۔ لیکن وہ عرامی نظام میں کسی طرح قابو نہیں آتا۔ اس کے پاس جانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ صاحب،" اس اطلاع کے بعد بیرے نے یہ تجویز پیش کی کہ اگر صاحب کا بھی چاہتا ہے تو وہ دس منٹ میں خیریتی تیلی کی سڑہ سالہ رٹکی لاسکتا ہے۔ شکل و صورت میں وہ کسی طرح نظام دین کی جمید سے کم نہیں۔ اس کا خاص طرہ امتیاز یہ ہے کہ ایک روز جب سرکار یہاں سے گزر رہے تھے، توان کی نظر خیریتی تیلی کی بیٹھی پر پڑی جو ایک پتلی سی چادر اور ٹھنڈی چپے پر بیٹھی نہ مارہی تھی۔ سرکار نے اپنی موڑ روکی، اور مودی کیمروں نکال کر اس کے بہت سے

فرٹو لیئے.....

راپرٹ لانگ نے بڑی گوشش سے بیرے کو بیکن دلایا کہ اس کو خیر آئتی تسلی کی بیٹھی اور اس کے خاص اعزازات سے قطعی کوئی لمحپی نہیں ہے۔ البتہ وہ نظام دین بہشتی سے ملا چاہتا ہے۔ کیا یہ را اس کی مدد کر سکتا ہے؟

بیرے نے طوبہ و کرہ خیر آئتی تسلی کی بیٹھی کا بیان چھوڑ کر راپرٹ لانگ کی طرف یا یوسی سے دیکھا جاؤں لیکن اور گداز حقیقت کو چھوڑ کر خواہ خواہ نظام دین کا کھمبا نوچتے چلا تھا۔ خیر اس نے باورچی خانے سے ایک چھوڑ کرے کو بلکہ راپرٹ لانگ کے ساتھ کر دیا کہ وہ اسے نظام دین سقے کے لگھے جاتے۔

پہاڑی پکنڈیاں چڑھتے چڑھتے راپرٹ لانگ کا سانس پھول گیا۔ لیکن ان کا راہنماء رکھا ایک سبکار گھری کی طرح بھاگتا، پھلانگتا، چلسنا ٹھڑھستا گیا۔ پہاڑ کی ٹھلوں کا پر جا، بجا خوشناکوٹیاں سانپ کی چھتریوں کی طرح ایستادہ تھیں۔ کہیں کہیں جھرنوں کا مرود تھا۔ کسی جگہ ناشپاتی کے درختوں سے جبو لے بھی لٹک رہے تھے۔ کوئی ڈیڑھ دو میل چل کر چڑھ کے گنجان درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جنگل کی ہواں درختوں کے بیچ بڑی مہیب چینیں مارتی ہوتی گزرتی تھیں۔ ان چینوں کے علاوہ چاروں طرف گمراستہ تھا اور اس سنگی میں نظام دین سقے کی جھونپڑی واقع تھی۔ نظام دین اپنی جھونپڑی کے آگے ایک کھاٹ پر بیٹھا تھا۔ اس نے چھوڑے والی دلیں لانگ کھول کر دھوپ میں پھیلائی ہوئی تھی اور ہاتھوں سے پہاڑی سن کلکڑے کی رسیاں بنارہ تھا۔ ڈاک بندگی کے چوکر کے ساتھ ایک گورے صاحب کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھکا، اور حفظ مانقدم کے طور پر وہ اپنی لاٹھی کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔

«خبروار،» نظام دین نے ڈاک بندگے والے چھوڑ کرے کو ڈانٹ کر لکھا را، تم اپنی

ماں کے خصم کو کہاں لے رہے ہو؟ میں تم دنوں حرامزادوں کی گردان کاٹ دوں گا۔»

راپرٹ لانگ نے اپنی امن پسندی کے اندر میں اپنا سفید دمال ہمواریں لے رہا۔

”تم یہ رومال اپنی ماں کو دکھاؤ۔“ نظام دین غصتے سے پاگل ہو کر جلوپا یا یہ رومال اپنی بہن کو دے۔ یہ ماں کس سالی کے پاس آ رہے ہو۔ جاتہ خبر وادی، یہیں جان سے مارڈاں کا گا۔“ ایک چھوٹا سا پتھر سننا ہوا آیا اور ڈاک بندگے کے چھو کرے کے ننگے سر پر کھٹاک سے لگا اور وہ سر پر ڈکر پیدھا گیا۔ اور نظام دین کو گالیاں دینے اور رونے لگا۔ رابرٹ لانگ نے دیکھا کہ نظام دین کیتھے ایک نو عمر رک کی قیمت کی جھوٹی میں پتھر بھرے پھری ہوئی شیرن کی طرح کھڑی تھی۔ باقیں ہاتھ سے اس نے جھوٹی تھامی ہوئی تھی، اور عالمیں ہاتھ سے دو ہزار سرعت کے ساتھ پتھر نکالنے کا کر رابرٹ لانگ کو نشانہ بنارہی تھی، اس کی وجہ سے اس کے گال تفتخار ہے تھے اور اس کے پر لشان بالوں کی ایک رٹ غصیلی ناگزین کی طرح جل کھاتی ہوئی بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتی تھی۔ رابرٹ لانگ تھجھلی جنگ میں کئی مجاہدوں کا دورہ کر چکا تھا اور گولیوں کی بوچھاڑیں اسے آگے بڑھنے کی کافی مشق تھی۔ اپنا پتھر اس نے اپنی ہیئت کو ڈھنال کی طرح سامنے کر کے سر جھکالایا اور تیر تیر قلا پنجیں بھرتا ہوا نظام دین کے پاس پہنچ گیا۔ جیلے سفید سے کے بوٹے کی طرح کا پینٹے لگی۔ پتھروں کی جھوٹی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ ایک زخم خوردہ ہرنی کی طرح دردناک چھیخیں مارتی جھونپڑے میں بھاگ گئی۔ نظام دین نے اپنی لامھتی ہوا میں گھما کر رابرٹ لانگ پروار کرنا چاہا۔ لیکن اس کی پتھر سے والی زخمی ناگزین اس کا ساتھ نہ دیا اور وہ تیوار کے چار پانی پر گر گیا۔ اس بے بسی کی حالت میں اس نے بھی وہی کیا جو ہر بے بس انسان کرتا ہے۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پینٹے لگا۔

# سینوگراف

یہ شاید اس کا پہلا شعر تھا۔

”میرے سپنوں کے باغ میں دبے پاؤ کون آیا؟ مالی! اسے تھام لے! وہ میرے  
شہنما کے موڑی جہار لہبے؟“

ہاتھ پکیے ہوئے کاغزوں کے پلندے میں شاید وہ اپنا پرا ہیویٹ فوٹ پیپر  
رکھ کر بھول گئی تھی۔ میں نے میرے گھنٹی سجا کر اسے بلایا۔

”دیکھو گریسی، یہ شاید تھا را کا غذہ ہے۔“

”یہ سر! وہ جھینپی، اور زہراں کا گلا جھر آیا۔ جیسے میں نے اس کی ٹائپنگ  
یہ، ہزاروں غلطیاں پکڑ لی ہوں۔“ سوری مرا میری بھول سے دوسرے کاغزوں میں  
چلا آیا ہے۔“

”جب تھا ری غزل پوری ہو جاتے مس، تو مجھے دکھانا!“ میں نے مذاقہ کیا۔

اس نے ٹرے کی فانلوں کو کٹھا کیا اور جلدی سے نخل گئی۔

اس روز شاید وہ سارا دن اپنی مکمل ہونے والی غزل میں کھوئی رہی صبح صبح میں نے کتنی ضروری سرکلر لکھا تے تھے۔ وہ شام تک ٹانپ کر کے نہ لائی۔

میں نے بلا کر پہچا دو سب کا غذ ضروری ہیں میں ابھی ختم نہیں ہوئے ہے؟

”سوری سر! میں فوراً لاتی ہوں؛“ اس کے لمحے میں التجا تھی۔

”اور غزل ہے؟“ میں نے طعنہ دیا۔

میرا خیال ہے، میرے اس طنز سے اس کے دل پھر کا سا لگا۔ غالباً وہ اس اچانک چوتھے کے لیے تیار نہ تھی۔ تھوڑی دیر بعد چھپا سی ساری ٹانپ شدہ فلمیں لے آیا۔

غموں مل جھے اس بھولی سی لڑکی پر تو س آتا تھا۔ بیس سمجھنا ہوں کہ وہ تیر کی طرح سیدھی اور بے بل تھی۔ وہ ابھی تک اپنے سکول کا نیلا فراؤں پر فراہیکتی تھی۔ اب تک اس میں کلاس ردم کی عادتوں کا پرتو تھا۔ سکول کی بڑیکوں میں جو المدرسی بے باکی ہوتی ہے، گریسی میں ابھی تھی۔ اس کو فاتحوں کے انبار نے پاتمال نہیں کیا تھا۔ ایک دن لکھاتے لکھاتے میں نے گرامکی غلطی کی۔ گریسی نے لوک دیا۔

”دونوں طرح ٹھیک ہے؟“ میں نے اپنی پوزیشن کا لاحاظ رکھنا ضروری سمجھا!

”نہیں، سرپیش کی ہائی گرامپیں اسے غلط ٹھہرایا گیا ہے۔“

میں نے ہار مان لی۔ مجھے تلاش کے باوجود بھی اس کے ٹانپ کیکے ہوئے پانڈوں میں اعلیٰ کی غلطی نہ ملتی تھی۔ اگر وہ سکول چھوڑنے سے پہلے سینٹر کی میرج کا امتحان پاس کر لیتی تو شاید دفتر میں اسے اگلا گریڈ مل جاتا۔

جب وہ کاغذوں کے ڈھیر میں ٹانپ رانٹر کے سامنے بیٹھتی تھی تو یوں نظر آتا تھا جیسے ایک سمجھیدہ سے پچے کو زبردستی بزرگوں کے کپڑے پہنایا گیا ہے۔ وہ بولتی بہت کم تھی۔ میں نے دوچار دفعہ اتفاقاً اسے ہنستے دیکھا تھا۔ ایک بار اس وقت جب کچھ لکھاتے لکھاتے میری پنسل میز سے پھسل کر نیچے جا پڑی، میں نے دونوں پاؤں جوڑ کر

کہنی بارا سے اٹھانے کی گوشش کی، لیکن ناکام رہا۔ پھر میں نے گھنٹی بھاکر چڑپا اسی کو بلا دیا۔  
اس نے پسل اٹھادی۔ گریسی بے اختیار ہنس پڑی۔  
”کیا ہاتھے میں چہ میں نے پوچھا۔

”پچھے نہیں سر۔ مجھے کنگ بر دس اور مکڑی کا قصہ یاد آگیا تھا؟“

پھوٹ بر جستہ تھی۔ لیکن مجھے زیادہ نہ بھائی۔ شاید گریسی کو بھی میرے تیور بڑے لگے۔  
لیکن یہ میرا قیاس ہی قیاس ہے کیونکہ اس کا گول مول چہرہ اپنی کی طرح تھا جس میں جذبات  
کے پر نالے بھی ہوں تو نشان چھوڑے بغیر حذب ہو جائیں۔

دوسری بار حب بیس نے اُسے منہستے دکھاتونا زک مو تقدہ تھا۔ اس روز دفترکی ایک  
لیڈی اسٹنٹ میں مار گرت نے دو ماہ کی چھٹی کے لیے درخواست پیچھی تھی بلکہ کوئی  
میں کا ناقچووسی ہو رہی تھی اور وہ اپنے سکیشن کی طبقہ پست لٹکیوں کی طرف کی انکھیوں سے  
دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ لٹکیاں جھوٹ موت ٹھاٹپ کی مشینوں پر انگلکیاں مار کے ایک بھدا  
ساتر نم پیدا کرنے کی گوشش کر رہی تھیں اور مار گرت کی افسوس ناک مجبوریوں پر نہ بول لب  
نبصرہ ہو رہا تھا۔ گریسی نہ مسکناہتوں میں شامل تھی۔ نہ پیگوئیوں میں وہ حسبِ معقول  
کاغذوں کا پلندہ لیے کھٹ کھٹ ٹھاٹپ کر رہی تھی۔

”بدمعاش؟“ دفترکے ہر ٹکڑا اسٹنٹ ایلیش بالوںے مار گرت کی درخواست  
پر سفارش نوٹ لکھتے ہوئے کہا ”یہ اینٹکلو انڈین چھوکریاں آگاہ چھا تو دیکھتی نہیں اور پھر  
دو مینے کی چھٹی مانگتی ہیں۔ دفتر نہ ہوا، باواگھہ ہوا۔ کیس نے کہا تھا کہ سالے ٹائمیوں کے  
ساتھ دین رات رکشا میں گھوما کر۔“ ایلیش بالوںے قلم کان میں گھاکر کچپ ایسی ادا سے کہا،  
جیسے ٹائمیوں کی بجائے اگر مار گرت اس کے ساتھ رکشا میں گھومتی تو گویا محفوظ رہتی۔  
پھر ایلیش بالوںے کھسپانی میل کی طرح کن انکھیوں سے گریسی کی طرف دیکھا اور اواز  
میں بوج پیدا کر کے بولے ”مس گریسی، تمھارا کیا خیال ہے؟ اگر مار گرت کے لیے صرف

ایک مہینہ کی چھٹی کی سفارش کر دوں تو کام پل جائے گا نا؟”

گریسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ کھٹ کھٹ کھٹ ... میا تپ شین پل رہی تھی۔

”مغروف ہے سالی،“ ایلیش باوجل کر بولے۔ پھر انہوں نے ٹاپسٹ روکیبل کی

طرف دیکھا۔ وہ یکھلوں گا، جب سالی خود اپنی درخواست بھیجے گی۔

روکیبل نے ایلیش باجوکی خوشامد کے طور پر لکھے تھے لگاتے، اگریسی کامنہ تھتا گیا۔ اس نے دھک سے ٹاپ شین پرے روکیبل دی، اور اپنی فائلوں کا پلندا اٹھا کر تھکڑے کر ڈالا۔ دفتار کرے میں سکوت چھا گیا۔ کنفیڈلشن فائلوں کے تھکڑے دیکھ کر سارے بلکر سم سے گتے۔ ایلیش باجوکا ان میں قلم گھماتے ہیرے کرے میں آتے۔ میں نے گریسی کو بلاک پوچھا۔

وہ کھلکھلا کر پنس پڑی۔ ”سوری سر مجھے غصہ آگیا تھا۔“

غضہ! مجھے اس کی آزاد سادگی پر بہت ہنسی آئی۔ ایلیش باجوکھسیا نے ہو گتے۔

اگلے روز میں نے کئی ملکوں کو دوسرے سیکشن میں تبدیل کر دیا۔

جس روز شینو گرافر کی آسامی کے لیے انہوں یو ہوا تھا، بہت سی روکیباں، ایمیدوار تھیں۔ قریباً سب نے اپنے چہروں کو خاص اہتمام سے آراستہ کیا ہوا تھا۔ ان کی سالانہ صیلوا اور گاؤں میں سلیقے کے بل تھے۔ جن کے سارے کم اور یہنے کے خطوط والہانہ طور پر عرباں ہو رہے تھے۔ گریسی نے فقط اپنے سکول کا نیلا فرماں پہنا ہوا تھا۔ اور اس نے ابھی سینرکیمیج کا امتحان پاس نہ کیا تھا۔

انہوں کے وقت روکیباں زبان کی جگہ آنکھوں سے جواب دینے کی گوشنہ کرنے تھیں۔ ہر سوال پر ان کے ہونتوں کی گلابی سی پتیاں ایک رطیف سی مسکرا جھٹ کو شکفتہ کرتیں۔ ان کی گردتوں میں لکھے خم اُٹھتے، اور وہ اپنی زندگی کی ساری رعنایتوں کو لکھا کر کے بولنے کی جگہ گانے کی گوشنہ کرتیں۔ کسی کو پیا نہ میں مہارت تھی۔ کوئی مشاق

ڈانسر تھی۔ ایک نے مویسیقی کے تختے جلتے تھے۔ دوسری تین بہت جانتی تھی جبکہ لیں کی باری آئی تو بورڈ کے صدر نے کوالی فی کیشن والا سوال دہرا�ا۔

”سرشارٹ ہمینڈ اور ٹپ کرنا جانتی ہوں“، اس نے جواب دیا۔  
”اوہ یہ بورڈ کے ایک ممبر نے کر دیا۔“

”سرشارٹ ہمینڈ میں میری رفتار بہت تیز نہیں لیکن میں مشتعل کر رہی ہوں؛“  
”اوہ کچھ“، دوسرے ممبر نے زور دیا۔  
”سر آپ کوشاید شینو گرافکی صدورت ہے؛“ گریسی نے یاد دلایا۔

”تو اخ! ..... انہروں یو بورڈ کے ممبر گروپیا ایک دھماکے کے ساتھ پیلوں اور ناج اور گانے کی محفل سے دفتر کے کمرے میں آگرے! معاً اخیں یہ محسوس ہوا، اس چھوٹی سی لڑکی نے ان سب کے کام کھنچ دیے ہیں۔ ان کی بزرگی اور عظمت کو ایک پوشیدھا جھٹکا لگا۔ لیکن شاید مجبور ہو کر انھوں نے گریسی کو رکھ دیا۔

جب گانے اور ناپھنے اور تیرنے والی لڑکیوں نے دیکھا کہ ایک بچتی سی نیلے فرگ والی چھوکری ان پر بازی لے گئی ہے تو ان کی گرد نوں کے لوح جعل گئے۔ ہونٹوں کی گلابی پتیاں بد نما طور پر بچھتیں اور انھوں نے ناک سکیٹر کر سوچا، آج یہ بورڈ کے ممبر کیا پوچھاں، بوڑھے کھوست .....“

جب وہ پہلے روز دفتر میں آئی تو ایش بابو سب سے اقلیں کی طرح اس پر چھپتے جس طرح ہر ہنگامہ پر اس سے ہیلے چھپتا وہ اپنا حق سمجھتے تھے۔ چالیس پینتالیس سال کی مستقل گردش میں ان کے اگلے دو دانت اور سر کے بہت سے بال اگر گئے تھے لیکن ان کا ایمان تھا کہ ریٹائر ہونے میں آٹھ دس برس باقی ہیں۔ جب سر کا کو خود ان کی جسمانی اور دماغی حالت پر کمل بھروسہ ہے تو ان سالی چھوکریوں کے ناک جھوٹوں چڑھاتے سے کیا ہوتا ہے۔ لاتھاگ جائے تو رشت اور عورت ایک

بڑا رہیں..... اور یہ اینگلو انڈین لوکیاں تو باتھ کا میل ہیں، ہاتھ کا میل..... جلتی کا نام  
گاڑی ہے بھائی، روپیرہ جو تو سب حلال ہے۔ چنانچہ بابو ایش چند رہ میئنے اپنی جالانی  
امدی کا ایک حصہ اس ہاتھ کے میل کے لیے احصار کھتے تھے۔ یوں بھی ان کے ہاتھیں  
زنبخی کے دلوں سرے تھے۔ اگر ان کی چلتی ہوئی گاڑی کو ذرا سا ہچکو لا بھی گئے تو لوٹکیوں  
کی ترقی کے پرواز نے ایش بابو کی بوہے کی الماری سے گم ہو جاتے تھے۔ ان کی چھپتی کی  
درخواستیں درازوں میں ٹپتی ٹپتی گرد سے اٹ جاتی تھیں۔ اور ان کی تخواہوں کے بل  
میں غیر حاضر یوں کے سرخ سرخ لشان نظر کرنے لگتے تھے۔ لیکن اب شاید عمر میں بیل  
بار ایش بابو کو محسوس ہوا کہ ان کی گاڑی کے پتی کے سامنے ایک بڑا سارڈا آپنا  
ہے۔ اس لیے وہ گریبی سے زیادہ خوش نہ تھے، وہ جب ان کے سامنے آتی تو ان  
کے ٹنڈے کے یاتیں گوشے سے پان کی پیک نادانستہ طور پر پہننے لگتی۔ اور ان کے صنوعی  
دانفل کا بجٹا انگردوں کی ترشی کو بڑی شدت سے محسوس کرنے لگتا۔

دفتر نہ ہوا، سالا راحب خانہ ہوا! ..... ایش بابو عموماً بھلا یا کرتے تھے۔  
گریبی کے آنے سے ٹاپنگ سیکش پر بنیادی گی کاموڑا سالماحاف گر جاتا تھا، جس طرح  
آدھی رات کے وقت کسی رقص گاہ میں گر جے کا پادری ہاتھیں انھیں اٹھاتے آکھڑا  
ہو..... اس کی زندگی میں ایک سادہ سی، ساکن سی یکسانیت تھی۔ جیسے کلاک کی  
سویاں ۱۲ سے ۱۳ تک ایک ہی دائرے میں گردش کرتی رہیں۔ کلاک کی سوتیاں کہنا  
بھی غلط ہے۔ کیونکہ ان کے مدھم مدھم جھکلوں میں تو زندگی کے پڑا سارے لمحے پوشیدہ ہوتے  
ہیں۔ گریبی تو شاید ایک معمولی سی چادر تھی چھپے ہر سچ دصوب میں سکھانے کے لیے کھڑکی  
ہیں ٹوال دیا جاتے ..... اور وہ شام تک ٹھکی رہے ..... دفتر میں جو ادھر اپنے  
لوکیاں تھیں ..... ان کی زندگی میں نیگن چور دروازوں کے کھنکے ہوتے پڑتے تھے۔  
خفیہ کھڑکیاں تھیں، چھپے ہوئے روزن تھے، لیکن گریبی گویا ایک تاریک قبر میں رہتی

تھی، کہ جس کے راستوں کو بڑی بڑی سلیں رکھ کر مسدود کر دیا گیا ہو۔ وہن کے ایک بچے جب لنج کے بیٹے گھنٹے پھر کی رخصت ہوتی تو ریفرمنٹ روم کی بلوری میزوں کے گرد ایک ایک شمع اور کتنی کتنی پروانے جمع ہو جاتے۔ ایلش چندرا وہاں کے ہم خیال بالاں موقعہ پر اپنے ہاتھ کا میل شامی کیا بلوں، مرغ مسلم اور تیر کی زنگین یو تلوں کی شکل میں انہار پھینکتے تھے۔ جب ٹائپسٹ رکھیاں اور لیڈی کلکیں والپس ٹوٹیں، تو ان کی انگھوں کے پہلو ٹھہرایی ہو کر گرنے لگتے اور تیر کا خمار لو ریاں بن کر انھیں پھینکتے لگتا۔ ایلش بالوں کو بھی اس وقت گرسی کے ٹاپ رائٹر پر غصہ آتا تھا۔ کیونکہ اس کی ہٹک اس ماحدوں کی خاموش موسیقی میں مانوس کو کڑا ہٹھیں پیدا کرتی تھی۔ گرسی کی میز کی درازیں ایک چھوٹا سا پیکٹ ٹپارہتا تھا جس میں اپنے لنج کے بیٹے چار چھوٹے چھوٹے سیندوں پا نہ دلایا کرتی تھی۔ جب شام کے پاسخ بجھتے تو وہ کچی ہوئی فانکلوں کا بندول اٹھا کر سکل پر جا بیٹھتی تھی۔ مجھے کتنی بار خیال آیا کہ میں اسے اپنی کار میں بٹھا کر گھر چھوڑاں گے لیکن کچھ بات تھی، کہ میری کبھی ہوت نہ بندھی۔ جب دوسری رکھیاں دفتر کے دروازے میں نمودار ہوتی تھیں تو مشتاقاں دید کا غول ان کو انھوں ہاتھیا۔ کچھ خالی دردیوں والے ہوتے تھے، کچھ کمپنیوں اور دفتروں میں کام کرنے والے ایکلوں انڈیں چھو کرے! کبھی کبھی ہو تلوں کے گایہا اور رقص گاہوں کے دلال بھی اپنا پھنسدا اٹھاتے پہنچ جاتے تھے۔ کسی رٹکی کو رکشا میں جگہ ملتی کوئی دکھدیری میں سوار ہو جاتی، کسی کسی کیلئے کسی منتظر ہوتی ..... اور پھر ان کی شام کا آغاز فریزوں میں چلاتے کے ساتھ ہوتا۔ لائٹ ہاؤس میں سینما، گریٹ ایسٹرن میں ڈنر، ڈانس اور دسکی کے چھمائلے ہوئے پیگ جذبات کے انگارے۔ آگ و حسوں اور رات کے پیارے اسرا رساتے ..... لیکن گرسی کی زندگی میں تو ایک سائیکل تھی، جس پر سوار ہو کر وہ تیز تیز چوری گی سے گرد جاتی نہیں مارکیٹ سے چاکلیٹ بائیکیں کا ایک پیکٹ خریدتی اور چھر گورا چند روڈ پر اپنے چھوٹے

سے فلیٹ میں چلی جاتی۔ اس کی زندگی کا سرماہہ جارج تھا۔ ایک چھوٹا بھائی، جسے قدرت کی ستم طریقوں نے گریسی کی امانت میں دے دیا تھا۔ جب جارج بغل میں کتابوں کا باقچہ اٹھلتے سکول سے رونما تو گریسی کے لیے گویا زندگی کا ایک نیا دن طمیع ہوتا تھا۔ وہ نغمی سی لڑکی اپنی زندگی کا الحمود جارج کے قدموں پر چھا دیتی تھی۔ اگر اس کا بس چلتا، تو وہ ساری کائنات سمیٹ کر جارج کی جھوٹی میں ڈال دیتی۔

گریسی کے ذہن میں اپنے چھپن کے دھنڈے سے عکس تیرتے رہتے تھے۔ اس کا باپ ٹکڑتکی ایک اسٹیمز کمپنی میں ملازم تھا۔ گریسی کو محض اتنا سایاد تھا کہ عام طور پر آدھی رات گئے ایک بد مست اور مخور باپ شراب کے نشے میں چور گھر بیس لے کر تھا۔ کبھی کبھی وہ گریسی کی ماں کو بغل میں لے کر یوں جھنجھوڑنے لگتا جیسے جھوکا کتنا ہڈیاں جھوڑ رہا ہو۔ لیکن عموماً وہ آتے ہی غصے سے بے تاب ہو جاتا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کی انکھوں میں شرارے سے چھوٹنے لگتے، اور وہ شور بے اور گوشت کی پلیٹوں کو انداھا دھنڈ بچاری بیوی کے سر پر دے مارتا تھا۔ کئی دفعہ اس نے گریسی کو جھی پیٹا تھا، یوں نہی بلاؤ جو۔ اور گریسی کو بستک یاد تھا کہ اس کا باپ کتنی بار عجیب سی لڑکیوں کو گھر بیس لے آتا تھا۔ پہلی پہلی، دھنسی ہوئی آنکھیں، زرد گالوں پر سرخی اور پوٹر کے بد نہاد جھسے بکھرے ہوئے بال۔ بانہوں پا بھری ہوئی نیلی نیلی رگیں ..... ایک دفعہ ایک ایسی ہی سرخ بالوں والی بد صورت لڑکی کتی روزان کے گھر ٹھہری۔ اور جب جلانے لگی۔ گریسی کے باپ نے گھر کے پڑرے، برتن اور زیور اٹھا کے شیکسی میں ڈال دیے اور سرخ بالوں والی لڑکی کے بانو میں بازو ڈال کر جلا گیا۔ پندرہ برس سے گریسی کی ماں امید کا چراخ جلاتے بیٹھی تھی کہ شاید ٹیکسی پر آدھی رات گئے ایک بد مست شرمنی گھر میں آتے اور اس کی ٹھیاں چھوڑ کر کھدے اس بچاری کا سر پلیٹوں کی چوتھ سمنے کے بینے نہ سی گیا، لیکن جو ٹیکسی جا چکی تھی وہ والپس نہ آئی۔ جانے والا اس کی جھوٹی میں گریسی اور جارج دونشانیاں

چھوڑ گیا تھا۔ وہ ایک ہسپتال میں نرس بن گئی اور پندرہ برس تک اس نے اپنی دونوں  
امانتوں کو سنبھالا، ایک دن جب وہ ہسپتال سے نکلی تو ایک گزرتی ہوئی ٹرام نے  
اچانک اسے کھل دیا۔ اس کا سر پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے باختہ  
میں ابھی تک چاکلیٹ کے دوپیکٹ تھے، جو وہ ہر شام گزی اور جارج کے لیے خرید  
کر لے جایا کرتی تھی.....

خداحانے وہ کو نسا انی انصاف تھا، جس نے یکاکی گزی کو سکول کے کمرے  
سے فتح کر دفتر کی میرپور لابھایا۔ وہ ابھی بچھ تھی۔ لیکن جارج کی خاطراں نے اپنی زندگی  
کی شاہراہوں کو سہمیٹ کر بند کر دیا۔ دفتر سے آتے ہوئے وہ ہر روز جارج کے لیے چاکلیٹ  
یا ٹانکی کا بندل لایا کرتی تھی۔ اس کے پاس اپنے سکول کے چند فراک تھے، لیکن جارج کے  
لیے وہ فریش کے کپڑے سلوایا کرتی تھی۔ تو اس کے روزوہ اسے پکنک پر لے جایا کرتی  
تھی، ہر دوسرے تیسرے روزوہ سینا چلے جاتے تھے۔ ان کے پاس کوئی ملامت نہ تھا وہ  
اپنے ہاتھوں گھر سنبھالتی تھی۔ رات کے وقت جارج اس سے پریوں اور جنبوں اور  
سمندروی ڈاکوؤں کی کہانیاں سنتا تھا۔ اور پھر گزی دفتر کی بچھ ہوئی فاتلیں ٹائپ کرنے  
بیٹھ جاتی..... زندگی کی اس انٹک گوش میں شاید ایسی سمجھے بھی ہوتے تھے جو اس  
چھوٹی سی لڑکی کے دل میں سپنوں کے باغ کھلا دیتے تھے اور وہ کسی دبے پاؤں آنے  
والے چور سے شبنم کے موئی چھپا لیتی تھی.....

گزی اب بھی شینو گرافر ہے۔ لیکن اب اس کے پاس بہت سے بھر کیلئے فراک  
ہیں۔ شام کے وقت وہ سائیکل پر گھر نہیں جاتی۔ اسے رکشہ میں جگہ ملتی ہے یا وکٹری میں  
میں یا کسی شاندار ٹکسی میں۔ اور اب اس کی زندگی میں بھی فرپوز کی چلتے ہے۔ لاتٹ  
ہاؤس سینا، گریٹ ایشن میں ڈنر، ڈالس و سکی کے چھپاتے ہوئے پیگ۔ جذبات کے  
انگارے۔ اگل، ڈھوان اور رات کے پُر اسرار ساتے.....

چارج بھی سیانا ہو گیا ہے۔ وہ آدمی آدمی رات گئے نشے میں چند گھنٹے آتا ہے اور  
غصے سے بے تاب ہو کر شور بے اور گوشت کی پلٹیں گئیں کے سر پر دے مارتا ہے کبھی  
کبھی اس کے ساتھ کوئی دھنسی ہوئی اسکھوں والی لڑکی بھی ہوتی ہے پیلے پیلے گال نیلی  
رگیں، اُبھے ہوتے بال۔ ..... گریسی کے دل میں یہم ایک زہرناک خدشہ لرزتا ہے  
کہ شاید وہ کسی روز ایک سُرخ بالوں والی لڑکی کے ساتھ ٹکیسی میں بیٹھ کر چلا جلتے گا وہ  
اپنی زندگی کی ساری لڑیاں جمع کر کے روپوں کے جال بنتی رہتی ہے، تاکہ چارج اُڑنے جائے۔  
چارج کو روپیہ چاہیے رشراپ کے لیے روپیہ، سُرخ بالوں والی بحمدی لڑکیوں کے لیے  
روپیہ ..... گریسی اس کا ہاتھ خالی نہیں رہنے دیتی۔ وہ روپیہ لاتی ہے۔ وہ روپیہ  
لکاتی ہے۔ اور وہ روپیہ چرتی ہے ..... دفتر کی تنخواہ سے ..... صاحب کے  
تحفون سے ..... ایلیش بالوں کے ہاتھ کے میل سے ..... فرپوزتے .....  
لائٹ ہاؤس سے ..... گریٹ ایسٹرن ہوٹل سے .....

مجھے معلوم نہیں زندگی کی اس سکون پر آہشاد میں یہ جوار جھانٹا کیسے آیا۔ پرسوں  
سے وہاں سے میرا تباadelہ ہو چکا تھا۔ چارج دینے سے پہلے میں نے نئے صاحب کو  
دفتر کے علے سے ملایا۔ جب گریسی کی باری آئی، تو انھوں نے چپکے سے میرا ہاتھ اپنی طرف  
بھینچا اور زیریں لگانٹا۔ ڈگڈلا رڈ پٹا خوبی بھتی پٹا خبر۔ اس وقت میرے دل  
میں دفتاری خاہش اُبھری کہ کاش دفتر کی چھٹ پر ایک زبردست برم کا گولا چھٹ جاتے۔  
.... جب میں ریل گاڑی پر سوار ہو تو دفتر کا سارا مٹاف الوداع کئے آیا جھوا تھا۔ ان  
میں گریسی نہ تھی۔ مجھے بڑی مایوسی ہوتی، کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ اس کے دل میں ضرور میرا  
احترام تھا۔ لیکن جب گاڑی اگلے سٹیشن پر جا کر رُکی تو میں نے دیکھا کہ وہ پلٹیٹ فارم  
پر چھوپوں کی چھوپنی ٹسی ٹوکری اٹھاتے کھڑی ہے، جب انھوں نے چھوپوں کا گلہست  
مجھے دیا تو اس کی آواز بھرائی ہوتی تھی۔ اس کے سینے میں نئے نئے خطوں کا طوفان سا

اُمداد ہوا تھا۔ وہ بار بار کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے میرا بازو عقام لیتی تھی میں نے اسے زندگی کے نشیب دفراز پر ایک چھوٹا سا لیکچر دیا۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹ گلاب کی پتوں کی طرح تھر تھر اٹھے۔ جیسے آنحضرت کے چھپتیروں نے انھیں اچانک جھنجھوڑ دیا تو ”سرابیں کرو رہیں ہوں۔ لیکن میرے دل میں ایک نامعلوم ساختہ سما جا رہا ہے سر مجھے معلوم نہیں کہ میرا اول اس قدر دوب کیوں رہا ہے۔ سرا...“ وہ اس سمعے ہوئے پتے کی طرح میرے قریب کھسکتی آرہی تھی، جسے ایک گھری اور تاریک کھاتی کے سرے پر بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہو.....

جب گاڑی چلنے لگی تو میں نے پہلی بار اس کے بالوں میں انگلیوں سے لگنگھ کرنے ہوئے اس کی ہمت بندھاتی۔ گریسی نے میرا دیاں ہاتھ اٹھا کر اپنے ہاتھوں سے لگایا۔ اس کی پکلوں میں دو گرم گرم آنسو مچلے، اور ترپ کر میرے ہاتھ پر گر کر پڑے..... دو جلتے ہوئے انکارے جواہل تک اپنے خاموش دانع چھوڑ گئے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ گریسی کے سینوں کے خواب بھی اجرد گئے۔ اس کے شبنم کے موئی بھی لٹ گئے۔ وہ جیتنے جی مر بھی گئی..... لیکن اس کے دو عنقرانی متینوں کو کون چھپتے سکتا ہے جو میرے دل میں ہاتھ کی رگ میں پیدا ہستے ہیں؟

## شلوار

”شلوار ہے“ رشیدہ نے میز پر کٹہ مار کے کھایا۔ کچھی دیکھا بھی ہے تم نے کسی کو شلوار پہنے ہے نہ سمجھ رہا بوجھ، بس بلادی بالشت بھر کی زبان اور لگئے افلاطون کے کان کھلتے... نیم بے توجہی سے مسکلایا۔ اس نے سگرت کھاؤں گھاگھا کر منہ سے نکالا۔  
 تو دیکھو جانی، بیس نے کیا اچھے رنگ بناتے ہیں؟“  
 ”اُتو،“ رشیدہ غصتے سے بولی۔ دیس شلوار کی بات کرتی ہوں، اور تم رنگ بنابنا کر...“

”اچھا، بایا، اچھا۔ بتاؤ کیا کریں شلوار کو؟“  
 ”اپنے سر پر باندھ کر ناچو، اور کیا کریں؟ بدترین کہیں کے، جو منہ میں آیا بک دیتے ہو۔ نہ موقع، نہ لحاظ، نہ شرم، اگر وہ بُرا مان جائے تو ہے۔“  
 ”غُڑا کی قسم!“ نیم شرات سے مسکلایا۔ بُرا مزا آتے! بیس نے اسی کو ستانے کے لیے تو کہا تھا جانی؟“

”بس یہی کرتے سیکھنا تم بجنون جوں پڑے ہوتے جاتے ہو توں توں عقل گھٹتی جاتی ہے.....“

اور پھر لیکا یک نسیم کو خیال آیا کہ شاید حمید نے سچ مجھ برا مان لیا ہو! آہ، ضرور چڑھنی ہوگی! اسی نسبتے تو وہ سر جھکاتے سن سے باہر نکل گئی۔ اس کے گاں ضرور لالاں ہو گئے ہوں گے، اور اس کے کالوں کے تھیچے نادم سی گراہست پھیلی ہوگی جبھی تو وہ سر سرا تی ہوئی نکل جائیگی۔ درنہ وہ اسے دیکھ کر ٹھہر تی، ٹکتی، جھجکتی، جلتے ہوئے قدم قدم پر گھومتی اور جیسے بچاری کو ڈپک لخت ساری بھولی ہوئی باتیں یاد آگئی ہوں.....“ بھابی میری اُون ضرور بھیجا۔ ہاں بھابی دیکھیو، پلکے عنابی رنگ کی ہو۔ اُون ائندہ بھابی نے اپنی نئی چوڑیاں تو دھائی جی نہیں .....“ کبھی چوڑیاں دیکھنے، کبھی سلاتیاں اٹھانے، کبھی جھوٹ مورٹ کی باتیں دھرانے وہ جاتی، لوٹتی، گھومتی، اور نہ جانے کیوں ایک میٹھا سار تفاسیش اس کے سینے میں کپکپانے لگتا، اس کے کالوں پر بلکی سی تھماہست دیکھتی اور اس کی اٹکھیں .....“ یا ائندہ، اس کی بھیکی بھیگی نظریں کس طرح صابن کے رنگ برنگ بلبلوں کی طرح ہوا میں تیرتیں ..... اور نسیم کو یوں محسوس ہوتا کہ اس کا خون سکریٹ کے ڈھوپیں کی طرح رنگ بناتا ہوا اابل رہا ہے۔ اور وہ چور چور سی اٹکھیں اس کا ایکسرے کرنے پر تلی ہیں .....“

”جمیلہ ضرور چڑھنگتی ہوگی! بشتم کی طرح حساس تو ہتھی بھلا چڑھتی کیوں نہ؟“

نسیم نے بھابی کو جھنخھوڑا دیئیں کہتا ہوں بھابی، اس نے بات ادا نہ کیا ہو گا؟“

”چل بھیا رہ،“ بھابی نے میز پر سے چلائے کی پیالیاں کھٹکی کرتے ہوئے کہا۔

”دشرم تو منہیں آئی ہوگی ابھی چا؟“

”دشرم؟ ارسے واہ!“ بھابی کی جھنخھلاہست پر نسیم ہنسنے لگا ..... اور ہنستا گیا۔ یہ اس کی عادت تھی۔ جب وہ بہنستا تو ہنسنے ہی جاتا ..... ہی ہی ہی .....“

ہی ہی ہی ..... سفید سفید دانتوں کی بیسی ہے کہ نکلتی آرہی ہے، دونوں خسارے پر یہ گھرے گول گول گڑھے مچل اٹھتے اور جب تک بھابی چپاک سے پنکھے کی ڈنڈی اس کے حلقن تک فرے جاتی، وہ بند نہ ہوتا۔ جیلیہ پر تو نظر پڑتے ہی اس کا دل گدگداز لگتا اور وہ زور زور سے چلاتا ہے۔ بھابی، بھابی، لانا ڈنڈی! یہ پڑا دورہ ..... یہ .....

ہی ہی ہی ..... ہی ہی ہی .....

ذہانے کیوں، بھابی کو دورے کے نام سے وحشت تھی۔ سنتے ہی بلبل اٹھتی دلائل نہ کرے کسی کو دورہ پڑے۔ میری تو نیسم، تیرے منہ میں لگام بھی تو نہیں؛ نیسم کھل کھل کر مچلتا رہتا۔ جیلیہ پیٹھے بیٹھے سکڑتی سی جاتی۔ اس کا رنگ خواہ قمری سی ہونے لگتا اور نیسم کا جی تملتا کریں اس گدری سی گھٹھری کو رہبر کی گئند کی طرح دبا کوچکا دوں اگیند؟ اسے مقاوم اللہ ..... جیلیہ کا چھر، برادلن شہرت کی ٹھنڈیوں کی طرح جبو متی ہوئی نازک بانہیں، لمبی لمبی ناچھتی ہوئی سی ٹانگیں، چھم چھم بختر کنے والے سندل پاؤں ..... جس دن وہ چوڑے چوڑے پانچوں والی کاسنی شلوار نبیلے مورا کیں کا پھولو لارچنسا چھنسا کرنا، اور گلابی ریشم کا سرستا ہوا دوپٹہ پہن کر آتی، تو نیسم کی آنکھیں چکا چکا ہو جاتیں اور جھپ پلکیں مار کر دروازے کے پر دوں کے پیچھے کھسکتا جاتا ..... بُآ تو میری چلچھڑی! ..... بھابی ہنس کر کماکتی، ..... "اوہ نہیں!" جیلیہ گلابی ہونٹ بسوارتی۔ "پہلے شہرات تو آئے دو، بھابی! نیسم پر دوں کو بانہوں پر پیٹ کر گھومنا۔ اور انجان بن کر زور زور سے پوچھتا۔ شہرات آگئی۔

بھابی؟ اور سلوہ؟"

دشہرات، بھی آتے گی بھتیا، ابھی تو چلچھڑی آتی ہے؟" بھابی شرارت سے کہتی۔

جیلیہ شر ماکرا پا سر بھابی کی گود میں چپا دیتی۔

نیسم خواہ مخواہ انجان بتتا۔ آم بھابی۔ چلچھڑی کیا، ہم تو انار لیں گے انار اچھم

کرتے ہوئے انگارہ سے انار..... پٹانے ..... گلابی گلابی، کاسنی کا سنی  
نیلے نیلے کاغذوں میں پیشے ہوتے ہوتے پٹانے ..... جودل کی دنیا ہلا کر رکھ دیں .....  
اور پھر بھابی کی ناک کی طرح تیرتہ نیکیلی چھپو نہ دیں .....  
بھابی زور سے ہنستی، اور اس کا ایک ہاتھ اپنی ناک اور دوسرا پنکھے کی قدری  
پڑ جاتا۔ اب جیلے سکڑتی سکڑتی بھابی کی گود میں ہنستی جاتی، اور پھر بھابی اس قوس فرج  
کے ٹھکرے کو دھکیل کر پڑھی پڑھا دیتی ..... اب ہست بھی جیلے پاگل کمیں کی؟  
نیسم ٹھکر کر بھابی کے سامنے رکھی ہوئی لٹکری میں سے مٹروں کی پھلیاں آٹھا  
ہوتے چوری چوری جیلے کی طرف دیکھتا ..... دیکھا بھابی میں نہ کہتا تھا، وہ گلابی  
جارجست نہ لو ..... رنگ کچا ہے؟

”اسے ہے کچا نہ کچا۔“ بھابی اپنے گلابی جارجست پر دندنوں ہاتھ پھیرتی پیچار دھو  
و عمل چکی ہے، لیکن دیسی کی دیسی تو پڑی ہے .....  
”ماں ماں، جی دیکھو، کچا ہے۔ جیلے کے منہ پر کتنا لگ گیا ہے ..... ہی ہی ہی .....  
..... ہی ہی ہی ..... وہ پھول سے دانت کھلتے۔ تقدیموں کی آندھی سی چلتی، بھابی  
کے پنکھے کی ڈنڈی ہوا میں بلند ہوتی ..... اور جیلے اپنے تمثالتے ہوئے بھجوکا سے  
گماں کو کہنیوں میں چھپاتے بھاگتی، جاتی، پھر رکتی، بھجاتی، لوٹتی، گھوٹتی، ..... اور  
اس کو ہست سی بھولی ہوئی یاد آ جاتیں، اپنی اون، بھابی کی چوڑیاں ..... اور  
پھر وہ ڈیلوڑھی پر لگی ہوئی موٹی سی چق اٹھا کر چلی جاتی، جیسے آسمان کی سیکلی پنگیں شام  
کے دھنڈ لکے میں تخلیل ہو جائیں۔

نیسم کے دل میں طرح طرح کے ہوا تی قلعے بن کر تھے۔ کبھی وہ سوچتا کہ جیلے  
ریشم کے پنکے پنکے دھاگوں میں بندھی ہوئی پنگل کی طرح آسمانوں میں امڑتی جا رہی  
ہے ..... اُو پنجی اُو پنجی، ستاروں کے جھرمٹ پھاندتی ہوئی ..... اور پھر وہ

چاند کی پیشانی پر ایک سترنگے قشقة کی طرح جا بیٹھتی.....!! جب وہ کمکشاں کی دودھیلے کیاریوں کو دیکھتا، تواں کے دل میں بے باک سی، با غباہ سی، جھلکیاں آنے لگتیں۔ جیسے جیلے کی کاستی شلووار نیل قیض نے کمکشاں کے ایک بھرے ہوتے آوارہ سے بھٹے کیا پہنچاں میں چھپا رکھا ہو! بادلوں والی رات، اسے ایک بھیانک اور منحوس ساخاب نظر آتی..... وہ جھنگھلا کر یعنی انگلکیاں چبانے لگتا، کہ اس کا لبس چلے تو وہ بادلوں کی چادر کو فونچ کرتا رتار کر دلے۔ جس نے کمکشاں کی لطیف سلوٹوں پر گھنے گھنے سلتے ڈال رکھے ہیں..... اور رنجانے کیوں، اسے جیلے کی کاستی شلووار اور نیلے سوراکین کی قیض پر غصہ آنے لگتا..... اور وہ رالان میں کھڑا ہو کر چاہتا کہ جہاں پہنچے کی ڈنڈی زور سے اس کے حلق میں مار دے..... ایک روز وہ محصلی کے شکار کو گیا۔ ندی کا نیلگوں پانی، بلکی ہلکی لمبوں میں چھپلک رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی، اُجھی ہوئی سی لمبیں..... سفید گلاب کا ایک بڑا سماں پھول ان کے بہاؤ میں تیرتے زیبارہ رہتا..... ڈنگکاتا ہوا۔ نظر کتا ہوا، کبھی وہ محنتی ہوئی لمبوں کے زیر دہم میں ڈوبتا۔ کبھی اچھلتا، پھر ڈبتا، پھر اچھلتا..... اور نیسم کا جی بے اختیار اگسکا کہ وہ دھم سے پانی میں گود مرے، اور اس تیر رفتار پھول کو جھپٹت کر روک لے..... جو جیلے کی گول گول سفید اڑیسی کی طرح بھاگتا ہوا جا رہا تھا..... جیلے کی اڑیسیاں! جب وہ اپنا آتمتیاں جووا چہرہ کہنیوں میں چھپائے ڈیوڑھی کی چن کی طرف بھاگا کرتی تو نیسم چند صیائی ہوئی آنکھوں سے اس کی گول مول سڈوں اڑیسیوں کا تعاقب کرتا، جن پر کاستی شلووار کے ابشاری پانچے اور گردابی بل کبھی گرتے، کبھی اٹھتے، کبھی اٹھتے، کبھی گرتے..... اور پھر آخر بشرت آئی! جہاں عدرتوں کی مجلسوں میں گتی ہوئی تھی نیسم کمرے میں بیٹھا پلانچے گئی رہا تھا۔ استئے میں بھل بھڑی اگئی! انگلین شراروں کی طرح چمچم کرتی اور رالان میں کھڑی ہو گئی۔

”جہاںی، یہ لوگ چھوئندیں!“ اس نے بلکی سی نہسی دبا کر کہا۔

فیض چون کاہد او جو، پھل جھٹری ہے؟ ذرا پشاخوں سے بچ کے رہنا؟

”دیکھ تو بھائی کو پوچھتی ہوں یا جنمیلہ نے اپنے ادا کے ساتھ کہا۔

جمیلہ شرما کر بھاگی، ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی ..... نسیم بھاگا کاٹھس،  
کھٹس، ٹھس ..... پانچھے چھوٹ رہتے تھے۔ جھر رر ..... جمیلہ کا پاؤں  
شلوار کے پانچھے میں اُلچھا اور وہ دھڑام سے گری ..... نسیم نے لپک  
کر سن بھالا، اور بانہوں پر اٹھایا ..... انار، شرارے! اگا! ادونوں  
کھو سے گئے، جس طرح آتش بازی کے شعلوں میں دھواں کھو جاتے .....  
اور ایک دودھیا سی بے باک ٹانگ ہوا میں تاچنے لگی، جیسے قوس قزح کی لطیلوں  
سے کھکشاں کا دھارا چھوٹ نکلے! اور پھر وہ جائی، جھجکی، گھبراٹی .....  
اور پے اختیار بھاگی۔ اس کا پھٹا ہوا پانچھے تیچھے تیچھے ٹھستنے لگا ..... جس  
طرح پھل بھڑی کے ساتھ ساتھ چھونڈ رہا گا رہی ہو۔

دوسرا روز وہ آئی تو سفید بوسکی کا سیدھا پا جامہ پہنے ہوئے تھی۔ بھائی دیکھتے ہی چلانی لے ہے ..... بھی، یہ کیا لڑکا کا سی بی گئی ہو؟  
شلکوار کیا چھوئی؟

جمیلہ کا پاؤں گرا گیا۔ کل پاؤں ال جھا، تو پھٹ گئی۔ میں بھی تو دھڑام سے گری جھانی..... اب سب کے بیگوڑے پانچھے چھوٹے کروانے دے دیے ہیں۔“

وہ تو یہ ایجھٹ تو نہیں آئی ہے، سمجھا ہی نے یہ رچھا۔

"بہت بکی سی!" ..... جمیلہ نے ایک چھپے ہوئے مرد کی جھر جھری

لے کر کہا۔ اور پھر وہ یکاکیں جھینپی۔ اور بات ٹالنے کے لیے بولی۔ ”کھل کا جلسہ کیسا رہا صحابی؟“

”بڑے مرے کا..... بیگم غیاث نے اچھا خطبہ دیا، تم کیوں نہ آئیں؟“  
”دیوتوں رہ گئی..... خطبے میں کیا کہا؟“

”بہت سی باتیں، شہزادت کی فضیلت، اور نہ جانے کیا کیا ہے تو یہ اس سب کچھ یاد بھی تو نہیں رہتا.....“

”صحابی! شب برات میں فرشتے آتے ہیں؟“ نسیم نے پردے کے پیچے سے مٹنہ نکال کر پوچھا۔

”اللہ میاں کی رحمت ہے بھیتا۔ فرشتے تو آتے ہی نہیں۔“ صحابی نے ایک قسم کی روحاںی تندگی سے کہا۔

”اور حوریں..... صحابی؟“ جمیلہ نے آنکھیں جھکا کر شرارٹا پوچھا۔

”ہاں ہاں..... ضرور!“ نسیم چلا یا۔ ”لیکن بھٹی ہوئی شلواروں والی.....؟“

جمیلہ کے گاؤں پر گلبانی ڈورے آتے اور وہ بانی کے ریلے کی طرح مچل کر بھاگ گئی۔

دو توہہ! الیسی بات بھی کوئی نہتا ہے جعل؟“ صحابی نے چائے کی پیاں کھٹ سے پرچ میں رکھ کر کہا۔

”دیں نے کوئی اسے کہا تھا کچھ؟ شلوار کی بات تھی؟“

”چل چپ رہ۔ بذھا ہو گیا ہے اور بات کی تمیز نہیں.....؟“

”تو میں کیا کروں صحابی.....؟ یہ لباس ہی بد تمیز ہے!“ نسیم

نے بات ٹالی۔

بھابی کو بھی غصہ آگیا۔

”شلوار چ“ اس نے میر پر مکار کے کہا۔ کبھی دیکھا بھی ہے تم نے کسی  
کوشلوار پہنے .....“

# چاگ چاگ

”چاگ چاگ، حضور ہے“ سفید دار ہی والے بیرے نے کامن کی پیالی میز سے اٹھا کر پوچھا۔

افضل نے کہا۔ ”اوہ“ مکلت میں آتے ہی ٹرام میں اس نے کسی کو پہلی بار چاگ چکتے ملا تھا۔ وہ سمجھا کہ ڈم ڈم یا بچ بچ کی طرح کسی جگہ کا نام ہو گا۔ ..... اب رات کے کھانے پر جب ہر مول کے بیرے نے پوچھا، ”سوپ حضور ہے“ تو افضل نے کہا۔ ”اوہ“ کلکس حضور ہے۔ ”لے اوہ“ اسٹلطان پنگ حضور ہے۔ — ”لے اوہ“ ..... چاگ چاگ حضور ہے۔ ”لے اوہ“ افضل نے سوچا کوئی تھینی مٹھائی ہو گی۔ پھر اسے خیال آیا کہ شاید شراب ہو۔ اس خیال سے اس کے دنگشوں میں کپکپی سی ہوئی۔ کیوں کہ وہ ابھی شراب کو مند لگانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے دل میں فرشتہ بننے کی خواہش بھی نہ تھی۔ لیکن ہر چیز کے لیے اس نے زندگی میں خاص خاص منزلیں بناؤ کہی تھیں۔ مثلًا سگرٹ ..... کام بچ میں کتنی بار سگرٹ پینا چاہتا تھا۔ لیکن اس آرزو کی تکمیل کو اس نے ایم اے پاس

کرنے تک آنٹھا کھاتھا۔ چنانچہ اب وہ چار مہینے سے سگرٹ بھی پیتا تھا، اور جو بھر کر پیتا تھا۔ اس کی زندگی کی شاہراہ میں اگلی منزل کا نشان قدسیہ کا بام ہی کوئی دوچار نہ تھا دُور تھا۔ کیونکہ وہ اس کی منگتیر تھی۔ اور اگلے مہینے کی دس تاریخ کو راجا اس کی ملکیت میں آئے والی تھی۔ انسان کی تعمیر میں کچھ پوشیدہ رکھیں ایسی بھی ہیں جو آرزوئے ملکیت پر بے اختیار پھر مکمل تھیں۔ افضل کے پاس روپیہ تھا۔ اور جب بہن کی پاس بہن کا درگرمی تھی کہ میاں افضل! یہ سب روپیہ تمہارا ہے، محض تمہارا..... تو اسے ایک خفیہ تکمیل ہوتی تھی۔ اور وہ لمحہ بھر کے لیے جعلی دستخط بنانے والوں کو بھی بھول جاتا تھا!

لاہور کے ماذل ماذل میں جب اس نے ایک چھوٹی سی خوش خواہ کوٹھی بنوانی، تو اس کی پیشانی پر بڑے بڑے صروف میں "افضل کردہ" لکھوا یا گیا۔ اور پرانگریزی میں، نیچے اُردو میں۔ جب کوئی راہگیر اپنے اس نام کو پڑھ کر گزر جاتا تھا، تو شاید افضل کی کوئی خاموش رگ مطمئن ہو جاتی تھی، کہ شکر ہے۔ گزرنے والے کو یہ دھوکا نہیں لگا کہ شاید یہ خوب صورت مکان کریم بخش کا ہو، یا طوطا رام کا.....

اب اگلے جیمنے اس کی ملکیتی جاندار میں قدسیہ کا لچکتا ہوا پھر پر اجسم بھی شامل ہونے والا تھا۔ قدسیہ کو پالینے کے بعد افضل کے ارض و سما ایک دھنڈلی سی افقی لکیریں کھو جاتے تھے۔ کبھی وہ سوچتا تھا کہ وہ انارکلی میں کپڑوں کی ایک بہت بڑی دکان کھول لے گا۔ کبھی اس کا تختیل قدسیہ کو لے کر تاج محل اور اجنتا آرٹ کی سیاحت کے لیے چلنکتا تھا۔ بسا اوقات اس کے تصویریں ارغوانی لمبیں والے پچھلاتے ہوئے پیگ گھوم جائے تھے..... اصل میں قدسیہ کے بعد افضل کی ماذل پر زنگ سالاگ جاتا تھا۔ اور اسے خود محسوس ہوتا تھا کہ شاید اس کی زندگی اس کرم دیکھتے دیکھتے ہوئے کوئی کی طرح رہ جائے گی۔ جس سے پانی میں ڈال کر پھین سے سمجھا دیا گیا ہو..... افضل آوارہ مزارخ نہیں تھا۔ وہ آسودہ مزار تھا۔ آسودگی ساحل کے کنارے مبیٹھ کر لہریں گنتی ہے۔ آدارگی ان

لہر دل کی آنکھ میں کو دھاتی ہے۔ چنانچہ جب افضل کو معایہ خیال آیا کہ شاید جگ جگ کسی شراب کا نام ہو۔ تو وہ گھبرا گیا۔ وہ ابھی شراب پینا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے لاحظ عمل میں شراب کی منزل عورت کے بعد تھی۔ عورت کا وجد قدسیہ کا وجد تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کی کائنات میں عورت کا روپ یا توبان کا روپ ہوتا ہے۔ یا ہم کا یابیو کا..... وہ عورت کو ایک ست زمگی پتھک نہیں سمجھتا تھا۔ جو انسان کی زندگی پر توں قریح کی طرح تنی ہوئی ہے۔ جب وہ قدسیہ کو پالے گا تو سمجھے گا کہ دنیا کے ساتھ اس کا ایک ضروری حساب بے باک ہو گیا ہے۔ یعنی سارے جہاں کی عورتوں میں اس کے جھتے کا جو شکٹا تھا، وہ اسے مل گیا۔ افضل نے کبھی کبھی سے محبت نہ کی تھی۔ لیکن پیدا ہوتے ہیں اسے حق ہو گیا تھا کہ ایک خاص عمر پر کنج کے وہ دنیا سے اپنے جھتے کی عورت مانگ لے چکر وہاتفاق سے مسلمان گھر میں پیدا ہوا تھا اس لیے دوچار عورتیں بھی مانگ سکتا تھا..... ہٹل کا ڈانگ روم کچھ کچھ بھرا ہوا تھا۔ یہ زیرزبرقی قفعے بیگنگ بلگ بل رہے تھے۔ افضل کے سامنے والی میز پر ایک ادھیر عمر کا آدمی اور ایک جوان عورت بیٹھے ہوئے اُس کی رکھا رہے تھے۔ ایک بیرا ہلانے ہمانے جگک کر میز کے نیچے نظر دڑاتا تھا۔ ادھیر عمر والے آدمی کے گھٹے جوان عورت کے گھٹنوں سے ملنے ہوتے تھے۔ اور ان کے پاؤں ایک خاموش تال پر نماج رہے تھے..... بائیں طرف ایک بھر کیلی ہی لڑکی بناو سنگار بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے ایک میلے کپڑوں والا بڑا کا تھا۔ اس کے سامنے چارے کی پالیاں تھیں۔ لیکن وہ نہ تو چارتے پتتے تھے، نہ الپس میں بوتتے تھے۔ دلوں کی نگاہیں بار کے ایک کونے سے دوسرے کوئی نہ گھوم رہی تھیں۔ یہاں ایک افضل کی نگاہیں لڑکی سے ملیں۔ وہ جھینپٹ گئی۔ افضل نے پھر دیکھا۔ وہ مسکرا پڑی، اور اس کے سفید دانتوں کی لڑی سرخ ہونٹوں کے درمیان متینوں کی طرح جگما گئی۔ وہ دیزنگ کن انگھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے رہے۔ پھر وہ

میلے کپڑوں والا رکھا کسی بہانے اٹھ کر چلا گیا۔ رٹکی نے گول گول آنکھیں گھاکر خالی کرسی کو دیکھا۔ پھر اس نے چائے کی پیالی کو تچھے سے دھم دھم سرپریں بچانا شروع کیا۔ اس جلتہ نگ کی آواز افضل کو اپنی طرف بلانے لگی۔ لیکن اس نے تو گاؤں کی سنسان گلیوں میں بھی کسی اکیلی رٹکی کو کھلے طور پر گھوڑا نہیں ملتا۔ اب اس مجرمے ہوتے ہال میں وہ اس اجنبی رٹکی کے ساتھ کیسے جا بیٹھتا ہے؟ اس کے دل میں ایک عجیب سا اضطراب ہونے لگا۔ جس میں غصہ ملتا ہے۔ مایوسی سمجھی، عزم ملتا، شرم سمجھی۔ لیکن وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ وقت کا پنچھی اور دریا کی لہر کسی کا انتظار نہیں کرتے۔ یہی اصول عورت کا ہے۔ افضل اپنے عجیب سے اضطراب میں البارہ۔ اتنے میں ہال کے درمرے کو نہ سے ایک رٹکھڑا تما ہتو آدمی آیا۔ اور دھم سے رٹکی کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیرے نے جلدی سے اگر کھانے کا آرڈر لیا۔ ان دونوں کے گھٹٹے میز کے نیچے مل گئے۔ ان کے پاؤں کسی خاموش تال پر ناچنے لگے اور افضل کو بیٹھے بھاتا ہے یہو محسوس ہوا کہ اس رٹکھڑا تے ہوتے شرابی نے چانٹا مار کر اس کے منہ کا سگریٹ چھین لیا ہے!

”بواتے امیراں لاو۔“ افضل نے زور سے بیخنگ کر کھا۔

اس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں نے اس بد تیزی پر ناک چڑھاتے۔ وہ عورت غصتے سے کانپ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے موٹے موٹے ناخنے پھول گئے اور اس نے سفید دار ٹھی دالے بیرے کو قہر آکوڈ نظر سے دیکھ کر کھا۔

”تھو۔“ غفور چاچا، سفید بال ہو گئے تیرے، پرآدمی کی پرکھ نہ آئی اب تک“ اور پھر وہ تیرتی ہوئی مرغبانی کی طرح میزوں کے گرد منڈلانے لگی۔ ایک موٹا سا آدمی وسکی کا گلاس سامنے رکھے اونکھوں پر انتبا۔ اس نے نیم بازاں کھوں سے اس عورت کو دیکھا اور زیر لب پر پڑایا۔

”چک چک ہے“ عورت نے سکا کر کھا۔ اور پھر وہ دونوں گھستنے سے گٹھنا جوڑ کر بیٹھ گئے۔

ہٹھل کے باہر فٹ پا تھے پر ایک نو دس برس کا گول مٹول سا چھوکر اس کی طرف لپکا ہو گوری بی بی، جناب ہے“ چھوکرے نے افضل کی انگلی پکڑ کر پوچھا۔  
افضل نے اُسے جھٹک دیا۔

”کالی بی بی جناب ہے“ چھوکرے نے دوسرا پیش کش کی۔  
افضل نے پھر اسے ڈانٹ دیا۔

”چک چک جناب ہے“ چھوکرے نے اصراراً کھا۔  
افضل نے اُسے دھکادے کر پرے چھینیک دیا۔

افضل میں اخلاقی جرأت کے ساتھ ساتھ ظرافت کا مادہ بھی عنقا تھا۔ ورنوہ اس گول مٹول چھوکرے کو دھکیل کر پرے نہ ہٹاتا۔ وہ نخاں ازٹکا گیسوں پر لیک پیک کر ان کے معیار کا سودا کیا کرتا تھا۔ اس کے ہی پار میں کئی قسم کی جنس تھی۔ کالی بی بی اور گوری بی بی کی رنگت میں امتیاز مندا، نسل میں فرق تھا، بازار اگل الگ تھے۔ قیمت

جُدِّا جُدِّا سختی ..... لیکن چُک چُک ایک میں الاقوامی چیزیں تھیں۔ وہ بُنی نوع انسان کی مشترک جامدادر ہے۔ اس میں کالے گورے، پیلے، بُھوڑے کی تمیز نہیں۔ وہ ہر جگہ ہے اور ہر کسی کے لیے ہے۔ توکری میں رکھے ہوئے تربوز کی طرح، جس کی ایک چھانک کاٹ کر اسے خفیہ طور پر نشکاکر دیا ہو۔ افضل جس طرف جاتا تھا۔ اس کے سامنے چُک چُک انجاتی تھی۔ ملکتے کی ساری شاہراہیں ایک ہی منزل پر مل رہی تھیں۔ ٹیکسیوں میں چُک چُک تھی۔ رکشاؤں میں چُک چُک تھی۔ گھوڑا گاڑیوں میں چُک چُک تھی۔ وہ سرسراتی ہر ہوئی خوبصورت ساری صیوں میں تھی۔ اس نے رنگ بُرگ فراق پہنچے ہوئے تھے۔ وہ عظیم شاہ کمروں میں تھی۔ وہ خوشنما پر دنوں کے تیچھے تھی، وہ جہاں کہیں بھی تھی، جو کچھ تھی لوگی میں رکھے ہوئے تربوز کی طرح تھی جس کی ایک چھانک تراش کر اسے خفیہ طور پر نشکاکر دیا ہوا

وہ ایک لدھی ہجئی ٹرام میں چنس کر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے پہلو میں ایک نازک سی رٹکی تھی جس کے نہاشے ہوئے بال پھولوں کی طرح ہمکار ہے تھے۔ جب ٹرام ڈکتی تھی، تو ہر چکو لے کے ساتھ اس رٹکی کا سارا بوجھا افضل کے کندھوں پر آگتا تھا، اور اسے یوں محسوس ہونے لگتا تھا جیسے عطروں میں بسا چوار لشکر کا تھان اس پر ڈال دیا ہو۔ ..... وہ دل ہی دل میں دعا کرنے لگتا کہ ٹرام قدم پر ڈکر کے، اسے گام گام پر ٹھوکریں لگیں اور بھروہ کسی دوسرے ٹرام سے ٹکر کر ٹوٹ جائے۔ ..... جیسے تارے ٹوٹتے ہیں۔ لیکن دعا منوانے کے لیے بھی ہمت درکار ہے۔ ٹرام گڑک رکھانے بجاگی جا رہی تھی۔ ایک نئی خونریخان کیستا ہوا اگے بڑھا اور ان دونوں کے درمیان گھس کر کھڑا ہو گیا۔ اب افضل کو شاید پہلی بار یہ سمجھ رہا کہ چکو لے گئے کے لیے ضروری نہیں کہ ٹرام کو جگہ بجگہ ترکنا پڑے۔

”تان سنس“، اس رٹکی نے غصتے سے نوجوان کو ٹوٹا۔

میچ چک؟ نوجوان نے اس کے کندھے پر حضوری رکڑ کے کہا۔

میچ چک؟ وہ مسکرا پڑی.....

عین اس وقت افضل کو سفید داڑھی والا یہ یاد آگیا۔ اور پھر وہ بھر کیلی لٹکی جو چاتے کی پیالی پچھوپار کے جلتہ نگ، سجارتی تھی..... لیکن پھر اچانک اسے قدسیہ یاد آگئی۔ اس نے اپنے آپ کو ایک زبردست گالی دی۔ وہ گلکتے میں شادی کا سامان خریدنے آیا تھا۔ اس کا یہ طلب تو نہ تھا کہ وہ ہر را ہچلتی عورت کے قدموں میں پایاں ہو جائے۔ اس نے جیب سے چیزوں کی فہرست نکالی اور ایک بہت بڑی دو منزلہ دکان میں چلا گیا۔

یہ دکان گلکتہ کی بڑی دکانوں میں سے تھی۔ اس میں مختلف چیزوں کے لیے انگ انگ سیکیشن تھے۔ ہر سیکیشن میں گاہکوں کی مدد کے لیے آدمی یا عورتیں مامور تھیں۔ سیشتری والے حصے میں ایک خریدار کا ذمہ پر جھکا ہوا تھا۔ ایک درمیانی عمر کی عورت جس کے چہرے پر جھپٹپوں کی پہلی لہڑائی تھے والی تھی، بڑی مستعدی سے چیزیں نکال کر لادہی تھی۔ رائٹنگ پیڈ، لفلٹے اسیا ہی..... اور پھر خریدار نے ادھر اور ڈیکھ کر زیرِ لب کہا۔ میچ چک؟ عورت کے سنجیدہ چہرے میں کچھ تبدیلی ہوئی۔ اس نے احتیاط سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر مسکرا پڑی۔

ایک خوبصورت اور نوجوان جوڑا سنگار کی الماریوں کے پاس گھوم رہا تھا۔

وہ دھیمی دھیمی آواز میں سرگوشیاں کر رہے تھے، اور ان کی بے تاب اسکھیں ایک دوسرے کو اپنی انتہا گرا تیوں میں ڈبو رہی تھیں۔ تین بے باک پچھوکرے سگرٹ پیٹے ان کے پاس سے گزرے۔ انھوں نے بنی ٹھنی ہوئی دلہن کو ٹھوڑ کر دیکھا۔ پھر وہ تیتوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا تے اور سگرٹ کا ڈھواں زند زور سے موم کے ان رنگین مجسموں پر چھوڑنے لگے۔ جونماشی ساڑھیاں گاڈن اور

فراک پہنے کھڑے تھے۔

ان بھتمنوں کے اعضا، اقلیدیں کی شکلوں کی طرح متناسب تھے۔ ان کے انداز میں دنیا بھر کی رعنایوں کو مجھ کر دیا گیا تھا۔ اگر کوئی آرٹسٹ ان کے بدن میں تھوڑا سا بوج، تھوڑی سی حرارت ڈال سکتا تو یقیناً کاؤن، فراکوں اور سارے ہیوں کے ساتھ وہ بھی مہنگے داموں پک جاتے۔

افضل ایک بھتمنے کے سامنے کھڑا ہو گیا جس نے سلسلے ستارے والی آسمان ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ وہ اس کے رنگیں رخساروں کو دیکھتا رہا۔ اور پھر ساڑھی دیکھنے کے بعد نے اس نے بھتمنے کی ٹھوس کر کر زور سے دبادیا۔ اس کے دل میں ایک ذہن دست خواہش اپھری کہ وہ لپک کر اس موم کی مورت سے لپٹ جاتے اور اس کے کانون میں چیخ چیخ کر کہے ”چاک چاک، چاک چاک، چاک چاک.....“ دیکھا یہیں آپ کی مدد کر سکتی ہوں؟ عقب سے ایک نوجوان چھوکری نے پوچھا۔

افضل اچک کر ایک طرف ہو گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نکاراہے بھتمنے میں بیکاپک جان پڑ گئی ہے۔

”عی ماں، مجھے کچھ ساڑھیاں چاہتیں، کچھ فراک.....“ اس نے جلدی جواب دیا۔ گھبراہٹ میں دہ اور کرنی بات نہ بناسکا۔

وہ لڑکی اسے ایک تکون کرے میں لے گئی۔ اور الماریاں کھول کر قسم کی ساڑھیاں نکالنے لگی۔ افضل کا دل زور زور سے پیلیوں کے ساتھ مکھا رہا تھا۔ وہ سارے ہیوں کی جگہ فراک والی لڑکی کو دیکھنے لگا۔ لڑکی نے شرارت سے منہ چھلا لیا۔ اور پھر ایک ملامت سی ریشمی ساڑھی کے نیچے ان کی انگلیاں اچانک مل گئیں۔ وقت کی رفتار مکھ بھر کے لیے تھم گئی۔ افضل کے دل کی گمراہیوں سے چاک چاک کا لفڑا ایک

متاذ تر نم کے ساتھ ابھرا، لیکن ملے تک اگر اکھ گیا، جیسے ناچتنی جوئی رقاصلہ کا پاؤں دھم سے اگالدار میں چپس جائے ..... اس نے جلدی جلدی سا ڈھینو کا پلنڈ اسنجھا لا اور بامنکل آیا۔ مرٹک کے کنارے ایک خالی رکشا والا پتیسے سدگا اُدھگھر رہتا۔ افضل اچک کراس میں سوار ہو گیا۔ رکشا والا ہر ڈاکر اُدھگھر میٹھا اور نیم خوبی کی حالت میں بولادکھاں چلیں گے حضور ہے دھرم تھے؟

”حرامزادہ“ افضل کرٹک کر بولا ”دھرم تھے میں تیری ماں ہے سلے پر رکشا والے نے ایک زور کی جمائی لی۔ وہ ایک سدھے ہوئے گھوٹے کی طرح رکشائیں جوت گیا۔ اب اس کی نیند بھی دور ہو گئی تھی۔

دو چک چک، حضور ہے اس نے رکشا کھیپتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں سالے ہاں ہے افضل دوبارہ کڑکا۔ چک چک چک ما نہیں ہے، چک چک بس نہیں ہے، چک چک بسوی نہیں ہے ..... تو کیا چک چک سانپ ہے؟ وہ اپنے ڈرپوک ضمیر سے لٹتا ہمارا تھا!

ایسا

وہ بھی تو سالوں سی، سادہ سی، معمولی سی، لیکن اس کے جسم میں جوانی کا تنداہ تھا۔  
 سوں لائس کے حلقوں میں مشر رام لال کی آیا کا چرچا تھا۔ میر شام چب وہ پرمیو لیٹریٹریں  
 رام لال کے بچے کو بھا کے نکلتی تھیں تو سوں لائس کے اُفق پر گویا چاندنی سی چھا جاتی تھی۔ وہ  
 بھی اپنے بدن کی مقناطیسی وقت سے بے خبر نہ تھی۔ وہ اپنے بالوں میں بنگال کمیکلز کا  
 مشک بوجو کونٹ بیسٹیل ڈال کے لگنگی چوتی سے اگستہ ہو کر نکلتی تھی۔ ما تھے پر بندی،  
 ہونٹوں پر مسر رام کی سنگار میز سے چراۓ ہوئے لپ اشک کی دھڑی، ناخنوں پر عنابی  
 پالش، گردن میں خم، چھاتی میں ابھار، گالوں پر پاؤڑ، انکھوں پر لگادٹ۔ کوٹھیدیں کے  
 خانسماں باورچی خانے چوڑکر اس سے راز کی ایک بات کھنے مرک پر آجاتے تھے مہتر  
 کمود کے پاٹ جھاڑیوں کے تیچھے چھپا کر اس سے نیاز حاصل کرنے کی تلاش میں منٹلاتے  
 رہتے تھے۔ سفید برائق وردیوں میں ملبوس بیرے جیسوں میں بیکٹ اور دل میں ارمان بائے  
 اپنی دریوی کا انتقال کرتے تھے جیکیلی کاروں میں فراٹے بھرتے ہوتے دیدہ زیب،

خوش بہاس، دل بھینیک بوڑھے اور جوان بھی اسے گھوڑے بغیر گئے نہ بڑھتے تھے۔ سول لائن کی کالی اور گوری بیمیں اس سے جلتی تھیں۔ کالے اور گورے صاحب اس پر مرتے تھے اور ایک سالوں سی، سادہ سی، معمولی سی آیا نے آرستہ بنگلوں اور پیر اسٹے کو ٹھیک ہوا کی اس دنیا پر روان کی قوس قزح بن دی تھی۔

ہم نمبر کی کوئی میں مسٹر ایم الال رہتے تھے۔ ۸ نمبر میں مسٹر ایم الال رہا۔ یوسف، ۳۱ میں مسٹر چڑھی، ۱۸ میں مسٹر نواب۔ باقی کو ٹھیکوں میں بھی انسان ہی آباد تھے۔ لیکن ان کی بیویاں بد صورت تھیں یا پردے میں۔ ان کی بیٹیاں شاید بھی جوان نہ ہوئی تھیں۔ ان کے خاندان روزے رکھتے تھے یا مندر جاتے تھے۔ ان کے مرد شراب پینے سے سمجھا چکا تھے۔ ان کی عورتیں غیر مرد کے سلسلے سے بھی ڈرتی تھیں۔ سول لائن میں ان کا وجود یوں تھا، جیسے زعفران کے کھیت میں سرسوں، یا شراب کے پیالے میں جوشانہ یا سارے کھستہ کبابوں میں ہڈی کے ٹکڑے۔ یہ کو ٹھیکوں سول لائن میں گم گشتہ مزاروں کی طرح آباد تھیں۔ جن پر نہ کوئی چھوپل چڑھتا ہے، نہ چراغ جلاتا ہے۔ نہ دل تھام کے دوکھنے دعا ہی کے ادا کرتا ہے۔ ان کو ٹھیکوں میں خانساماں کو باورچی کہتے ہیں۔ پر وہ کو خود سمجھا اور بیویوں کے ساتھ شادی کرنے کا رواج تھا۔ راج کے وقت یہاں بھی رومان کے فرشتے اترتے تھے لیکن ان کے نغموں کی صدائے بازگشت عموماً ایک نئے نئے کی ریس ریس روں میں منتقل ہو جاتی تھی۔ ان خاندانوں میں خدا کی ذات پر ایک معصوم سا یہاں تھا کہ جو پیدا ہوتا ہے وہ اپنی روندی بھی ساتھ لاتا ہے۔ لیکن وہ یہ فراموش سا یہاں تھا کہ جو پیدا ہوتا ہے وہ اپنی روندی بھی ساتھ لاتا ہے۔ کر دینے تھے کہ خدا کی سلطنت میں بھی ٹاکوآباد ہیں۔ جو زنگ بھی چڑھاتے ہیں، بھنگ بھی چڑھاتے ہیں، اور گندم کے سنہری خوشے بھی! جس کی لاٹھی اُس کی جیسیں فرق تو سفیدیا در کالے تنوں کی قیمت میں بھی ہے، پھر انسان کی زنگت میں اتیاز کیوں نہ ہو، کوئی لوں کی دلالی میں منہ کالا۔ جس کی زنگت سفید جو وہ کوتلے کی کان میں جاتے ہی کیوں؟

درد کاحد سے گرتا ہے دوا ہو جانا اکونک جب حد سے کالا ہوتا ہے، تو ہیرا بن جاتا ہے۔  
 کشش تو ہیرے کی ہے، کونک کی نہیں۔ یہ دسری بات ہے کہ کونک کی کافوں میں  
 ذہریلی گیسیں بھی ہوتی ہیں۔ ان میں حادثے بھی ہوتے ہیں۔ وہ پھٹ بھی جاتے ہیں اور  
 جب وہ پھٹتی ہیں تو زمین کی تھہ میں سوئے ہوتے کیڑے بھی ایک بار کروٹ لیتے ہیں!  
 مسٹرام لال کی آیا، آیا بھی تو کیا ہوا؟ عورت تو تھی۔ جوان تو تھی۔ . . . بخوبی  
 تو تھی۔ یوں کہنے کو عورت تو رام لال کی بیوی تھی۔ جوان تو خان بہادر کی لڑکی بھی تھی خوبصورت  
 تو چیرجی کی بیوہ ہو بھی تھی، لیکن خالی عورت ہونے اور جوان ہونے اور حسین ہونے سے  
 تو کائنات کی کنجی ہاتھ میں نہیں آ جاتی!

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے

مزاتوجب ہے کہ گر توں کو تھام سے ساقی

یہ ایک تھام لینے کا گر تھا جو آیا کے ہاتھ میں تھا۔ وہ پچھلے ہوتے جذبات کی بدری میں  
 بنتے ہوتے پانی کی طرح بہہ جانے نہ دیتی تھی۔ وہ ایک اڑٹستھ تھی۔ فن کار کا کمال یہ ہے کہ  
 وہ زندگی کے عکس کو زندگی سے بھی خوش نما اور رنگیں بنانے کے دکھلتے۔ آیا کامال یہ تھا کہ  
 وہ عورت ہوتے ہوتے بھی عورت سے زیادہ پُرکشش تھی، خانسماوں، بیرون، همت و  
 کی بات دسری تھی۔ وہ اپنی چرطی چڑی، تھکن آلو دا اور زرد روپیوں سے اکٹا کر ایک الیسی  
 دنیا میں پناہ لیتے تھے، جہاں تصور ہی تصور میں وہ بنتگلوں میں لیسے والی دودھ کی  
 طرح گوری، بالائی کی طرح نرم اور لشیم کی طرح نازک، عورتوں کو اپنی بانہوں کے درمیان  
 جھنچھوڑ دیتے تھے۔ مسٹر چیرجی کا خانسماں رمضان دل ہی دل میں اپنے مالک کی بھی  
 سے عشق لڑاتا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ وہ مسٹر چیرجی کے پچھوں، پیالوں اور گلاسوں کو  
 اپنی زبان سے چاٹ کر نزک دیتا تھا۔ جب مسٹر چیرجی اپنے پچھوں سے پنگ کھاتی تھی۔  
 یا پیالوں سے چاٹے پیتی تھی، یا بلور کے رنگیں گلاس سے شیری کا پیگ نوش کرتی تھی۔

تو رمضان خان سماں کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ مسٹر چیرچی کے عنابی ہنوٹوں کو چپانے چنان  
بچوم رہا ہے۔

تو ہمیں نادان چند کلیوں پر قناعت کر گیا! رام پرتا ب مہتر نے ایک دوسری طرح  
اپنی تنگ دامان کا علاج تلاش کر لیا تھا۔ وہ خان بہادر یوسف کے گھر کا بھنگی تھا۔ سول روپے  
ماہوار میں اسے تین غسل خانوں کا کام سمیٹنا پڑتا تھا۔ خان بہادر اور یگم کے غسل خانوں میں  
جاتے ہوئے اُسے گھن آتی تھی۔ بیڑا درود کی کے پس خورده، بھارت، فیا بیطس کے  
ایلیسومن کی بدبو۔ کر سبھن سالٹ کے فیض کارڈ عمل ..... وہ اس غیر طبعی ماحدوں کی  
عفونت سے گھرا ہوتا تھا۔ لیکن نعمت آرائے غسل خانے میں جاتے ہی اس کے دل  
کی دنیا میک اٹھتی تھی۔ نعمت آرائخان بہادر دکی اکلوتی بیٹھی تھی۔ پکے ہوئے آڑو کی ہڑج  
جو ان۔ رام پرتا ب کو نعمت آرائے غسل خانے کی فضائیں گلاب اور چپا اور موتیے کی  
سوندھی سوندھی خوشبو کا لطف آتا تھا۔ وہ بار بار دوڑ کر صابن کی گلی بھیکیوں کو چھوٹا تھا اور  
شر ما تھا، کیوں کہ وہ نعمت آرائے مشک بُتن بدن کی آشنا تے راز تھی۔ تو یہ کی فرم  
زرم تازہ تازہ نم آ لوگی، اتارے ہوئے کپڑوں میں سلگتی سی آج کا احساس، نہانے کے  
ٹپ میں پانی کے بلبلوں کی آنکھیں سر و درفتہ کا خمار۔ رام پرتا ب مہتر غسل خانے کی چیزیں  
اندر سے بند کر کے نعمت آرائے شب میں بیٹھ جاتا تھا۔ نعمت آرائکیلا صابن اس کی کافی  
کافی کھرو ری جلد کو اپنی ریشمی اور مشکب ارجھاگ کے غبار میں چھپا لیتا تھا اور جس طرح طفیل  
کی رگڑ لوہے کے ٹکڑے میں بھی کشش پیدا کر دیتی ہے۔ اسی طرح نعمت آرائے کوئی  
کی رگڑ بھی رام پرتا ب کے خیف اور خمیدہ بدن میں پکے ہوئے آڑوں کا رس بھروسی  
تھی۔ غسل خانے کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے وہ تصوف ہی تصویر میں اپنے روپیں  
روپیں کو نعمت آرائے مرمریں وجود سے آباد کر لیتا تھا۔ ایسے وقت اس میں اتنی ہمت  
بھی نہ ہوتی تھی کہ وہ ہونچوں پر تاؤ دے کر دوز محمد را بیور کے سامنے تین کھڑا ہو جاتے

اور اپنی چھاتی کی ایک مگر سے اُسے پچھاڑ کے رکھ دے!

روزِ محمد ہڑا چاہا بک دست ڈرایتور تھا۔ وہ بہت سی نازک انداز حسیناوں کو پہلویں بھٹکا کر موڑ چلانا سکھا چکا تھا۔ ایسے موقعوں پر اچھی سے اچھی کارکے کل پُر زے بھی چھخنا اُٹھتے تھے۔ ابھن کی رفتار خوفناک طور پر تیز ہو جاتی تھی اور خوف وہر اس بیم و رجا اور بے بسی کے اس عالم میں روزِ محمد کے مضبوط باز دستے ہوئے حسن کا سہارا بن جلتے تھے۔

عورتوں کے جسم پر بھی روزِ محمد ایک ہوش بار ڈرایتور کی طرح چھی تلی نظر ڈالتا تھا۔ چنانچہ اس نے دیکھی سنی، جان پہچان کی عورتوں کے نام بھی کاروں کے موڈل افادان کی ساخت پر موزوں لیکے ہوئے تھے۔

بیگم یوسف فور ڈی ۱۹۲۸ء تھی۔ مسٹر رام لال باٹر ہوک، مسٹر چپڑی بھی کی بیوہ ہوئیں۔ کہنیدوڑیا۔ راستے صاحب کی لحیم و شحیم ہیوی، ہمیرہ کا کشادہ سیلوں۔ کبھی کو وہ ٹومیر کتا تھا۔ کبھی کو رسیں کار۔ کبھی کو بنی آسٹن۔ اور آیا کا نام اس نے تیکسی رکھا ہوا تھا۔ سیٹی بھائی اور حاضر۔ میرے حساب سے آٹھ آنہ فی نیل کراچی ہالٹ کا سوارد پیغمہنٹ۔ کبھی کچھار روپیہ آٹھ آنہ کی بخشش۔ دنیا میں کتنا ہی لوگ ہیں جن کے پاس بیش قیمت گلاں بھا کاریں ہیں۔ لیکن وقت بے وقت ان کو بھی تیکسی پر چڑھنا ہی پڑتا ہے۔ خیر روزِ محمد کا فلسفہ تھا کہ دنیا میں صرف موڑ ہی نہیں چلانی جاتی، عورت بھی چلانی جاتی ہے فقط چرانے کا سلیقہ چاہیے اور چلنے کا بھی۔

رات کے گیارہ بجے جب سول لائن کی دنیا پر گناہ و ثواب کے چتکہ ساتے چھا جلتے تھے۔ عورتوں اور مردوں کے دجلے بلانا غرمنعقد ہوتے تھے۔ مردوں کی مجلس روزِ محمد کی کوٹھڑی میں ہجتی تھی! اس میں خانہ اماموں اور برادری، مسائیجیوں، مسٹروں اور ڈرایتوروں کی برادری کے ارکان شرکیں ہوتے تھے۔ وہ خیال کی آنکھوں

دیکھی اور دل کے کانوں کی سنی کہانیاں بیان کر کے روزِ محمدؐ کو ٹھہری میں رومان کا ماحول کھڑا کر دیتے تھے۔ ایک خانسماں سنانا تھا کہ اس کے بناتے ہوئے شامی کتابوں پر عناب ہونٹوں کا ایک جڑا بے طرح جھپٹتا۔ ایک بیرا کہتا تھا کہ کاں ٹیل کا جام پڑھاتے ہوئے صفات اس کے ہاتھوں نے کسی کی مخروطی انگلیوں کو چومن کے رکھ دیا۔ ایک مسالچی کہتا تھا کہ مصالحہ پیستے ہوئے اس نے پانی کی بجلتے اپنے دہن کا لعاب ملا دیا۔ ورزیدہ محبت اور ردمان کے یقتنے روزِ محمدؐ کے کمرے کی فضائی موعظہ کر دیتے تھے۔ لیکن چھر رام پرتاب ہوتا اس زنجین ماحول میں گندے اندے کی طرح آپکیتا تھا۔ عنابی ہونٹوں، مخروطی انگلیوں اور لذیدگالوں کے ذکر میں وہ نعمت آرائے کمود کا قتنہ لے بیٹھتا۔ لیکن اس قتنے میں بھی رس ہوتا تھا۔ اور خانسماں، بیرون، مہتروں، مسالچیوں کی یہ برادری باور پری خانزوں سے لے کر پاسخانوں تک کی چار دیواری میں اپنی جشت گستاخ کا سراغ پالیتی تھی۔

آیا دُن کی محفل میں رومانی قتنے چلتے تھے۔ وہ سر سے سر جوڑ کر روز خود می اور سر بے خودی کی تفسیر گردانتی تھیں۔ وہ تو اپنی کو ٹھیوں کے خلوت اور جلوت خالیں کی آشنا تے راز تھیں۔ پروردشِ انسانی میں ان کا درجہ گویا مان کا درجہ تھا۔ ان کے پاس جسم اور روح کی بایدگی کے اوکھے گز تھے۔ سنار بالا کی طرح ان کی آنکھ سب کے بیٹے و انکھی۔ بچتے تو سکون پاکران کی چھاتی پر سو جاتے تھے۔ لیکن جوان اور بوڑھے اپنی ماڈن کو پہچاننے سے قاصر تھے۔ آیا میں مسکراتی تھیں کہ حلپو بیٹے خوش تو ہیں! چنیں ہوا تو کیا، چنان ہوا تو کیا!

یوں بھی زندگی عزیز کی خاطر انھیں سو طرح کے ڈھنگ رچانے پڑتے تھے۔ زبان کے چھار سے کے ریلے خانسماں دُن کی خوشامد نئے پرداں کے بیٹے دھوپری کی منت۔ مکے دلکھے کی صڑوڑت کے ریلے مہتر دُن، مسالچیوں اور بیرون کی جماعت،

نوجوں کے لیے تو خیران کا وہ جو دم و سلوٹی سے کم نہ تھا۔ لیکن اپنے مالکوں کے لیے بھی وہ نعمت خاتمے کا حضوری جزو تھیں جنہیں وہ وقت بے وقت وال القبده لئے کے لیے فوش فرمایا کرتے تھے۔ اس پر بھی یہ شکوہ تھا کہ آیا تین آوارہ ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا! ایک دن روز محمد کار دھونے تالاب پر گیا تو اس کی نظر آیا پر ڈری۔ وہ نیلے کنارے والی سفید دھوتی بے پرواں سے بدن پر یعنی طیبی بال سکھا رہی تھی۔ آیا کو دیکھ کر روز محمد ہاڑ بجا رجما کر دساوں کے نظارے ہیں۔ ... ۔ ۔ ۔ گانے لگا۔ آیا نے اپنے ہونٹ دانتوں میں بھینچ کر اسے غصے سے گھورا۔

روز محمد اس کے پاس آگئی بیٹھ گیا۔ ہاتے ہاتے میری لاڑو تیرے فیشن پر انہی کی ماں۔ میں کہتا ہوں گوری، نمونیہ سے مر جائے گی توجہب دیکھو۔ تالاب پر نہماڑی ہے۔ مجھے بتاؤ تو سہی کیا ارادہ ہے تیرا؟“

”چل، روحِ جم۔ آیا روز محمد کو روحِ جم کہا کرتی تھی۔ وہ تو نے تو مذاق بنارکھا ہے مجھے تو کسی فیشن کی لٹ نہیں، اپنی ضرورت سے سرو دھوتی ہوں۔ تم کیا جانو؟“ روز محمد نے ایک مشتاق نظر آیا کے تن بدن پر دوڑانی۔ جیسے دہ موڑ کا نامار جانخ رہا ہو کہ ہوا پوری ہے یا کم۔ آیا نے شرما کار دھوتی کا پلپوک پر اچھی طرح لپیٹ لیا۔ روز محمد انہیں کے گوشے سمیٹ کر مسکرا یا۔

”وہ آخر لگنی نارینڈری کے پھریں، کتنی بار کہا تھا کہ سنجل کے چل۔ لیکن تجھ پر توجہ ان کا بھوٹ چڑھا ہوا تھا۔ اب بول کس سلے کو باپ بتائے گی؟“

”باپ بتائے گی میری بھوتی یا آیا نے تنک کر کہا۔“ میں تو اس کی ماں مجھوں کی۔ اسے باپ کی کیا پردا؟“

”اری چیپ رہ۔ تو نہیں جانتی سلے کو بھیوں والوں کو تجھے کان سے پکڑ کے نکال دیں گے۔ سور نے جنے کر کھا تین اور ملکھوں سے پر ہیز۔ چل تجھے لیڈی ڈاکٹر

کے پاس لے چلوں گا۔ جو سوپھاں خرچ آئیں گے میں دوں گا۔ تیری نوکری تو ہے گی میری لاڈو۔ روزِ محمد بھی یاروں کا یار تھا۔ ڈائیوروں کی منڈی میں اسے سخن لیٹرا کہا کرتے تھے۔

دم بھر میں آیا نے ساری کائنات کا جائزہ لے لیا۔ اس نے اپنی زندگی کے تشیب فراز پر نظر ڈالی۔ اپنی نوکری کا اپنیچا سوچا اور دنیا بھر کے بچے پانے والی ماں کو خود اپنے بچے سے فرار کی ہوتی دوسروی راہ نظر نہ آئی۔ اگلی صبح جب روزِ محمد کا ردھونے کے لیے گیا۔ تو تالاب میں آیا کی لاش تیر رہی تھی۔ اب اسے ڈھوٹ پڑھ رُخ زیبا لے کر۔

## ملاش

مایوس، غم دیدہ، ہزار..... گوراں فٹ پا تھپر ہوئے ہو لے جا رہی ہے،  
 جانے دو۔ اس کا جسم، اس کا اپنا جسم ہے۔ جس طرح میرا کوٹ اپنا کوٹ ہے یعنی  
 اس کوٹ کو سنبھال کے رکھوں یا پھاڑوں، خود پہنوں، یا نیچج دوں، یا کسی لاگبیر  
 کی جھوٹی میں ڈال دوں..... مجھے کون روک سکتا ہے۔ یعنی اپنے کوٹ کا لالک  
 ہوں۔ گوراں اپنے جسم کی ماں کے ہے۔ شاید اگلے موڑ پر کتنی لگتا ہوا راہ پر واہے خریدے  
 گا۔ خریدنے دو۔ مجھے پیشمانی کا احساس بھی کیوں ہو؟ دنیا کا نظام کار و باری لین دین  
 پر تو قائم ہے اور پھر گوراں کا جسم اس کا اپنا جسم ہے۔ اسے اختیار ہے کہ وہ جب چاہے،  
 اور جس قیمت پر چاہے اُسے نیچج دے۔ اپنی چیز ہے۔ اپنی چیز ہے سب قادر ہوتے ہیں۔  
 کوئی دوسرا اس میں ٹانگ کیوں اڑاتے خواہ مخواہ!

مرٹک پنکھی کے کھبڑوں کے رینچے دشمنی کے بڑے بڑے دھتے ہیں۔ کھبڑوں کے  
 درمیان سفсан اندر چیرا ہے۔ گوراں کی زندگی میں بھی تاریک ادا بلے سائیے ہیں۔ وہ

ترک کے کالے اور سفید دھبتوں کی طرح ساکن اور منجمد نہیں۔ زندگی کے سلیے چلتے پھر تے نشان میں تھتھاتے ہوئے سورج کے سامنے آوارہ بدیاں آ جائیں تو زمین پر ایک محدود سا سایہ چھا جاتا ہے۔ تھکا ہوا مسافر بے قراری سے اس کی طرف لپکتا ہے۔ بے وقوف آدمی! جوں جوں وہ سایہ اس کے قریب آتا جائے گا، چھاؤں کیجئے واسے ابر پارے اس سے دُور ہوتے جائیں گے۔ مجھے اس کا تحریر ہے میں نے کہا ”گوراں تم میری منزل ہو۔ مجھے اپنی منزل تک آنے دو“

گوراں نے کہا ”آجاو! میں بھی اپنی منزل کے لیے جھٹک رہی ہوں“ جوں جوں میں گوراں کی طرف بڑھتا گیا۔ میری منزل مجھ سے دُور ہوتی گئی۔ حسیے سراب کی طرف بدل گئے والا پیاس اسافر بھاگتا جاتے، بھاگتا جاتے اور انجام کارپانی کی ہٹنڈی اہروں کی جگہ ریت کے گرم گرم قدموں میں الک کے رہ جاتے۔ میں گوراں کی طرف بڑھتا گیا، بڑھتا گیا۔ اور جب میں نے گوراں کو قریب قریب پالیا تو وہ گوراں نہ تھی۔ وہ اس کا جسم تھا۔ خوبصورت، مرمریں۔ ستارے کے تاروں کی طرح کسائیا، جبھتاتا ہوا جسم عورت کی کائنات اس کا جسم ہی تو ہے۔ شاید گوراں کا مرمریں بدن سڑک کے الگے موڑ پر بک گیا ہو۔ لکنے دو مجھے ہمدردی کا احساس بھی کیوں ہو؟ وہ اپنے خوبصورت جسم کی مالک ہے۔ بالکل مختار جیسے مجھے اپنے کوٹ پر اختیار ہے۔

ظہیر میری باتوں پر ہنستا ہے۔ وہ میرا پرانا یار ہے۔ ہم برسوں ہم جماعت رہے تھے۔ اب قسمت کی قسم ظریفی نے ہم دونوں کو ایک ہی دفتر میں اکٹھا کر دیا ہے میں ساڑھے بارہ سو پانچ ہوں۔ ظہیر کی تنجواہ چالیس روپے ماہوار ہے۔ جب ہم کہیں اکیلے ہوتے ہیں۔ تو وہ بے مکلفی سے میرے سر پر چانٹا مار کر جنئے لگتا ہے:

”ابے اوصاحب کے بچے! تم روز بروز سڑی ہوتے جا رہے ہو۔ تلاس، فراڑ،

نفسہ..... بیس کھتا ہوں سب بکھار سے ہے۔ تم کیا جانو عورت کس چیز کا نام ہے؟ میری طرف دیکھو، جب میری جیب میں سارہ ہے پائی آنے کے پیسے ہوتے ہیں، تو میں صبح سویرے سیدھا علم دین سبزی والے کی دکان پر پہنچتا ہوں۔ اور ہمیری الک لیتا ہوں، ڈیڑھ پاؤں، دو پیسے کے ٹھاٹر۔ اور کسی کو یہ شکایت نہیں ہوتی کہ مجھے سبزی خریدنے کا ڈھنگ نہیں آتا! لیکن اگر کسی روز کو نی حرامزادہ ضرورت سے زیادہ ٹھنگ کر دے، اور میری جیب میں دو ایک روپے کھنکتے ہوں، تو میں سبزی منڈی میں جا کے لٹک جاتا ہوں اور دل ہی دل میں سوچتا ہوں کہ علم دین کی دکان بھی کوئی دکان ہے جہلا؟ باسی مال، سڑے ہوتے پتے، گندی لوگریاں۔ میں پر جدیاں کی دکان میں جھانکتا ہوں۔ کرتار سنگھ کے خوب صورت مثال کا جانزہ لیتا ہوں اور دل ہی دل میں گوہی، مٹر، چقدار، سلا او را تناس کے ڈامنز اسے، بنی، بسی کا تجربہ کرتا ہوں۔ لیکن حساب ٹھیک نہیں جنتا۔ کبھی دنامز کے اجزا امیرے درد پوں سے آگے نکل جاتے ہیں۔ اسی ادھیرین میں سارہ ہے دس بج جلتے ہیں۔ میں جلدی جلدی کسی چھاڑی والے سے نکلی مشری سبزی تلوکر بھاگ بھاگ واپس آتا ہوں۔ بیوی ناک بھوں چڑھاتی ہے۔ خالی پیٹ دفتر جاتا ہوں۔ اور وہ حرامزادہ آفس پر نہنڈنٹ میرے لیٹ آنے پر لکھیں نکالتا ہے۔ کیا سمجھے بیٹا ہے..... میرے چالیس روپوں پر دو لاکبوں کے باپ رستجھے۔ میں نے ایک کو پھانس لیا۔۔۔ تھارے سارہ سے بارہ سو پرہبت سی ٹکلیاں اور ان کی ماہیں بھنپھنارہی ہیں۔ دو ایک کو پھانسو اور عدیش کرو۔۔۔ درنہ لکھتے رہو گے بچہ! جس طرح میں کرتار سنگھ کے مثال پر لٹک جاتا ہوں۔۔۔“ ظہیر کی زبان پر عورت کا نام ایک لذیذ چٹخارے کی صورت میں آتا ہے۔ کافی کے دنوں میں اسے چاٹ کا شوق تھا۔ جب کبھی املی کے پانی سے بھرے ہوتے گول گپے منہ میں ڈالتا تھا، اس کے ہونڈوں سے چار چار انگل لمبی رال ٹکپا پڑتی تھی۔

اور دہ کسی خاموش نذرت سے بلبل اٹھتا تھا۔

ہاتے ہاتے، کیا ختنہ گول گپا ہے ..... جیسے مس کلیانی کے لال لال

ہونٹ پھل رہے ہوں!

چاث کے ہر تازہ لقمنے کے ساتھ وہ اپنے کابج کی رکبیوں کا کوئی نہ کوئی حسین  
حقنہ نگل جاتا تھا! مس کلیانی کے ہونٹ، خالدہ کے دیکھتے ہوئے گال، نذریش کی  
خانی انگلیاں .....

ظہیر کرتا ہے: عورت شہد کی کمی ہے۔ وہ زندگی کے خشک اور بے کار چھتیں میں  
رس بھرتی ہے۔ اس کے زبردیے ڈنگ پر نہ جاؤ، اس کی رسیل مٹھاں دیکھو۔ تم نے  
نیما کو دیکھا ہے؟ اندر سین ڈسیچر کی خوبصورت یہوی۔ وہ پا جی اسی دفتر میں گناہ سا  
امیدوار تھا لیکن نیما کی رعنایوں نے دفتر کی شاہراہ پر نگھنیں جال بچا دیے۔  
اس کا ایک دل پھینک ناخدا زیر الدام آگیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اندر چوپ میں اعیاد رو  
کے اور سے چلا گھٹا ہو اڑ پسیچری کی کرسی سنجھاں بیٹھا۔ ہاتے عورت کی نگاہ!  
میرے بھائی! اس کی نگاہ سے نسیخیریں کٹ جاتی ہیں۔ تقدیریں بدل جاتی ہیں۔  
نگاہِ مردِ مومن کی تلاش کون کرے۔ ذوقِ یقین کا سوداگی کون ہے۔ ڈینا  
ہے تو عورت کی گود میں۔ عقبتے ہے تو اس کی مُسکراہٹ میں۔ میں دیکھتا ہوں کہ اب  
اندر سین ہیٹہ کلر کی کے خواب دیکھ رہا ہے، نیما کی بلوڑی گردن میں اب پھر طفیل  
خم پیدا ہو رہے ہیں۔ خدا کی قسم اس سہری گرداب میں بنتے تھلف گو دجاو۔ ایک  
بچاری ہیٹہ کلر کی کیا چیز ہے، تم میری مانو تو اس مرمری گردن کے ایک حلقة پر دفتر  
کی ساری کائنات اندر سین کو سونپ دو۔ ہاتے کیا لورج ہے ظالم کی گردن  
میں۔ جیسے عرب خیام کی رباعی تھرک کرناج رہی ہو.....

ظہیر میں ایک بھی بڑا عیب ہے۔ وہ عورت میں عورت کو نہیں دیکھتا ہے

عورت میں اس کا جسم مٹولتا ہے اور پھر جسم میں بلو ری گردنوں نماچھی ہوئی انکھوں اور اور دھڑکتے ہوتے سینوں کا جائزہ لیتا ہے۔ اسی پر اس نہیں وہ جسم کی بزرگانی، حسن کے ہر قریب، سینے کے ہر شیب و فراز کو بیو پاری کی نظر سے ناپ توں کے ان پر قیمتیں کے سیل لگادیتا ہے نیلماں کی گردن کے خم کی قیمت میرے دفتر کی ہیڈ کلر کی ہے صادقہ اس کی بیوی ہے۔ لیکن ظہیر کرتا ہے کہ صادقہ کی گھنی اور گھنکھری ای زلفوں کی قیمت چالیس روپے ماہوار ہے۔ چنانچہ پہلی تاریخ کو وہ اپنی ساری تخریج صادقہ کی جھوول میں ڈال دیتا ہے جب کبھی دفتر میں اس کی سیئی معمول سے زیادہ گرم ہو جاتے تو وہ اپنا غبار بکار کرنے کے لیے پھیجی جاتی یا گلن اسیکم پارتنا باتی کے کوئی میں پناہ لیتا ہے اچھی جاتی میں روپے ... گلن اسیکم پانچ روپے ..... رتنا باتی دس روپے، کیونکہ اس کے گال پر ایک نھسا تک ہے۔ اور اس کے عنابی ہونٹوں میں پکتے ہوتے انگروں کا رس چھکلتا ہے۔ ایک دن وہ گوراں کے چوبارے میں گیا۔ اس کی حیثیت اسودہ تھی۔ اس نے ایک ایک روپے کے میں نوٹ گوراں کے سامنے بچھا دیے۔

گوراں نے کہا: آپ یہ نوٹ اپنے ہی پاس رکھیں۔ آپ میری قیمت نہیں دے سکتے؟

ظہیر نے سوچا، وہ بنی رہی ہے۔ اس نے گوراں کو اسی قیمت پر چکایا تھا۔ اس نے اپنا بڑھنکال کرہوا میں اچھاں اور فر سے بولا ہو مانگو کیا مانگھی ہو جان تھنا آج تمہارا ظہیر خوشحال ہے؟

گوراں نے ایک ٹھکی ہوئی انگڑائی لی، ظہیر صاحب، میں روز روپیہ کملی ہوں۔ آپ روز روپیہ لشاتے ہیں۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ آج ایک محکم کے لیے آپ مجھے گدال نہ سمجھیں۔ ایک عورت سمجھیں ..... ایک لمحے کے لیے آپ کامک نہ بنیں، ایک مرد بن جائیں۔ بس ایک دو بے نوٹ لمحے میری حیات کو جاوید کر دیں گے:

ظہر ہنسنے لگا۔ وہ اُتو کا پچھہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ دہ گوراں کے کھوئے کھوئے اضطراب کو سراہتا تھا۔ اس نے زبردستی اسے میں روپے دے دیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اذل سے گوراں کی تعمیر میرے ریسے ہوئی تھی۔ کائنات میں اس کا وجود میرے وجود کا عکس تھا۔ لیکن جب ہم ہیں، تو ہمارے درمیان ایک وسیع اور بھیانک خلاہ منہ چاڑ کھٹا تھا۔ وہ اپنے چھبیسوں سال پہن ہے جو چھلے تیرہ برس سے وہ ہر روز تک روی کے گوشت کی طرح ترازوں میں شکل کر رکھتی رہی ہے۔ سینکڑوں ہزاروں انسان اپنی پشت ہالپشت کی کچھڑاں پر اچھال چکے ہیں۔ بنی نوع انسان کی صدیوں کا سیاہ کار فہر گوراں کی رگ رگ میں سمیا ہو ہے۔ ایک قاتل بیماری کے انگارے اس کے خون میں چلک رہے ہیں۔ اس کی گلاب کی پتیوں جیسی ملامم اور مشک بار جملے کے نیچے بڑے بڑے گھاؤ ہیں۔ لیکن وہ کہتی ہے کہ محبت کے بے لوث لمحے، اس کی حیات کو جا دید کر دیں گے!

میں نے کہا۔ "گوراں! اگر تو کائنات کے آخری کنارے پر بھی ہوتی تو میں ارضِ سماک و سعیتیں پھاند کرتی رہے پاس ہنچ جاتا ہا۔"

اسکی جسم بے داغ جسم نہیں۔ اس کا جسم پامال جسم ہے۔ پھول کی طرح پامال نہیں جو گوراں کے ایک ہی دباؤ سے لٹٹ کر مر جاتا ہے۔۔۔۔ بلکہ شرک کی طرح جس کی چھاتی پر بھک بھک کرتا ہوا سیم رو را دھر سے اور صڑا دھر سے اور ہر لینا جائے۔۔۔۔ پیل چلنے والے جو تیاں چٹھاتے گزرتے جائیں ٹم ٹم اور ٹانگی تھجی تھج کرتے نکلتے جائیں۔ موڑیں گرداثتی بھاگتی جائیں۔ سڑک گھستی جاتے۔ پچھڑوٹتھے جائیں، لیکن گزرنے والے گزرتے رہیں۔ چلنے والے چلتے رہیں اور پھر میونپلی کامیم رو رجھک بھک کرتا ہوا آتے۔۔۔۔۔۔ گوراں میں یہ بات تھی کہ وہ اپنے خوبصورت جسم کو میونپل کیسٹی کی سخت سڑک کی طرح بچھا کر آپ ایک طرف کھڑی ہو جاتی تھی۔

پیدل چلنے والوں کی طرح تھنکے ہوتے تکارک، موڑ کی طرح سبک رفتار چھوکرے سٹیم  
دول کی طرح بھیختکے ہوتے مولٹے ہوتے سیٹھ .. . . . . یہ آئے، وہ گئے، یہ  
گرے وہ پھسلے ای بیٹھے وہ بھاگے .. . . . اور گوراں کنارے کھڑی مسکلتی  
رہتی تھی، گوراں اور گوراں کے جسم کے درمیان ایک ذبر دست دیوار ہیں حائل  
تھی۔ اس دیوار کی بنیاد ایک ناخنی سی اُرزو پر قائم تھی۔ وہ آرزو دنیا کے خزانوں سے  
موقی یا ہیرے یا ریشم کے انبار نہیں مالگتی۔ وہ زندگی کے دو بے لوٹ لمحوں کی خیرات  
چاہتی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے دھر طرکتے ہوتے لمحے جو اس کی کھڑکی پر ڈالتی ہوتی ہیں،  
چکلی کو جاؤ دانی نسکون دے سکتے تھے۔

و دامتیہا فراٹھے بھو یا دند رہیں گے۔ جب وہ انسورنس پالسی نیچنے والوں کی طرح شادی کا بیکر کر کے اپنی لاٹل بیٹیوں کو مکلف شہزادوں کے اندر دھکیل دیتے ہیں۔ ثروت، مجیدہ، زہرہ، خورشید، بخی، عفت..... سب خوشگوار لڑکیاں ہیں۔ حسین، بیجد حسین، ہستاروں کے جھرمٹ کی طرح، جو نیکی نیلے انسان کے درمیان بچکھا ہے ہوں۔ ان کے مکتنے ہوتے چکلے جسم..... او میرے خدا یا! ان کے مکتنے ہوتے چکلے جسموں میں چاندا اور سورج اور کہکشاں نے اپنا سارا یاری لٹکے رکھ دیا ہے۔ ان کی نیلی اور بیخ آنکھوں میں ٹرے بڑے خوش آئندہ پام بھکلتے ہیں۔ لیکن ان کی تمناؤں کی معراج مستقبل کے سہانے پیسوں میں ہے۔ وہ آنے والی کل کا انتظار کر رہی ہیں۔ یکیونکہ انھیں اپنے ہوش راحسن کا خراج وصول کرنا ہے۔ آراستہ بنگلے چکلیں گاڑیاں، جھر کیلے بیاس.... میں ڈرتا ہوں کہ شاید وہ اپنے مصروف لمحوں میں سے ایک بے لوث لمحے کی زکوٰۃ دے سکیں گی۔

میں نے ظہیر کی خوشاملی کی، کہ دوست انگوڑل کی زندگی کو جاویدنہیں کر سکتے۔ خدا کے لیے اسے بیرے پاس لے آؤ۔ دنیا کی ساری آبادی میں ایک وہ سیری مقتول بانت ہے۔ «مقدس؟ اسے توہ توہ ای؟» ظہیر کا نوں کو ہاتھ لگاتا ہے..... ہم نہیں جانتے گوراں کو، اس کے جسم میں اتنے اتنے لمبے جراحتیں ہیں۔ گلتے ہوتے، زہریلے، ہملک کیڑے..... تم مقدس کہتے ہو، اس سڑتی ہوئی لاش کو؟»

میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ظہیر کے منہ پر زور کا نھپٹا مارا۔ اس کے سچلے جہڑے کا ایک دانت کٹاک سے ٹوٹ کر قالین پر جا گرا۔ ظہیر نے گرم گرم، شرخ شرخ خون کی ایک کلی غصت سے نگل لی..... اور اگلے دوز گوراں کو لے کر آیا۔ وہ آئی۔ بچکھتی ہوئی، رچکچاہتی ہوئی، لجاہی الجائی سی۔ جیسے زندگی کے طوفان میں کہیں دُور اُفقی لکھرید ایک روشنی کا مینار آہستہ آہستہ اُبھر رہا ہو۔

ایک دن میں نے کہا، "گوراں، تمہارا بچہ بارہ تھیں زیب نہیں دیتا۔ تم اپنے بالاخانے کے پٹ مغلل کر دو۔"

گوراں حیران سی ہو گئی۔ اس کے خوشنما ہونٹ تعجب سے کھل گئے۔ دیکھو! وہ بولی:

میں نے کہا۔ "گوراں، تمہارا وجود معمولی سطحیوں سے بہت بلند ہے۔ تم بالاخانے کی کھڑکی میں بیٹھنے والی گوراں نہیں ہو۔ تم کرسی کے خوابوں میں بیٹھنے والی عروضات نگہیں ہو۔ اگلے جیسے ہم دونوں نیلگری کی شاداب پہاڑیوں پر جانے والے ہیں۔ میں تم کو کوہ نور کے سینے ٹوپیمیں داخل کر دوں گا۔ سینیٹوریم کا بڑھا سپر ٹنڈنٹ میراد دست ہے۔ وہ تمہارے خون کے قطرے قطرے کوزہر میں چنگاریوں سے پاک کر دے گا۔ تمہاری نس نس میں جو دلکتے ہوتے گھا فیس وہ بھر جائیں گے۔ تمہارے جیوں کو جھوٹن کھا رہا ہے، وہ مٹ جائے گا۔ . . . . ."

"تم سچ کتھے ہو،" گوراں نے کہا، "لیکن میں تمہارے سامنہ نہیں جاسکتی میرے بالاخانے کے پٹ میری روزی کا راستہ ہیں۔ میں انھیں کسی بند کر سکتی ہوں بھلا؟"

مجھے گوراں کی جہالت پڑھتا آگیا۔ میں نے اس کی لکھنی لفتوں کا گچھا بنالکاس کے منہ پر بہت سے کوڑے مارے۔ تو تم اپنے بالاخانے سے اپنی روزی کا سماں رکھو گوراں، کیا سچ مج تم سمجھتی ہو کہ میں ساڑھے بارہ سو ہیئتہ صرف اپنے لیے ک رہا ہوں؟

گوراں کھلکھلا کر منس پڑی۔ اس کی آنکھوں میں تیز تیز شعاعیں ہیصلیں اور بھر گئیں۔ اس کا اور والا ایک دانت کھج سے پچھے ہونٹ میں دھنس گیا اور بھر پکایک دو چار وحشی جھٹکوں کے سامنہ اس نے اپنی احراری سازی کو تازتا کر کے رکھ دیا۔ پلک جھکنے میں میرے سامنے گوراں نہ تھی۔ اس کا جسم تھا۔ خوبصورت مرمری ستار

کے تاروں کی طرح کسا ہوا۔ جھنجھلا تا ہوا جسم

”و تم میرے سب سے بڑے گاہک ہو۔“ وہ میرے ساتھ لپٹ کر مجھے دونوں پانچوں سے فوچنے لگی۔ گوران کی قیمت بیس ملکے رات تھی۔ تم اسے ساری ہے باہ سو مہینہ پر چکار ہے ہو۔ تم میرے سب سے بڑے گاہک ہو۔ مجھے اپنا شکریہ ادا کرنے دو۔“ اس کے لابنے لابنے ترخ ناخن کئی بلکہ میرے جسم میں کھب گئے۔ ایک خون آشام نظر اس نے چاروں طرف دوڑائی۔ میز کے الگالدان کو اٹھا کر زور سے پٹخ دیا۔ اپنی ساری ہی کمیجھے ہوتے ملکروں کو سمیٹا۔ اور آہستہ آہستہ چل گئی۔ جیسے دُور سے چھکنے والا روشنی کا پینار سہمند کی لمبیوں میں تخلیل ہو جاتے۔ گوران کی سسکیبوں یہی پیٹھی ہوئی ایک اُوانیور ہی تھی..... وہ تم میرے سب سے بڑے خریدار ہو۔ تم بھی مجھے زندگی کا ایک بے لوث لمحہ زدے سکے۔ تم میرے سب سے بڑے خریدار ہو۔“ تم بھی مجھے زندگی کا ایک بے لوث لمحہ زدے سکے؟“

ماہیوں، غمیدیہ، بیزار گوران فٹ پانچھ پر ہوئے ہوئے جا رہی ہے۔ جانے دو۔ وہ اپنے جسم کی مالک ہے۔ شاید اگلے موڈ پر کوئی لگز تا ہوا را ہر واسے خریدے گا..... خریدنے دو۔ مجھے اس پر کوئی اختیار بھی تو نہیں.....“

## دُورنگا

نام خمیر پیشہ انجینئری لیکن عرفًا سے دورنگا کہتے تھے۔ اس نام سے اس کو جڑا  
تھی۔ لیکن یہ اس کے بس کاروگ نہ تھا۔ اس کے منہ پر برس کے بڑے بڑے دھبے تھے۔  
گالوں پر، ماٹھے پر، ہونٹوں پر، کانوں کے پاس، مٹھوڑی کے نیچے، گردن کے ارڈگرڈ،  
آنکھوں کے پپولوں پر۔ ہر جگہ سفیدی کے بڑے بڑے چوڑے چوڑے داغ تھے جن  
کے درمیان جا، جا اصل جلد کے کالے کالے نشان بے ترتیب سے بھرتے ہوتے تھے۔  
جیسے سمندر کے جھاگ پر کوئاں کے ذرے تیر رہے ہوں۔

کچھ لوگ اسے دھوپ چھاؤں کہتے تھے۔ لیکن یہ نام اس کے دفتر کے کلککوں  
اور چپر سبیوں تہاں ہی محدود تھا۔ کیونکہ وہ اس کے مراچ میں دھوپ کی تیزی اور دسمبر  
کی کمپا دینے والی چھاؤں سے کافی واقع تھے۔

دورنگی جلد، دورنگا مراچ، قسمت بھی اس کی زندگی کو برپا کرو دو۔ غلام بنا نے میں مد  
د سے رہی تھی۔ چنانچہ جب وہ لندن سے انجینئری کا امتحان پاس کر کے لوٹا، تو اپنے

ساختہ ایک سفید فام بھور سے بالوں والی چھپو کری بھی لیتا آیا۔ بار برا ایسٹ اینڈ کے ایک چھوٹے سے قبوہ خانے میں برلن وصوئے پر ملازم تھی۔ اس قبوہ خانے میں برلن وصوئے والیوں کی تعداد برتنوں سے بھی کچھ زیادہ تھی۔ تاہم لوگ وہاں حقوق درج حق قبوہ پینے جاتے تھے۔ کچھ من چلے ہندوستانیوں نے اس جگہ کا نام قحبہ خانہ رکھ دیا تھا۔ لیکن انگریزی زبان کی بے ریاس اگلی میں ہائے ہزار اور ہائے حظی کا اقیاز ممکن نہیں ہے۔ اس سیلے جو قبوہ پینا چاہتے تھے، وہ قبوہ پیتے رہے۔ اور جو قبوے کی جگہ قبوے کے برتنوں سے دل چپی لیتے تھے، وہ برتنوں سے دل چپی لیتے رہے۔ درستگاہ بھی دل چسپیوں کا عاد تھا۔ لیکن ایک دن یک ایک اس کے برلن بمالب بھر کے چھکاں اُٹھتے، اور ررض کے سفید داغوں کی طرح بار برا بھی اس کی زندگی کے ساتھ چپک کے گاگ گئی۔ حادثات ہی تو ہیں! جب وہ لاہور کے گورنمنٹ کالج میں پڑھا کرتا تھا۔ اسے اپنی سیاہ جلد کی یک ریٹنگ اور پہنچلی پر ایک عجیب قسم کی مکتری کا احساس ہوتا تھا۔ نیو ہوٹل میں ایک لطیف مقام کہ دنیا کے کامل ترین چاندگرین کا حساب لگانا ہوتا کالج کے رہنمی سے ضمیر کی تاریخ پیدا شد۔ نکال کے اس میں سے نو مہینے کے دن تفویق کر دو.....! مذاق ہی مذاق میں رُط کے اسے اپنے بستکی سفید چادروں سے اٹھا دیتے تھے۔ پختہ رنگ ہے بھتی۔ پسینے کا ایک قطرہ بھی پیک گیا، تو داغ ٹوچ جائے گا! وہ دل بھی دل میں اپنی کلاس کی زیب النسل سے محبت کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا، کہ اس کی محبت کی انتہای ہے کہ وہ ایک بار زیب انسان کے عنابی ہونٹوں کو چومے۔ وہ سادگی پسند اور قناعت شعار عاشق تھا۔ اس کا ایمان تھا کہ محبت کو سرمایہ دارانہ لाभ کے زہر سے بے لوث رکھنا چاہیے۔ خوبصورت عورت چلتا پھرتا فور ہے۔ وہ سب کی مشترکہ امانت ہے۔ اس کی ایک چھتائی ہوئی گلن زندگی کو مرشار کر سکتی ہے۔ چنانچہ وہ زیب انسار سے کہا کرتا تھا، کہ تو دنیا بھر کے عاشقوں کی مساوی پوچھی ہے۔ اس میں یہی محبت کا حصہ صرف اتنا ہے، کہ میں ترے نازک اور خون آشام

ہر ہنڑوں سے ایک چھوٹا سا ملمس چڑھاؤں !  
زیب النساء نے کہا یہ بہت خوب مجھے منتظر ہے۔ لیکن کیا آپ مجھے یگارنٹی دیتے ہیں کہ آپ کے ہر ہنڑوں کا زانگ کچا نہیں ہے ؟ ..... ”

لندن پنج کھنیر کے ساتھ دو حادثے پیش آئے۔ ایک تو یہ کہ اس کی زندگی میں دور بھگی علامات کا فلمور شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے اس نے ٹرینے شوق سے دیست اینڈ کی ایک دکان سے ڈنائٹ ٹلو کا بالکا ساڑھے سوت بنوایا۔ یہ دوسری بات ہے، کہ اس سوت کی نمائش کے وقت اس سے ایک فاش، لیکن معصوم غلطی سرزد ہوئی۔ یعنی جب اس نے پہلی بار اپنا سیاہ ڈنر سوت پہننا اس وقت دن کے ایک سنبھلے لمحے کا ٹھامنہ کھا لاتا تھا..... شاید قدرت کو یہی منتظر تھا کہ ضمیر کی جلدی کی سیاہی اس کی اجلی خواہشات کے راستے میں حائل نہ ہو۔ اس لیے ایک دن بیٹھے بھلے اس کے بدن پر برس کے ٹرے ٹرے سفید داغ نمودار ہونے لگے۔ قدرت فیاض بھی ہے اور بخیل بھی۔ بُقُسْتی سے وہ ضمیر کے حق میں بخیل ٹاہت ہوئی۔ کالی جلد پر سفیدی کا جو عمل جاری ہوا تھا، وہ ادھورا ہی رہا۔ ضمیر کا اور والا ہنڑ اپنی اصلی حالت میں سختا لیکن سچکے ہر ہنڑ پر دھی کی چھٹکیاں سی بکھری ہوئی نظر آتی تھیں۔ جیسے وہ بر قاتی ہوئی نمکین لستی کا گلاس پی کر ہر ہنڑوں پر بان پھرنا بھول گیا ہو! اگر زیب النساء لندن میں ہوتی، تو وہ شوخ اور شرور طبکی ضرور طلاقی۔ .... ”میں نے پہلے ہی کہا تھا، تھا زانگ کچا ہے۔ جو لندن کے ایک ہی چھینٹ سے ڈھل گیا۔”

دوسری حادثہ ایسٹ اینڈ کے قبوہ خانے میں پیش کیا۔ یعنی بار برا برس کے سفید داغوں کی طرح اس کی زندگی کے ساتھ چیک گئی ..... اس نے دنوں صعیبتوں سے چھٹکارا پانے کے لیے بہت سی بندوں جمد کی۔ بہت سارے دیپے لٹایا۔ لیکن کوئی دوا، کوئی اپریشن اسے نجات دلانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ شکست کے

شکست ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ تاریخی میں روشنی تلاش کرتا تھا۔ میری جلد ہمیری جلد زخم خوردہ ہے۔ ہوا تی جہاز کے ایک حادثے میں پروں ٹینک کو الگ لگتی پکتے ہوئے شعلوں نے چار انجمن کی اس نایاب مشین کو دیکھتے ہی دیکھتے ناک کر دیا۔ فرض کی انجام دہی بہر عالم میں لازمی ہے۔ پاکٹ کو بچاتے بچاتے میرا اپنا جسم مجلس کے دھتوں ہو گیا۔ لیکن فرض آخر فرض ہے..... میری بیوی؟ میری بیوی نکاشا ر کے سر دلیم میکفرسن کی الکلو قیمتی ہے۔ ان کے کار خانوں کی مملوں دینا بھر کی منڈیوں میں کھپتی ہے۔ بار برا بڑی خود دار لڑکی ہے۔ ہماری پہلی ملاقات پر ائمہ نماشہ کی گاڑی پارٹی میں ہوتی..... کوئی تراہزادہ کہتا ہے وہ ایسٹ اینڈ کے قدوہ خلنے میں برتن دھویا کرتی تھی؟.....

جب وہ جہاز سے اُترے تو بہتی کے تاج محل میں ان کی ملاقات راجہمار دلادر سنگ سے ہوتی۔ درونگا کار آزمودہ شکاری تھا۔ لندن میں اس نے بہت سے نزلے گزیکھے تھے۔ ایسٹ اینڈ والے کافی ہاؤس کامائک قہوے کے ساتھ بیکٹوں کی جگہ بہان چھو کر یا بیچتا تھا۔ ایسٹ اینڈ کی اینڈ لیڈی مالدرا مہان بچانسنسے کے لیے اشتہار کی جگہ اپنی خوبصورت ریکیاں دیا کرتی تھی۔ دور بگے نے آتے ہی بنسی کے ساتھ بار برا کا کچلتا ہوا بدن چیکا کر کنڈی دریا میں ڈال دی۔ دلادر سنگھ لالچی محلی کی طرح پیکا، اور بچنس کے اہم گیا۔ شمپین، وسکی، کاک ٹیل اور تاج محل ہوٹل کی بھرپرکیلی رقص گاہ آدمی رات تک بار برا سفید ریشم کے چھوٹوں کی طرح دلادر سنگھ کی پانوں سے علیٰ ہوئی سماجتی رہی۔ الگ صبح یکم راجہمار کو یاد آیا کہ اس کی بیاست کے لیے ایک قابل انجینئر کی فوری ضرورت سے۔ دور بگے نے تباہل عارفانہ برداونا چیز ملازمت کے قابل کہاں ہے۔ کار صاحب! اپنی طبیعت تو سیلان ہے۔ آج بہاں کل وہاں۔ اور پھر یہ انجینئر تو وقت کاٹنے کا بہانہ ہے.....

بادیوں کے چھا سرویم میکفرسن کے کار خانوں میں ..... راجہمار دلادر سنگھ نے  
نکاشاڑ کے سرویم میکفرسن کے کار خانوں کی تفصیل پڑے اتھاں سے سُنی اور پھر سوندھ  
گداز کے ساتھ اپنی زبول حالی کا نقشہ بیان کیا ..... رعایا کی غربت پر بسی بھی آئیں  
بھویں۔ تجارت اور صنعت کی سُپتی کا رونار دیا۔ اپنے پیکاں درکس ڈیپارٹمنٹ کی نیابت  
پر لعنت بھیجی۔ اور پھر ریاست کی ترقی کے امکانات پر بھی روشنی ڈالی۔ گھنے اور قیمع  
جنگل، ہیزر و پھر اڑی ندیاں، نیلم اور سونے کی چھپی ہوئی کامیں ..... ہزاروں سال  
سے زمین کی چھاتی خزانوں کے انبار سنجھا لے بیٹھی ہے۔ اگر مسٹر ضمیر جامیں تو انسانی  
سے اس نیا ب دولت کو بلے نقاپ کر کے ریاست کے لاکھوں بھجوکے بنگ  
انسانوں کو مالا مال کر سکتے ہیں ..... بار برا نے بھی کہا کہ اپنا وطن چھوڑنے کے بعد  
اب بھی میرا وطن ہے۔ یہاں کی غلامت اور سُپتی کو فور کرنا ہا لانا انسانی فرض ہے۔  
..... اور اس وقت تاج محل ہوٹل کی بالکنی پر کھڑے ہو کر دشمنگ ہفتہ پر جھوپی  
برتن وھونے والی اور ساڑھے چار شنگ رات پر بخے والی چھوکری نے اپنا اغلب  
اور انسانی فرض بے باق کر کے رکھ دیا۔ اس نے راس کماری سے لے کر چمالیہ  
پریت تک جتنے گندگی کے ڈھیر ہیں، اور گندگی کے ڈھیروں میں جتنے رینگے والے  
انسانی کیڑے ہیں۔ ان سب کی سنجات کا بڑا اٹھایا، اور مسٹر ضمیر الدین جلالی، احسان  
فرض سے مجبور ہو کر سرویم میکفرسن کے کار خانوں کی جگہ سورج نگر کی ریاست میں  
انجیشتر بن گئے۔

”بے شرم ہے سالا“ رمضان علی اور سیر کتا تھا۔ ”اس سے تو اچھا تھا کوئی  
میں بھا دیتا اپنی ماں کو۔“

”بھی عورت کیا ہے، بڑی ٹیکسی ہے میکسی“ تیر تھدا م اکاؤنٹنٹ چھکا سے  
یہاں کرتا تھا۔ دل جہاں دل جھوپل رہی ہے۔ اسی کہتے ہیں رختار کا زمانہ،“

”سلے لکھو کی شکل تو دیکھو“، خزان چند ڈرافٹس میں اپنے نئے انجدیز سے  
بیزار تھا۔ نقشوں کی الف سے ب-نک نہیں آتی اور مصیبت میں ڈال رکھا ہے  
ہم کو ماں کے خصم نے“

”جب دیکھو نئے میں گٹھ ہوتا ہے، ہن کا یار جہاں جائا ہے۔ پہلے چھوکری  
ماں گتا ہے..... بیٹے نے کہا سنبھال کے رکھا ہوتا سالی ٹکیسی کو.....“  
پنڈت بالک رام کو طیش آتا تھا۔

”ارے میاں، ہشاؤ قضیہ“، مولوی تمیز الدین کا خیال تھا۔ ”جو چھوکری دیتا ہے،  
وہ چھوکری کے گاہی لا حول ولا قوہ۔ لیکن یاد، پاہی کا جسم یوں جمکتا ہے، جیسے...  
.... تھو تھو“

سارے دفتر نے کسی خیالی بدبو سے گھن کھا کر اپنی ناکمل پر رواں رکھ لیئے۔ اصل  
میں دورنگے کے تن بدن میں ایک عجیب قسم کی تمیزی مشراند بسی ہوئی تھی۔ لندن جلنے  
کے بعد اس نے کھانے کے بعد کلی کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اور کمود کے بعد پانی کی جگہ ٹالکٹ  
پیپر کا استعمال جاری کر دیا تھا۔ ایک توہنہ و ستافی موسم۔ دوسرے ہندوستانی معده یہ  
روگ ٹالکٹ پیپر کے بس کا نہ تھا۔ چنانچہ دورنگے کا مندا درپتوں ہجیشدہ بٹھے زور سے  
ہملا کرتے تھے۔

دورنگاریا ست کی وزارت کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس لیے بار بار لکھیف  
لوچ میں اور بھی زیادہ لطافت بھرنے کی ضرورت تھی۔ اُسے ساڑھے سات سو روپیے  
ماہوار ملتے تھے۔ لیکن اس حقیر سی رقم کے پس منتظر میں سو درج تھوڑی کھلی ہوئی بستجریاں  
تھیں۔ بار بار کے میک اپ کی قیمت تھوڑا سے پوری ہوتی تھی۔ اس کے لباس کا  
خراج کمار کے تھوڑے سے چلتا تھا اور دو زنگا ہو..... دورنگے کا گزارہ رشوت  
پر تھا۔ وہ رشوت میں روپیہ بھی لیتا تھا، اور عورت بھی۔ اس کے دستخط اٹھانے

سے کے کپانی ہزار تک بکتے تھے۔ اس کی رات ملک کوٹنے والی پھاڑن سے لے کر کسی متعوب اور سیر کی سمی ہوتی دلمن کے ساتھ گزر جاتی تھی۔ اگر عناب کے نزد سے عورت یا روپیہ ملنے کی اُمتید ہو، تو عناب نازل کرنا بذاتِ خود ایک خوشگوار عمل ہے۔ ایک ہزار بڑا اپنے عمل سے مطالبہ کرتا تھا۔ ایک ہزار ممکن نہیں۔ بیوی؟ بیوی نہ سی، بیوی ماں؟ بیٹھی؟ ..... دوستگے کی نظر میں سورکے گوشت سے لے کر چیل کے انڈے تک سب حلال تھا۔ اور ایک روز جب امام پھر اسی کے سامنے زندگی، موت اور روزی کا مستکہ درپیش محتاواں نے آئھیں بند کر کے اپنی فوبرس کی محمودہ کو انجینیر صاحب کے کمرے میں دھکیل دیا۔ محمودہ دینکار انجینیر کے منہ پر کالے اور سفید داغنوں پانگلی پھر کے ہنسنی رہی اور پھر تالیں بجا بجا کر کمرے کے ایک سرے سے دوسرا سرے تک بھاگنے لگی۔ بدآہاجی، تم ننگے ہو گئے میں ابا کو بتاؤں گی۔ آہاجی تم ننگے ہو گئے ....."

دور ننگے کے محلے میں روپوں کی بھری ہوتی تھیں اور چھوکری کے بھرے ہوئے جسم کے درمیان ترقی کے دروازوں کا کھل جاسم سم پوشیدہ تھا۔ ترقی کے دروازے ہی نہیں، روح اور جسم کا رشتہ قائم رکھنے والے دونزوں کا دار و مدار بھی ایک چھوکری کے کالے پیلے یا بھورے جسم پر قائم تھا۔ اگر کسی روز اس کی حیب یا گود خالی رہ جاتی تھی تو اسماں سے آنے والی روزی کا ایک سورج بند ہو جاتا تھا۔ ایک روز جب دو ننگے ..... بدبو سے ملکے ہوتے دور ننگے ..... بکی نوک قلم نے قاضی عبد القدوس، روڈ محترم کے رزق پر بندش کی مہر لگادی، تو بچاۓ قاضی کو اپنی نمازی اور اپنے روزے بے کار نفر نہ لگے۔ ان کی اُمتیدوں کا آسراخدائی مسند کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کی دال روٹی فرشتوں کے دوش پر آسمان سے اُترتی ہے ..... اور اب جوانہوں نے دیکھا کہ ایک بد صورت، گھنا و نا

دو زنگا انسان کے آب و دانے پر مطلق طبع پر قادر ہے ..... تا ناخنوں نے  
مسٹ پھار کر اپنے خدا کو ایک فخش گالی دی۔

ایک روز دوزنگا باغیچے میں بیٹھا ہوا ادنگھ رہا تھا، یک ایک کوٹھی کے صحن  
سے پہلے گایاں اور پھر بخیس سناتی دیں۔ وہ بھاگ کر اندر گیا۔ اس کا خانہ اسماں ہے  
خان کچن کے پاس پڑھنچ رہا تھا۔ اس کی چھاتی پر کوٹھی کا ہتر چیتے کی طرح سوار  
بیٹھا تھا۔ اس کے اکٹھے ہوئے پنجے جماں خان کی گردن کو فوج رہے تھے ....  
سالا حرامی۔ ہماری مہر پا کوتا کتا ہے؟ خون پی لیں گے سالے حرامی کا ....”

صحن کے کونے میں ایک کالی کھونی ڈھینٹی سی عورت سمجھی ہوئی کھڑی تھی۔ دوزنگا  
ہنسنے لگا، کہ یہ اکتو کا پٹھہ ہتر آخڑ کس نعمت کے لیے یوں اکٹھ رہا ہے۔ چڑیل ایسی  
صورت ہے حرامزادی کی۔ اس نے ڈھہ کہ ہتر کی پٹھہ پر گس کے ایک لات جملائی۔  
شاید ایسے ہی کچھ شدید جھٹکے ہوتے تھے، جو کبھی کبھی دور بھگے کی چھاتی میں  
سوتے ہوتے ضمیر کو بیدار کر دیتے تھے۔ ایک لمحہ کے لیے اسے اپنی بار برا باد آئی۔  
وہ شاید اس وقت کمار بہادر کے ڈریسٹگ ردم میں نیم بہمنہ اپنا میک آپ کر رہی  
ہوگی۔ کمار لچکیے دیوان پر لیٹا ہوا اسے ہر پہلو اور ہر زادیے سے سچانہک رہا جو گانجیا  
ہی خیال میں ضمیر غصے سے بیتاب ہو کر کمار کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ اس نے اپنی تیز  
ناخنوں والی انگلیاں کمار کی پچولی ہنوتی گردن میں گاڑ دیں۔ وہ زبان نکال کر بھاگ کر  
کمار کا گرم گرم خون چاث جائے ..... اور عین اس وقت کبھی لے اس کی  
پٹھہ پر زور سے لات جادی۔ یہ دوزنگا تھا۔ دوزنگا زور سے ہنسنے لگا.....  
ڈیم نان سنس! اس نے جماں خان کے سینے پر چڑھ سے ہوتے ہتر پر دو چار لاتیں اور  
کس کس کے مار دیں۔ شکل تو دیکھو چڑیل کی جس کے لیے اکٹھ رہا ہے سالا، اگر ہتر  
میں کچھ ہمت ہوتی، تو وہ ضرور جواب دینا، کہ یہ سالا تو جھریل کے لیے اکٹھ رہا ہے لیکن

تم اپنی بھوول جسی بار برا کے لیے کیوں نہیں اکٹھاتے؟

آخر ایک دن دوزگا صح مچ کر گئی..... بار برا کے لیے نہیں اپنی ملازمت کے لیے وہ دیکھ رہا تھا کہ چند روز سے ایک گنڈھیا کام را ہوا سائنس سالہ پارسی بڑھا اس کے دفتر میں داخل در معقولات دینے لگا ہے۔ یہ مسٹر باٹلی والا بعینی کی کسی سیمینٹ کمپنی کا ہیڈر اکاؤنٹنٹ رہتا۔ اب وہ کمار کی درخواست پر ریاست سورج گنگیں سیمینٹ کے کار خانے قائم کرنے کا آیا تھا۔ ریاست میں لامم سٹون کی کوئی پہاڑی تو نہ تھی، لیکن مسٹر باٹلی والا کے ساتھ اس کی جوان بیٹی ضرور تھی۔ مس باٹلی والا کے سینے پر برفیلی چوتیوں والے اُپنے اوپنے کسار تھے۔ ان مرمریں چٹانوں سے اوقل درجے کا کام پھیل کر کسار کے جم گئیں، اور ایک روز مسٹر ضمیر الدین جلالی خزانی صحت کی بنا پر استغفار سے کرنکاشا نے سردیمیکفرس کے کار خانوں کی تلاش میں بھکتہ ہوئے دہلی ہاگئے۔

دہلی میں اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ بار برا کو بھلی، پانی، بھاپ کے ایک شخصیہ مسپتال میں داخل کروادیا۔ وہ دیکھتے تھے کہ راس کماری سے لے کر ہمالیہ پر تکہ نہزادی غلافت کے ڈھیر ہیں۔ اور ان ڈھیروں میں لاکھوں کیڑے رینگتے اور مرست ہیں۔ وطن عزیز پھوڑنے کے بعد بار برا نے ایسے ہی کثافت کے گھواروں کی سنجات کا بیڑا اٹھایا تھا۔ کیا فطرت کی مہربان طاقتیں بھلی، پانی، بھاپ کے اثر سے اس کا ہاتھ نہ بٹائیں گی؟

## جلتزنگ

صبح سے اس کے دوبار تکسیر چھوٹ چھکی بھی۔ خالد کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے ناخنوں میں گرم گرم بیت ڈال کر اندر سے جلس دیا گیا ہو۔ سانس کی ہوا بھر کتنی ہمتوں لا لیں کے دھوئیں کی طرح کشیف اور گھٹی ہوتی محسوس ہوتی بھی۔ وہ تنگ اگر تاک کو روپال سے بند کر لیتا تھا۔ اور منہ کھول کر سانس لینے لگتا تھا۔ لیکن چند ہی لمحوں میں اس کا گلا خشک ہو کر سوکھے ہوتے پتے کی طرح چڑھ رانے لگتا تھا۔ ..... وہ زور زور سے رو دینا چاہتا تھا، لیکن روند سکتا تھا۔ اب وہ سیانا ہو گیا تھا۔ اگلے سال میزبانی کیش کے امتحان میں بیٹھنے والا تھا۔ محلے کی اڑکیاں جن کے ساتھ وہ مٹی کے گھروندے بنائے کھیلا کر تھا۔ اب اس کے سامنے جسم چڑھا کر سمت جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ جانا نہیں بھی اس کو اپنے ساتھ چاپانی پر بٹھا کر روز نامہ انقلاب زور زور سے پڑھ کر سننے کو کہا کرتا تھا۔

جما پہلوان کے ساتھ چاپانی پر بیٹھنے کا اعزاز محلے میں بہت کم لوگوں کے

حکھے میں آتا تھا۔ گلی کے نکر پر اس کا تور تھا، جس کے ماتھے پر خوش لندیدہ ہوٹل از طرف بھال دین پہلوان خادم قوم، کاسامن بورڈ لشکار ہتا تھا۔ ہوٹل میں ایک باورچی تھا۔ اس کا نام تاج تھا، موقع و محل کے لحاظ سے جما پہلوان اسے خانسامان بُٹلر، بواسے، تا جوا اور الٹوگی دم فاختتے کے مناسب القاب سے بلا یا کرتا تھا۔ خوش لندیدہ ہوٹل کے عقب میں ایک بو سیدہ چھجاتھا جس کے نیچے بہت سی ٹیڑھی ریڑھی پاپا یاں بچھی رہتی تھیں۔ شہر میں آئے ہوئے مقدمہ باز دیہاتیوں میں یہ جگہ بہت دلعزیز تھی۔ کیونکہ جھوپوں پہلوان صرف ۱۲۔ آنے نقد کے عوض انھیں کھانے ملے گوشت اور چپاتی، سونے کے لیے ایک چیل بنجیں چارپائی اور مقدمہ نے کے لیے مشورہ مفت دیا کرتا تھا۔ ہاری ہوتی آسامی کے لئے پہلوان بڑی بدستی سے اپیل دائر کرنے کے لئے، گریوں میں دہی کی لستی اور سروپوں میں چانے کے ساتھ پرانٹے تیار رکھتا تھا۔ جتنے والوں کے لیے تاج دین خانسامان مرغ فرنگ کر لیتا تھا یا پلاٹا در قورسے کے ساتھ شامی کباب بنایتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ایسے موقعوں پر خوش لندیدہ ہوٹل کے نرخ فرایے لذت حدیک اور پنچھے چڑھ جاتے تھے، لیکن اگر ڈوبتی ہوتی ایمیدوں کو شکے کا سہارا مل رہا ہوا اور جیوں۔ اپھلتے ہوئے دل کے سامنے ہیں موقع پر جھنا ہوا مرغ اور کرادے کرارے شامی کباب رکھ دیے جائیں تو دیکھوں، مختاروں، پیش کاروں اور حکلکوں کی زد سے نیچے ہوئے چند سختیوں کے یاروں کے یار جھوپوں پہلوان کے ہوٹل میں خرچ کرنے میں بھلا کس کو اعتراض ہو سکتا تھا؟

ہوٹل کے سامنے ٹرک پر ایک مضبوط سی چارپائی پڑی رہتی تھی۔ اس پر جھوپوں پہلوان تھیں لگاتے میر مجلس کی حیثیت سے بیٹھتا تھا۔ گاہوں، ملقاتیوں اور مسافروں کے لیے اس پاس لکڑی کے بیچ اور لوہے کی کریاں پڑی رہتی تھیں بیٹھے بٹھائے دل میں کئی بار پہلوان کو شک جوتا تھا کہ شاید گوشت ٹھیک طرح بھونا نہیں گیا، شاید کیا بوں میں

مرچ زیادہ ہو، شاید قبیلے میں نمک کم ہو..... اس لیے وہ ہر گھنٹی دو گھنٹی کے بعد اپنے خاندان، بُلڈر، یا بواتے کو آواز دے کر گوشت کا بھرا ہوا پیارہ یا کبابوں کی پلیٹ منگو اکر چکر لیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی تاریخ دین صدائے احتجاج بلند کرتا تھا کہ ”پہلوان جی ایک بھی دفعہ اطیمان سے کیوں نہیں کھا لیتے؟ اب ہوٹل کی بکری کے لیے خاک پریز پچے گئی؟“

”ابے چل کہیں کا، اُتوکی دم فاختہ نہ ہو.....“ پہلوان اپنے چڑڑے سینے پر ہاتھ مارتا تھا۔ ”جان ہے تو جان ہے پیارے، تیرے باپ کی کمائی کھاتا ہوں سائے؟ آیا بڑا ہوٹل کا ماں ک؟“

ماں تو جو ہو سو ہو، لیکن خوش لفظ ہوٹل کو لندید رکھنا تاریخ دین کا فرض تھا۔ چنانچہ فرض کی بناءم وہی کے لیے وہ بھی عموماً دروازے کی اوث میں چھپ کر سالن اور کبابوں کا نمک چکر لیا کرتا تھا۔ عادم قوم اور عادم ہوٹل اور نوکر کی فرض شناسی کا سارا اندر بچکاے مسافوں پر گرتا تھا۔ لیکن جتوں پہلوان کامرتبا نہ برتاؤ اور حکیم نہ چرپ زبانی کبھی کبھی کوئی محسوس کرنے کی اجازت نہ دیتی تھی کہ سالن میں بوشیوں کی جگہ پیاز کی بڑی بڑی گنچھیاں تیر رہی میں اور کبابوں میں قبیلے سے زیادہ بیسیں کی ملاڈٹ ہے!

شام کے وقت جب خالد سکول کے گھیلوں سے لوٹتا توجہوں پہلوان اُسے آواز دے کر اپنی چارپائی پر ٹھالیتا تھا..... ”ہاؤ ڈیٹا خالد بابو..... اسے او تاریخ دین ایک پلیٹ میں مصالحہ دار ہونی بھوئی بوشیاں تولا و ذرا۔ دیکھتے نہیں ہیٹا خالد بابو آیا ہوا ہے..... اور جب پہلوان اور خالد دونوں مل کر بوشیوں کا چھمارہ ختم کر لیتے تھے تو روز نامہ انقلاب کا دور شروع ہوتا تھا۔ خالد فر فر اخبار سناتا، اور جتوں پہلوان لیٹیے ہی لیٹیے خبروں پر تبصرہ جاری رکھتا۔ وہ شہید ان طالبسوں کے نام پر چندہ اکھٹا کرنے کے لیے رضا کاروں کی ایک لٹولی کے ساتھ بیٹھی، مکلتہ اور حبیدر آباد کی طرف

گھوم آیا تھا۔ اس لیے وہ بین الاقوامی معاملات پر راستے زنی کرنا اپنا علمی حق سمجھتا تھا۔ اگر کچھ میں چین کا بادشاہ بیٹی کے پاس ہانگ کا ہنگ کا ملک، انگریزی ولایت کے عقب میں طرابس کامیدان جنگ۔ جمتوں پہلوان کے تبصرے میں تین چار چیزیں خاص طور پر نمایاں ہوتی تھیں۔ خالد کو کبھی کبھی اس بے نتی لاف زنی پر منسی آئی تھی۔ لیکن وہ پہلوان کو ٹوکنا خلافِ صلحت سمجھتا تھا۔ ایسا کرنے سے نہ صرف جمتوں پہلوان کی چار پانی پر پیڑھ کر صاحب الدار بیٹیاں اڑانے کا مڑا کر کر رہ جانے کا درختا۔ بلکہ پہلوان کی نظر میں اس کا علمی درجہ گر جانے کا بھی اندریشہ تھا۔ چنانچہ خالد مناسب طور پر پہلوان کی باتوں میں نعمہ ہی دیا کرتا تھا۔ پہلوان خوش ہو کر اس کی گردان پر ہاتھ پھیرتا..... شاباش، بیٹیا خالد بابو، خوب علم کمار ہے ہو، جلدی جلدی کالج کرو، بیٹیا اڈپی کمشنر کے رہو گے..... ہاں، جمتوں پہلوان کی بات پتھر پر لکھ رہے ..... ہاں!“ ڈپی کمشنر کا نام سن کر مقدمہ بازماسافروں کے کان کھڑے ہو جاتے تھے۔ وہ دم بھر کے لیے مختکے کی نے چھوڑ کر خالد کو ایک عجیب سی عقیدت مندی کے ساتھ دیکھنے لگتے تھے۔ اس وقت ان کے دل میں خفیہ سے ارمان اٹھتے تھے، کہ وہ کسی روز اپنے بیٹل کو شہر لا کر خالد سے ملا دیں۔ قسمت تو سب کی اپنے اپنے ساتھ ہے۔ لیکن کون جانتا ہے کہ یہ ملاقات کسی وقت ان کے بیٹوں یا پتوں کی مقدمہ بازی میں کام آجائے؟“ پتا پر پوت، گھوڑے پر گھوڑا، بہت نہیں تو تھوڑا۔“ جمتوں پہلوان کہا کرتا تھا کیوں نہ ہوا پنے باپ کا بیٹا ہے۔ شاباش سیرے شیر! جلدی جلدی کالج کرو بیٹا خالد بابو.....؟“

جمتوں پہلوان کے مند سے اپنے باپ کا ذکر سن کر خالد کو یوں محسوس ہتا تھا جیسے وہ بھی اگر کچھ میں چین کے بادشاہ کی طرح کوئی فرضی ہستی ہے ماس نے اپنے ماں باپ کو دیکھا تھا دھما۔ وہ ابھی ڈپر ھبرس کا تھا۔ جب اس کے

والدین ریل کے حادثے میں کٹ کر مر گئے تھے۔ خالد کو اس کے ماموں نے اپنے نیزہ سایہ  
لے دیا تھا۔ ماموں تو سجارت کے لیے زیادہ عرصہ باہر رہتے تھے۔ لیکن ممانی نے خاصی  
تجھے سے اس کو پالا تھا۔ وہ کسی حد تک اس کے ساتھ شفقت کا برتاؤ بھی کرنی تھی۔ البتہ  
جهان معاملہ خالد اور عزیزہ کے درمیان ہزوں وہاں ممانی کا انصاف کھلمن ھلا عزیزہ کا ساتھ  
دیتا تھا۔ عزیزہ اس کی اکلوتی میٹھی تھی۔ وہ عمر میں خالد سے تین برس بڑی تھی۔ لیکن خالد  
مجبوراً اسے اپنے کندھے پر بٹھا کر بازار لے جایا کرتا تھا۔ عزیزہ غصے میں اگر اس کا  
منہ نوج لیتی تھی، قلم توڑ دیتی تھی، کتاب پھاڑ دیتی تھی۔ . . . اور اگر ممانی سے پلتا،  
تو غیر بخالد۔ . . .

ایک روز وہ دونوں رضائی میں لیٹے ہوئے میں تک گنتی یاد کر رہے تھے۔ کسی بآ  
پر اُب کچھ گئے۔ عزیزہ نے کھٹ سے اسے گردن پر کاٹ کھایا۔ خالد کی قیض خون سے  
ٹھکر گئی، اور وہ شاید پہلا موقعہ تھا۔ جب ممانی نے خالد کے لیے عزیزہ کے منپر  
ایک زور کا تھپٹہ مارا۔ خالد کی گردن پر بائیں طرف دانتوں کا ایک گہرا سانشان اب تک  
نئے چاند کی طرح نمایاں تھا۔

شاید پچپن کے دبے ہوئے نقوش تھے، جن کی وجہ سے خالد کے دل میں اب  
تک عزیزہ کے لیے ایک بہم سی بے اعتنائی ڈر اور شاید لفتر کا بلا جلا جذبہ باقی تھا۔  
وہ عزیزہ کے ساتھ نہایت عین سرد ہری کا برتاؤ کرتا تھا۔ لیکن عزیزہ ایسی نہ تھی وہ  
خالد کے آرام کا ہر ممکن خیال رکھنے لگی تھی۔ وہ ہر طرح سے اس کے ساتھ خوبصورت ہائی  
کرنے کی گوشش کرتی تھی۔ لیکن خالد رکھائی سے مل دیتا تھا۔ عزیزہ اس کے کپڑوں پر  
استری کر دیتی تھی، کمرے کی چیزیں قربنے سے سجادیتی تھی۔ اگر اس کے سپیس درد ہوتا  
تھا تو سرد بادیتی تھی۔ اگر فٹ بال کھیلتے ہوئے اس کے پاؤں میں سچ آجائی تھی، تو اس  
کی رضائی میں بیٹھ کر گھٹنوں پاؤں دباتی رہتی تھی۔

ایک دن مملان پر وس کی شادی میں گئی ہوئی تھی۔ خالد انفلو نظر کے شدید سخا میں بدلہ پڑا تھا۔ اس کے انگل انگل میں درد کی نیسیں اٹھ رہی تھیں۔ عزیزہ نے اس کا سر دیا، بازو دیا تھا، کمر دیا۔ گھستے دیا تھے، لیکن خالد کراہتار ہا۔ عزیزہ بولی۔ میں ایک ترکیب کرتی ہوں خالد، تم سیدھے لیٹ جاؤ، میں تھارے سائے جسم پر ایک ساتھ دباو ڈالتی ہوں؟

عزیزہ نے اپنے بھرپور جسم کے سارے گداز کو خالد پسل ڈالا، لیکن اس کے درد میں کمی نہ ہوئی۔ عزیزہ لاکھ کھنچتی رہی کہ ذرا اٹھرو۔ ابھی ٹھیک ہو جاؤ گے۔ لیکن وہ جھلا کر اٹھا، اور کمبل اور ٹھک دوسرا سے پنگ پر جایا۔۔۔۔۔

اگلے سال وہ میرٹک کا امتحان دینے والا تھا۔ سکول میں گرمیوں کی چھپیاں ہو گئی تھیں۔ وہ صبح سویرے کتائیں لے کر کپنی باغ چلا جاتا تھا۔ اور دوپہر تک آتم کے پڑوں کی چھاؤں میں لیٹ کر پڑھتا رہتا تھا۔ اب کتنی روز سے کپنی باغ نہ جاسکا تھا۔ کیونکہ دوپہر کے وقت اُسے فکر ہوتا تھی۔ مہانی کا خیال تھا کہ گرمی کا خبردار ہے، تھوڑا بہت نکل جاتے تو اچھا ہے۔ تاہم انتیا طک کے لیے اس نے خالد کو گاجر کی کلوچی بنادیتی تھی، اور صبح شام تازہ مکھن میں کالی مرچ، اور کرتو کے مغز ملا کر اُسے چندا دیتی تھی۔ لیکن آج صبح سے اس کی دوبارہ فکر چھوٹ چکی تھی۔ خالد کو یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے اس کے نہضوں میں گرم گرم ریت ڈال کر اندر سے ج مجلس دیا ہو۔۔۔۔۔

اس نے بیزار ہو کر قولیہ کندھے پر ڈالا۔ اور غسل ننانے کی طرف چل دیا۔ شاید ٹھنڈے پانی کی بالٹی میں سر ڈبو کر اسے تسلیم ہو۔ لیکن غسل ننانے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اسے غصہ آیا۔ یہ بھی کوئی نہانے کا ٹائم ہے جعل۔ وہ غصے سے ٹپٹا تاہم الگ گھوٹا اور گھوٹتے ہی یونہی نادانستہ طور پر اس نے کھڑکی کی ایک دراز سے اندر کی طرف جا لگا۔۔۔۔۔ بھانکتے ہی اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا، اور جعل کی طرح ترپ کرنیجھے ہٹ

گی۔ پھر وہ لمحہ بھر کے ریلے مکا، ٹھٹکا، جھجکا اور چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھ کر ایک بار پھر جھانکا۔ گھوما، پھرا، پھکپایا۔ لیکن پھر جھانکا۔ اس باراں کی آنکھیں دراز کے ساتھ جنم کے رہ گئیں، جیسے مقناطیس کے ساتھ دو ہے کے لھڑکے چوت جاتے ہیں! یہ عزیزہ تھی۔ وہ جگ کاتے ہوئے موئی کی طرح صدف سے باہر نکلی کھڑی تھی۔ یا شاید وہ بجلی کی ایک آدارہ لڑی تھی جو کالی گھناؤں کے دبیز پر دوں سے باہر نکل آئی ہو..... اس نے اپنے گھنے بادل کی بیٹوں کو کھولा، اور ہاتھی دانت کی چھوٹی سی کٹاٹی کو ان کے پیچے خم میں الجھا کر دیر تک کھیلتی رہی۔ پھر اس نے زلفوں کے انبار پھسوڑ، بازو اٹھا کر دلوں ہاتھ بھوڑے اور کان کی طرح تن کا لٹکائی لی۔ خالد ڈرا، کہ شاید زور دے اجاتے گا..... اور سنگ مرمر کے دو تاج محل گر کر ٹوٹ جائیں گے! اگرے میں محبت کا ایک مرمری خواب سویا ہو ابھے۔ اگرے کے سچم میں چین کا با دشہ حکومت کرتا ہے... لیکن اگرے کے اس طرف بھی تاج محل ہیں۔ بر فیل چوٹیوں کی طرح دیکتے ہوئے کوہستان۔ ہمالیہ کی چھلانی پر بلتے ہوئے بلوہی میانارے..... عزیزہ نفع دنوں ہاتھوں سے بال سمیٹ کر بالٹی میں ڈال دیئے۔ پھر اس نے سر اٹھا کر گردن کو زور سے جھشکلا۔ برسات کی کالی گھنائیں بھکر پھیل گئیں۔ بارش کی بھوار فضائیں جھملانا نہ مل۔ ایک گستاخ قدرہ صبح کے ستارے کی طرح تاج محل کے کلس میں لٹک گیا۔ عزیزہ ثڑت سے اس پر پھپٹنکیں مارنے لگی۔ وہ جھوٹا رہا۔ جیسے سفید گلاب پر جڑے ہوئے شبکم کے موئی کو نیسم صون پھیلیتے مار رہی ہو۔ اور جب دھ مجبور ہو کر ایک مچلتے ہوئے آنسو کی طرح گرنے لگا، تو عزیزہ نے جھک کر اسے چوٹوں کے درمیان دبرچ لیا۔ وہ نہ رہی تھی۔ پانی کی لمبی پماڑی چشمیں کی طرح اپنا جائزگ بجانے لگیں۔ تاج محلوں کے طامن میں جمنا کے سیمانی دھارے بہنے لگے..... کوہستانوں پر کشکشاں کا غبار سا چھا گیا۔ میدانوں پر توں فوج کے فوارے سے چھوٹنے لگے۔ یہ مچلتا ہوا سیلا بکھاں جا رہا ہے؟ اس لے پناہ

ٹوناں کو کس سندھ کی گوئی سن جائے گی؟..... خالد کی بائیں سانپ کی طرح بلکہ  
 کرکھڑکی کی سلاخوں کے ساتھ لپٹ گئیں۔ پتھر کی دیوار میں ریشم جیسا لوچ آگیا۔ وہ دم  
 بدموڑ کے سینے میں سمایا جا رہا تھا۔ شاید اگلے لمحے وہ جھپک سے اندر جا گئے گا۔....  
 گرتے گرتے اُس کو ایک جھٹکا سارا گا۔ اس کی آنکھیں دم بھر کے لیے بند ہو گئیں۔ اسے  
 یوں محسوس ہوا جیسے وہ برفانی چوریوں کے ساتھ لپٹا ہوا نٹوکی طرح گھوم رہا ہے۔....  
 وہ ترپ کر چھپے ہٹ گیا۔ اس نے سر کو جھٹکا دے کر آنکھیں کھول دیں، اور جلدی  
 سے تو لیرہ اٹھا کر اپنی خشک ناک پر گڑنے لگا۔ اسے شک ہوا کہ شاید نکیر بھر بہہ  
 رہی ہے !!

## لے فے

لینے دینے کے پروپریٹی میں یا تو بینیے کو مہارت ہے یا ملکا اور پنڈت کو۔ دلوں کے خون میں اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے کی ر حق ہے، اگرچہ ان کا لینے والا ہاتھ ان کے دینے والے ہاتھ سے عموماً درازی مائل ہوتا ہے۔ لیکن یہ جو ایک معلق قسم کی لے دے انسانی سرشت میں گویا ازال سے موجود ہے، اُسے نہ لینے سے سر و کار ہے نہ دینے سے، البتہ تو تو یہیں یہیں والی گردان میں جتنی بامدادہ شکفتیاں نکل سکتی ہیں، وہ بے شک اسی ایک جذبے کی محتاج ہیں۔

غائب ہماری پہلی لے دے کا آغاز اس وقت ہوا جب آتا جزا اور با وادا ادم پیک بینی و گوش جنت کے باخیچوں سے گول کیے گئے۔ میاں ابلیس کے ہندوؤں پر ضرور مسکراہٹ پھیل گئی ہوگی۔ جب اس کے ٹھکراتے ہوئے خاکی مسجدوں کی زبان پہلی بار لذتِ ممنوع رسم سے آشنا ہوئی۔ اس کے بعد گرجا گھر کی زبان میں، جب اسماں رحمتوں کے دروازے دوبارہ بھل گئے، اور با وادا ادم کے ہندوؤں

اور اماں جتو کی بیٹیوں نے جو حق درحق اس دنیا کے فانی کو نہ اذنا شر فرع کیا تو گیا طوفان  
 نوح کے نام ضرورت ہے، کا پہلا اشتھار تیار ہونے لگا۔ اب تو اند دے اور بندہ  
 لے یا تختہ یا تختہ، سر سے کفن باندھ کے ..... وغیرہ وغیرہ، قسم کی نازک  
 عیا بیان عملی جامہ پانے لگیں۔ زن، زر، زمین کی آغوش میں جو رواستی لے دے کا چڑا  
 ہے، اس نے اپال کا کراک ایک طرف تو ملک گیری کی جوس کو بھر کایا، اور دوسری طرف  
 ذہنی بغاوت کے بیچ بوتے۔ پہلی صورت میں سکندر باظلم اور ہمکر کی جماعت کے بزرگ  
 پیدا ہوتے۔ دوسری صورت میں خبر آج کل کے افسانہ نویس ہی سمی۔ لیکن یہ طے  
 ہے کہ روزِ مرہ کی عامیانہ زندگی میں لے دے کی نشوونما بیس جو ترقی ہوئی اس کے  
 عملی پہلو کا سہرا بلا شرکت غیرے دکاندار کے سر ہے۔ خواہ وہ انجام کی منڈی میں ہو  
 یا کوٹھوں کے بازار میں ..... اور اس کے علمی پہلو کی ترتیب میں بی جھیلان  
 کا جو ہاتھ ہے، اُسے تسلیم نہ کرنا بے انصافی ہوگی۔ دروغ برگردن راوی بحکایت  
 ہے کہ سرائے میں مسافروں کی بانٹ چھانٹ میں جب کبھی ہمسایہ بھیڑاں فوں  
 میں فراشید قسم کا تبادلہ خیالات ہونے لگتا تھا۔ تو انھوں نے تو ٹو میں میں  
 کی فرسودہ ترکیبوں سے اگتا کراک ایک تازہ سلیقہ و شمام پر ایجاد کیا کہ میرا مسافر  
 تیرے سے مسافر کو .....  
 طویلے کی بلا بندہ کے سر لیکن چکلی ڈھعلی گالی گلکوچ کے مقابلہ میں یہ بادشا

طڑ بیان زیادہ مقبول ہوا۔ چنانچہ اب ب نفس نقیس لڑنے کی بجائے نواب  
 صاحب بیڑا اور شاعر حضرات شعر رانے لگے۔ خدا جنت نصیب کرے، جن  
 دنوں مشا دین کی دھوم دھام تھی، ادب کا معیار اپنے جو بن پر تھا۔ فو عروس  
 کی طرح سچ دصحیح کر محفل جسی ہوئی ہے۔ مقانت، سمجیدگی۔ وقار کا غلبہ ہے۔ لوگ ہر تن  
 گوش دوز اونٹھیتے ہیں۔ پھر وہ پر سکرت ہے۔ لیکن آنکھوں میں صبر شک

بے نامیاں تریپ رہی ہیں، کنکھلو تو میدان میں ہم بھی دیکھیں لئے پانی میں ہو۔.... بارے شمع  
کو گردش ہوئی ایک طلاقہ سا اٹھا، اور کسی نے گرج کر مطلع داغا۔ اب کیا سخا، مصرع  
سے مصرع ٹکرانے لگا۔ رویف سے رویف، مجھی قافی سے قافیہ بھڑا۔ مضمونِ لڑنے  
لگا۔ اور پاک بچکنے میں گویا پانی پت کھاتا رینی میدان سمت کراں تھی سی مجلس میں اُمد  
ایسا۔ نظرودن کے تیرتاناں تماں چھوڑے گئے۔ پکوں کی ششیر نے برق کی طرح گوند کردا شجاعت  
دی۔ کالی زلفیں، زبرناک ناگنیں بن کر لرا تیر، گھنٹھرپائے بال زنجیریں بن کر بھیلے۔ کچھ  
بچارے قید ہوئے۔ کوئی بسل ہوا۔ کسی نے آہ کی۔ کوتی واہ واہ کا نعروہ لگا کر تڑپنے لگا۔  
اور جب موذن نے اندک بزر کی بانگ دی، تو شمعِ گل ہوتی۔ سب نے اُنھکر دامن جھاڑی  
اور خراماں خراماں حاصل مشاعرہ لگان۔ تھے ہوتے اپنی راہ گئے۔

یکن ثبات ایک تغیر کو ہے زبانے میں! ارفہ رفتہ ہوا کا رخ بدلتے لگا۔ بزرگوں کو  
شکایت ہے کہ جوں جوں شاعری کا جو ہر کیا ب ہوتا گیا، شاعرودن کی تعداد بڑھنے لگی۔  
شاعروں کی جگہ قوالوں کا رنگ جما۔ میرزا سواد کے غنچہ اور فلمدان کی جگہ رسالوں نے  
سبھالی، اور غالب و ذوق کی تیکھی تیکھی توک جھونکنے تلقیدی مقابلوں کا بھروسہ پ  
لیا۔ تلقید کو دراثقیل قسم کی لے دے ہی سمجھیے۔ یکن جب وہ پھٹے ہوتے لفاظوں پا  
ھٹلی چھپیوں کی صورت میں تقسیم ہونے لگے، تو یوں نظر آتا ہے، جیسے وہ صیغہ تذکرہ تباہ  
کی رو سے لے دے کا اسم مختث ہو!

مثالاً و شاعر دست و گریاں ہو گئے۔

ایکسے ہانک لگاتی۔ ہونہہ، ذرا اپنا الف مقصورہ تو دیکھو! اکر ہے کہ طیبی،  
سینہ پچکا ہوا۔ جیسے دمے کامریں کھالیں رہا ہو۔“  
دوسرے صاحب بھینہ نہ لئے۔ ”اخاہ مینٹکی کو مجھی زکام ہوا؟ ذرا اپنی حلتے  
حُطی کا پیٹ تو سنپھالو، جیسے اچارے کاما را ہوا بنیا ڈکاریں لے رہا ہو۔“

تیرے صاحب نے اس معمر کہ آرائی کو دیکھا تو ان کی رگِ تنقید بھی پھٹکی۔ اور  
وہ اللہ کا نام لے کر دھم سے دونوں کے درمیان کو دپڑے۔ ”ابی صاحبِ کہماں کا الف  
مقصودورہ اور کہماں کی حالتِ حقی۔ ذرا اس خاکسار کا تقدیم ملاحظہ فرمائیے۔ واللہ کس  
بلماک استدعل ہے۔ اور نقطوں کی گولانی۔ خدا کی قسم قشے میں قشے .....“  
اس بخشنا بخشی میں وابج کا پریشن ہوتے ہوتے وہ تو بچارے لد گئے۔ لیکن  
اب تینوں طرف سے ہونے لگا کہ میرا شعر تیرے شعر کو..... میری نظم تیری  
نظم کو.....

بات میں سے بات بخلتی ہے۔ لیکن فی زمانہ اس ادبی و دھینکا مشتی کا سب سے  
بڑا اکھاڑہ وہ ادب ہے، جسے سوایا اتفاقاً ترقی پسند کہا جاتا ہے۔ تخلی اور بیان کی  
اس نئی روشن نے زندگی کے تاریک اور گنام ہپلوؤں کو اجاگر کیا، اور مستقبل کے لیے  
نئی نئی شاہراہوں کا نشان دکھایا۔ اس رہنمائی میں باضی کے جمود اور حال کے اضطراب  
میں ایک بے پناہ ہجڑ لازم تھی۔ چنانچہ نئے ادب کے دوش بد و ش نئے ادیب پر بھی  
بے اختیار کی چھڈا مچھلا..... ابی صاحبِ رومنی پر اپنیٹا ہے، رومنی! طریقہ رہ  
ہوا ہسپتاں ہوا، کہ جدھر دیکھو کھانسی، بخار، دمر، سل، در دگردہ اعشق ہے تو زرسوں  
کے ساتھ راز دنیا ز ہوتا ہے تو پریشن کے وارڈیں۔ واللہ دلبی کے دو اخلنے بھی ثرا  
جاتیں! گویا دنیا بھر میں مزدور کی لوگری، سرکل کو شنے والا انجمن، اور اونچی اونچی چینیوں کے  
سو اپکھے رہا ہی نہیں۔ چھوکری ہے تو اس کے سینے پر کچھ ناشپاتیاں کپ رہی ہیں عورت  
ہے تو پامال۔ بہن ہے تو کسی بھروسے ننگے اڑشت کے ساتھ بھل گئے پر تلی ہزوں بجوان  
بیٹی باغ کے مالی کو دیکھ کر فٹ کھا جاتی ہے۔ گیارہ بچوں کی ماں بارہوں نئھے کی نکیں  
ہے۔ اور پھر ہستیریا کا دورہ۔ بیویوں کو ہستیریا، بجا بیوں کو ہستیریا..... شاید بچارا  
ادیب بھی اسی دورے میں بنتلا ہے! اس کی بات بات میں جنسی بھروسک کے انکارے

ترپتے ہیں۔ اگر وہ آرٹسٹ ہے، تو اس کا ماذل ننگا ہوتا ہے۔ اگر وہ شاعر ہے تو اس کا عریاں تخلی جسمانی آزادی کے ساتھ ساتھ قافية ردیف کی قید سے بھی آزادی چاہتا ہے۔ اگر وہ افسانے لکھتا ہے، تو اس کے جوان چھوکرے گرسہ بھری یوں کی طرح منہ پھائے جوان رطکیوں کا پیچھا کرتے ہیں۔ اور جنسی بندشوں سے گھبرائی ہوئی عورتیں فٹ پرفٹ کھاتی ہیں..... پیاس سے ہونٹ، دھیلی شلواریں، پوشیدہ امراض، رو سی پا پینگنڈا ہے، رو سی!

جواب ملتا ہے کہ حضرت آپ نے وہ شلوار کیوں پہنی جو آسانی سے ڈھلنک جاتے۔ زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ تمذیب کی پنچ بدل گئی۔ اخلاق کا معیار از برزو تعییر ہوا۔ باضحوں کی جگہ کار خلنے بن گئے۔ کوئی کی جگہ ردیلہ لغہ سرانی کرنے لگے۔ تخلی کی جگہ ہواں جہاز پر داڑ کرنے لگے۔ بالاخانوں کی جگہ کلب گھر نے سنجھاں لی۔ حرم سرا کا ربہ ہوٹلوں نے ہتھیا لیا۔ اور آپ ہیں کہ مُبلل کی انکھیوں میں رُک گل کی پھانس نکلاش فزار ہے ہیں! قبیلہ دریا میں رہ کر مگر مجھ سے بیڑ؟ بر تھک نسروں کا زمانہ، عورت کو یوں با ادب بالا حظ بامحتک لگانا جیسے نماز کی تسبیح ہوا..... اور پھر اس جنسی بھرک کی لدت کس کو نہیں؟ آپ کی ادبی کائنات میں عورت کی ذات کے سوا اور بستی کیا؟ آپ کے چمیں میں بچوں اس بیلے کھلتے ہیں کہ وہ کسی مخصوص رعنائی تسبیح پڑھاتے جائیں۔ ببل کی نغمہ سراتی میں آپ کی چیتی مخفیہ کا سر دھکلتا ہے۔ اور پھر یہ وصل اور فرقان کا جھگڑا کیا ہے؟ محجوب کے کوچہ میں یہ لاتے والے کیسی؟ آپ وہاں سر کے بل جاتے ہیں۔ انکھوں کا فرش بچھاتے ہیں۔ دیوار سے سرچھوڑتے ہیں۔ دریاں کی خشنا ہوتی ہے۔ وصل کا شہرت چھنتا ہے۔ اور آپ شالی بو تیں اٹھاتے مارے مارے پھرتے ہیں..... اگر سچ مجھ آپ کے دل اور دماغ پر اس عورت کو پالینے کا بھروسہ سوار نہیں ہے۔ جو بالاخانے کی کھڑکی میں بن ھٹن کر بیٹھتی ہے، یا جو جنم

سر اکی چار دیواری میں ازال سے قید ہے، تو آپ کے طلسمی رنگ محل بے معنی نظر آتے ہیں۔ اور ادب کے میدان میں (بقول آپ کے) آپ کی شہسواری بے کار سی تفریخ معلوم ہوتی ہے، عورت! ..... وہ آپ کی رگ رگ میں سانی ہوئی ہے۔ آپ کی غزلوں میں اس کا قصیدہ ہے، آپ کی نظموں پروہ سوار ہے، وہ آپ کے تجھیں میں تیرتی ہے۔ اور جب معاشرت کے اصولوں سے مجبور ہو کر وہ کھلم کھلا آپ کی توجہ ساقی، گلفام کی طرف مائل ہونے لگتی ہے ..... فویز ساقی، جس کی سیں مشکل سے بھیگی ہوں ..... جس کے چہرے پر بزرے کامل کاسا آغاز ہو ..... قبلہ کیا بینا کیا دینا ..... ادب ترقی پسند ہو یا غیر ترقی پسند روان کا گہوارہ ہوتا ہے۔ آپ اپنے روان کو زندگی سے فوج کر ایک دماغی خلامیں لے جاتے ہیں۔ نتنے ادیب کار روان گلیوں کے ٹکڑے ہوتا ہے، مزدوروں کی بارگوں میں پہماڑی چشمیں کے پاس، میونسل کیشی کے نل پر، ریل کے ڈبے میں، گھر کی چار دیواری کے اندر ..... کیونکہ اس کے آگے اور پیچھے زندگی کی انتہک مشین چلتی رہتی ہے۔ بنائی ہوئی، بجاڑتی ہوئی، کچلتی ہوئی ..... آپ کے عاشق اور معشوق چننوں اور پریوں، کی بستی سے اُترتے ہیں یا محلوں کی سیچ پر اُنگتے ہیں یا خوابوں کی ٹھنڈی ڈنیا میں بستے ہیں۔ اس کا عاشق دن بھر دفتر میں کام کرتا ہے یا کار غافنے کی چنیاں صاف کرتا ہے یا ہٹول میں جاکر شراب پیتا ہے۔ اس کی مجبورہ ایک شریف زادی ہوتی ہے، کہ جس کے تجھیں کو دبی ہوئی خواہشوں نے آوارہ کر دیا ہو۔ یا ایک مایوس جوانی کہ جس کی قسمت ایک بہت بوڑھے یا بہت موٹے یا ان جوڑ سے مرد کے ساتھ ٹانگ دی ہو۔ یا پھر وہ ایک سستی سی، بھتی ہوئی شمع ہوتی ہے۔ جسے خود آپ کے اصول ہر روز نئی محفل میں بھر دکھنے کے لیے مجبور کرتے ہوں۔ آپ اپنے ہیر والے سہروں کی شادی رپا کر انھیں جملہ عز و سی میں دھکیل دیتے ہیں، اور واپس اگر فوئینے

کے بعد پتھے کابے صبری سے انتظار کرتے ہیں۔ ترقی پسند ادیب جملہ سعروسوی کے پڑے  
گرا کر واپس نہیں آ جاتا۔ وہ خلوت خانوں کے چور دروازے تلاش کرتا ہے اور بے  
پاؤں پس پردہ کے روز طبولہ ہے۔ بارہا اُس نے دیکھا کہ نو دمید غنچے بے دردی  
کے ساتھ کسی بھٹی پرانی، بو سیدہ بھولی میں بھینک دیئے گئے ہیں۔ ایک ہلہی اور  
نمک کا سوداگر کسی روشن دماغ حساس لڑکی کو گود میں لیئے بازار کے بھاؤ سنار ہے۔  
کوئی آرٹسٹ نوجوان ایک بچے پیدا کرنے والی مشین کا بروجھڑا ٹھلنے پر مجبو رہے...  
... یہ زندگی کی ستم طریفیاں ہیں۔ آپ انھیں نظر انداز کرتے ہیں۔ ترقی پسند ادیب  
ان کا پیچا کرتا ہے۔  
لیکن چھوڑ بینے جناب، کہاں کی بات کہاں جا پڑی، نہ کسی کے لینے میں نہ  
دیئے میں۔

یہ مضمون ایک برٹش فوجی افسر کی دائری کے چند اقتباسات کا ترجمہ ہے۔ یہ افسر  
۱۸۳۹ء میں کراچی آیا تھا اور ۱۸۵۱ء میں اس کی دائیری لندن کے اشاعتی ادارے  
جیس میدان نے شائع کی تھی۔ مصنف نے اپنا نام صیغہ راز میں رکھا تھا۔

# کراچی

۳۰ فروری ۱۸۳۹ء کی صبح کو جنگی جہاز "ویلزی" اور باربرداری کے جہاز "خنا" نے قلعہ منڈرا کے مقابل نگر ڈال دیئے۔ ہمارے کمانڈر نے قلعہ کے حاکم کو للا کارا کارڈ فوراً متعین کیا۔

"میں بلوجی پتھر ہوں" قلعہ کے حاکم نے جواب دیا۔ "ہم قلعہ خالی کرنے سے پہلے مر جانے کو ترجیح دیں گے؟"

چلو اچھا ہوا۔ موت کے آرزو مندوں کو موت ضرور ملنی چاہیے۔ یوں بھی ان مغرور بلوجیوں کو تیز اور تندیب سکھانا چاہا فرض ہے۔ یہی تو وہ فرض ہے جس کو ادا کرنے کے لیے ہم نے اپنا عزیز وطن چھوڑا۔ اور اب ان کا لے پانیوں میں دربہ مارے مارے چھر رہے ہیں۔

ہمارے فوجی دستے جہاز سے اُتر آئے اور منڈرا کی چٹان کی طرف ٹھہرے چڑاں کے دامن میں کچھ دیر استاکر ہم نے اپنی اپنی راتقلیں بھر لیں اور ان پر تیز دھار

خون کی پیاسی کرچوں کو چھڑھایا منورا کی چنان پرموت کا سایہ واضح طور پر منڈلار می تھا۔ لیکن موت کے فرشتے کس کا انتظار کر رہے تھے؟ ہماری رجنٹ کے دل کچھ بیٹھ سے گئے لیکن کمانڈرنے کو کم کر لسکا۔

”برطانیہ نظم کے بہادر سپرتو۔ تاج اور ملک کے نام پر۔“

تلخ اور ملک کے نام پر ہم نے بے دریغ حملہ کر دیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے منورا کا قلعہ سر ہو گیا۔ قلعہ میں ایک ضعیف العمر سردار تھا۔ ایک جوان عورت تھی۔ اور ایک نہ خاص۔ پچھ تھا۔ لاحدل ولا تقوہ۔ گودرز جزیرہ نے مکلتہ سے ایک پیغام میں ہماری بہادری کو سراہا اور ہمارے کمانڈر کی عالی ہمتی۔ ہوشمندی کی بہت تعریف کی۔

منورا کا قلعہ سر ہوتے ہی کراچی کا شہر بھی ہمارے قبضہ میں آگیا۔ دوپہر کے قریب ہم نے بندرگاہ پر اتنا شروع کیا۔ سمندر میں زیر دست تلاطم تھا۔ لہوں کے زیر دم میں ہمارے کمانڈر کی محبوب بکری پانی میں گر گئی جو اس نے ہبھتی میں خرد کرٹے سے شوق سے پالی تھی۔ تین کاے سپاہی بکری کو بچانے کے لیے اسلحہ سمیت ایک ساتھمند میں کو دستے۔ دو سپاہیوں نے بکری کو کندھوں پر اٹھایا۔ تیسرا سپاہی اپنے الحکم کے بوجھ سے بے دم ہو گیا اور آن کی آن ڈوب گیا۔ رام جی ناک فرض کا پابند انسان تھا۔ ڈوبتے وقت بھی اس نے اپنی رانفل کو ڈھنپوٹی سے خاتم رکھا تھا۔ افسوس کہ یہ تھیار ہمند ترین کسی کے کام نہ آسکے گا۔ ہماری رجنٹ میں پہلے ہی رانفلوں کی بہت کمی ہے۔

کراچی کی پورٹ کو بندرگاہ کہنا مستظری ہے۔ پھر بھی یہ مقام سارے ساحل پہنچنے جگہ ہے۔ اسے اپنی طرح ترقی دی جائے تو، کراچی مکلتہ کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ ہم اس بندرگاہ کو تحریک کر دیں گے۔ تجارتی درآمد برآمد کے لیے یہ جگہ بہت موزوں ہے۔ یوں بھی وسطی ایشیا میں جنگی ذخیرے جمع کرنے کے لیے یہ مقام بے حد اہم ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کراچی کا قدیمی نام کروکالی ہے۔ جس کا ذکر یونانی دیومالا میں آتا

ہے۔ یہ تاریخی رشتہ کراچی کے لیے باعث فخر ہے۔ لیکن ایک جھوٹی سی دقت یہ ہے کہ کراچی کا شہر فقط ڈیڑھ سو سال پہلے آبلا ہوا تھا۔ کراچی میں داخل ہوتے ہی انسان کے کام، ناک اور انھیں بڑی شدت سے متاثر ہوتی ہیں۔ ساعت کے لیے چاروں طرف ایک مرثیہ ناموسیقی پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں بازار والوں کی جیخ پکارہ خور توں کی گاہی ٹکڑیں کتوں کی لمبی تائیں اور گدھوں کی مسلسل ڈھینپھوں ڈھینپھوں خاص طور پر نایاں ہے جا بجا گلی مٹری چھپلیوں کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں ان کا تعفن قوت شاما کو مدد دیتا ہے۔ شہر میں نایلوں کا رواج نہیں۔ گندے پانی کا نکاس عمل تجیر سے انجام پاتا ہے۔ جو کوڑا کر کٹ گھروں کے اندر کام نہیں آتا وہ گھروں کے باہر رکھ دیا جاتا ہے۔ صفائی کا زیادہ تر کام کوڈوں چیزوں اور کتوں کے سپرد ہے جھوٹی جھوٹی تاریک دوکانوں سے ہدی۔ کڑوے تیل کی ٹیلیں آتی رہتی ہیں۔ ان نوع بنوں خوشبوقوں کو سوٹھکر کر یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے تازہ تازہ لاشوں کو حنوط کیا جا رہا ہو۔

مکان میں کے بنے ہوتے ہیں گھر کیا ناپید ہیں۔ البتہ جھوٹے جھوٹے دشمنان فلیں سوکھی ہوتی مجھلیاں گرد میں اٹی پڑی ہیں۔

مرد لبے اور تن آفرید ہیں۔ عورتوں کے لباس شرخ اور رنگیں ہیں۔ مسلمانوں کی پہچان ان کی لمبی لمبی گھنی اور گھنگھر پالی داڑھیاں ہیں۔ ہندوؤں کا رنگ زردی مائل ہے۔ کالے کالے شرخ ہونٹوں والے جبشی زادستی پانی کی مشکلیں اٹھاتے چرتے ہیں۔ موٹے موٹے بنیے دبليے پنکے ٹھوڑے پر اینٹھ کر پیٹھتے ہیں۔ مسلمانوں کے عدالت انھیں گھوڑوں اور خچروں پر پیٹھتے کی اجازت نہیں۔

گھروں اور دوکانوں کے سامنے پیٹھ کر یہ سر عام ٹالٹ کیا جاتا ہے۔ مسلمان لیکن رانیم کی ٹھنیاں گلے میں مار مار کر منہ کی صفائی کرتے ہیں۔ ہندو سفید مٹی میں سرسوں

کاتیل ملاک صابن کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ نہانے کے لیے دریاۓ لیاری سے اس میں پانی تھیں ہوتا رچوٹے چھوٹے گدھوں میں پانی جمع کر کے اس میں مچھلیاں ہوتے ہیں غسل کرتے ہیں اور پھر سی پانی مٹکوں میں بھر کے پیا جاتا ہے۔

آج دنگیر پر کامیلہ ہے۔ یہ جگہ کاچھی سے کوئی نو میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہ نیلہ صاحبی مگر، کی یاد میں منیا جاتا ہے۔ کبھی وقت صاحبی پیرا تو اس کے تین بھائی ہیں اُنکر ہے تھے۔ آتے ہی انھوں نے اس مقام پر کامات کے انبار لگا دیے ایک بھائی نے ایک انگلی سے گرم پانی کا چشمہ کھو دیا۔ اس پانی کا درجہ حرارت ۹۰ درجہ ہوتا ہے۔ دوسرے بھائی نے غالباً دوسرا انگلی سے ایک اور چشمہ بخلا جس کا پانی ۱۲۰ درجہ گرم ہے۔ تیسرا بھائی نے چند پھولوں کو مگر مچھلی میں تبدیل کر دیا۔ چوتھے بھائی نے اپنی مسوک کوز میں کاٹ کر بھور کا درخت پیدا کر دیا۔ ایک طویل عرصے کے بعد جب سب سے بڑا بھائی مر گیا تو اس کے مزار پر ”صاحبی مگر پیر“ کا مقبرہ تعمیر ہو گیا۔ ایک پھٹو سے تالاب میں اُسی یا نوے کے قریب مگر مجھ ہر وقت موجود رہتے ہیں اگرچہ مگر مجھ پھولوں کی اولاد ہیں لیکن ان کے جسم بے حد غلیظ اور بدبودار ہیں۔ سب سے بڑے مگر مچھل کا نام مور صاحب ہے۔ درگاہ کامتوں ایک ننگ دھرنگ لمبا ساقیر ہے۔ اُو آؤ، کافر و لکا کر مگر مچھوں کو کھا کرتا ہے اور عقیدت مند بکریاں اور دنہبے فرخ کر کے چڑھاوا چڑھاتے رہتے ہیں کچھ گوشت اور پھیپھڑے مگر مچھل کھایتے ہیں اپنے اچھا مال فقیرے جاتا ہے۔

”واه واہ بمحان اللہ“ مگر مچھوں کو گوشت کھاتا رکھ کر عقیدت مند تحسین کافرین کے نفرے لگاتے ہیں۔

”مبارک باد مبارک باد“ فقیر گوشت سنگھال کر براہ دیتا ہے ”تمہاری نذرِ قبول ہوئی۔ اب دنیا اور آخرت میں تم سرخور ہو گے“

میلے میں کراچی سے ناچنے والی لڑکیوں کا ایک گروہ بھی آیا ہوا ہے۔ ان کی سماں تکیس کالی اور بال بے میں عقیدت مندوں کے دل رو حاصلت میں رپے ہوتے ہیں لیکن ان کے جسم ان لڑکیوں کے گرد مندلاستے رہتے ہیں۔ مگر تلااب "ماکا پچھا تبرک" کے طور پر فرو بھی ہوتا ہے۔ جوان عورتیں ایک طرف بیٹھ کر اس کی پچھڑ کو برکت کے طور پر اپنے جسم پر ملتی ہیں۔ اس عمل میں زائرین کو چند خوبصورت اجسام کی زیارت بھی نصیب ہو جاتی ہے۔

میدھ عتم ہونے سے پہلے شیدی ناج ہوتا ہے۔ ایک دائیے میں سرخ ہستہ اور نیلے رنگ کے بہت سے چھٹے گاؤڑ دیے جاتے ہیں۔ لٹکیشیوں میں عورتیں نیم سلگایا جاتا ہے۔ ڈھول بختے ہیں اور بہت سے بلے بلے مردا در عورتیں نیم بیوضوی دائروں میں ناچنا شروع کرتے ہیں۔ حاضرین قل قل کے فلک شکاف نفرے نگلتے ہیں۔ ناچنے والے مرد ہجوم بھجوں کر گاتے ہیں۔ عورتیں مست ہو کر اپنی کمر پچھاتی ہیں کوئے مٹکاتی ہیں اور والہانہ طور پر باہمیں پھیلا کر بھی گرتی ہیں کبھی بیٹھتی ہیں اور کبھی گھٹتے ہیک کر زمین کے ساتھ سوارتی ہیں۔ ان کے چمکیلے اور آبنوسی بدن پر پسینے کے قطرے عجائب بہار دیتے ہیں.....

دین بھر کی گرمی۔ گرداں اور غبار کے بعد کراچی کی راست بڑی سماں ہوتی ہے۔ صاف شفاف آسمان پر تارے ٹھٹھاتے ہیں۔ چاروں طرف صحراء کی پڑ اسرار خاموشی چھاتی ہوتی ہے۔ فضا میں سمندر کی بلکی بلکی سی نمی رچی ہوتی ہے۔ کراچی کے پیچے صرف ڈیرہ سو سال کا غربیہ نہ درشتہ ہے۔ لیکن اس کے سامنے مستقبل کی لا محدود صدیاں ہیں۔ شاید ایک وقت ایسا بھی آتے جب اس کی بندگاہ پکی بن جاتے اور تاج کے نام پہنچنے

دالے فوجیوں کی بکریاں سمندر میں نہ گرنے پائیں۔ شاید یہاں کی سڑکیں  
پتکی بن جائیں اور ان پر کہیں کہیں سایہ دار درخت بھی لگا دیے جائیں۔  
یہاں کے کوڑے کرکٹ کے متعدد انبار صاف ہو جائیں۔ اور پینے کا  
پانی بیاری ندی کے خشک کناروں پر غلیظ اور کثیر گردھوں میں جمع نہ  
کیا جاتے۔ شاید.....

## ڈیالہ پیگ

شام کی سیاہی چھلتے ہی دور ساحل پر روشنی کے نتھے نتھے سے نشاں اُجھنے لگے۔ ایس۔ ایس۔ سیئر تھے سور جو اخخارہ و نوں سے برابرا یک قوتی ہیکل دیتی کی طرح سمندر کا سینہ چڑتا آ رہا تھا، اب منزل کو قریب پا کر آسودہ خرامی پر اٹتا یا جو جو کے طوفانی تھپٹیرے جو سمندر کی دیسیں بیکرانی میں جہاز کو ایک ننکے کی طرح مالے مالے پھرتے تھے، رفتہ رفتہ مددھ پڑنے لگے۔ اور ان کی تندی، تیزی اور ابھار پر ایک سنجاب اسکون جھانے لگا جو منزل کو پا کر ہر آرزو پر چھا جاتا ہے۔

وہ روشنی جو سب سے نمایاں ہے، شاید مالا بارہل پر ہو گی۔ نہیں، مالا بارہل پر اتنی تیز روشنی کہاں سے آئی۔ یہ تو تاج محل ہو ٹل ہے۔ ہاں، ممکن ہے۔ لیکن شاید یہ میج شک ہو جانشیں ایگر کوئی نہیں کا بلب ہے۔ کیا صحب کہ یہ کالکٹس جوں جوں یا محمد علی جناح ہاں ہو جائیں یا کیونست پارٹی کا دفتر ہے اور وہ نورانی نگری جو داہیں طرف کا نکشاں کی طرح کھنچی چلی گئی ہے، ضرور میرین ڈرائیور پر قمیوں کی جگہ گماہٹ ہے۔

رات کے اندر ہیرے میں وہ یوں نظر آتی ہے، جیسے سلماں کے کامے اور گھنے بالوں کی ہانگ  
میں انشاں بھری ہوتی ہو۔ جیسے پارتبی بائی طلے دارکالی ساڑھی پہنے چھپا ستاروں کا ہجم  
نو رانی لہروں کی طرح جعل لاد ہا ہو۔ جیسے ٹلانگ کا سچوم پہنے تج پر لیٹھی ہوتی ہو، اور  
اپنے مردوں شانوں اور سینے کو کمان کی مانند تان کر قوس قزح سی انگڑائی کے رہی ہو۔  
..... ڈیکیک پر مساڑوں کا جھوم گرد عین اٹھا اٹھاک، آنکھیں چھاڑ چھاڑ کر ساحل کے  
اُبھرتے ہٹوئے نشانوں کا عید کے چاند کی طرح انتظار کر رہا تھا۔ کچھ دو رہنیں لگتے  
کھڑے تھے۔ کچھ دل کی آنکھیں واپسیکے ہوتے تھے۔ اور بڑھتی ہوتی تاریکی میں  
روشنی کا ہر نشان اور ساحل کی جانب زندگی کا ہر استماران کے رگ و پے میں بر قی جھنکوں  
کی طرح اڑانلاز ہوتا تھا۔ پورٹس ماڈھ سے لگرا شناختے کے بعد اٹھا رہ دین سے بابر  
یہ ساڑھے بارہ سو کامے، گورے، پیلے، بھورے مرد، سورتیں اور ایک خوشحال  
قیلے کی طرح ایک ساتھ رہ رہے تھے۔ ڈانگ رومن میں وہ اکٹھے کھانے پر بیٹھتے  
تھے۔ بارہ دسمبر میں سیاست، فلسفہ، ادب، جنیات پر لچسپ مباحثے ہوتے  
تھے۔ کبھی سومنگ پول میں تیرنے کے مقابلے کبھی ڈیگ ٹینیس کے میچ۔ فینیڈیوں  
بال۔ بچوں کی دوڑیں۔ برج فلمنیش۔ کانسٹرٹ۔ اور کبھی کبھی کیپنوس کے اس پاس یا  
ڈیکوں کے غاموش کونوں میں یا چینیوں کی ادٹ میں دزویدہ رومنوں کے مختصر  
لحاظات۔ اتنے مختلف لوگوں کو اتنے دن ایک درسے سے اس قدر قریب ہٹنے  
کا موقع بہت کم نصیب ہوا تھا۔ اور اس احساس میں بھی ایک عجیب یگانگت کا جذبہ  
تھا، کہ اگر وہ ڈوپیں گے تو بھی ایک ساتھ، اور منزل تک پہنچیں گے، تو بھی ایک ساتھ۔  
اگرچہ ایس ایس سیٹر تھے موریں ڈوبنے کا امکان پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ لیکن سفر  
میں دلچسپی اور **ADVENTURE** چاشنی بھرنے کے لیے، بہت سی عورتیں اور  
بہت سے مردوں ہی دل میں اس خطرناک امکان کو زندہ رکھنے پر مصروف تھے۔ اور

لائن پیٹ کی پکش کے ساتھ ساتھ انہوں نے یہ منصوبے بھی گانڈھی رکھے تھے، کہ اگر کسی سنگلائخ چنان سے ٹھوکر جہاز پاٹ پاش ہو جاتے، تو وہ کس کی کمری ہتھ ڈال کر دو بنایا پسند کریں گے۔

جیسے جیسے بیدبی کی منزل قریب آتی گئی، سمندر کی بے پناہ مروں کے طوفان دھیمے پڑتے گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ مسافروں کی برادری میں بھی کہیں کہیں انسانیت، کہیں افرادیت، کہیں رنگ، کہیں نسل، کہیں مذہب کے امتیازات سڑھانے لگے جان میکھریں جو طویل رخصت سے واپس آئے کے بعد صوبہ بہار میں بجا لگپور کی کمشتری کا چارج لینے والا تھا اب کچھ دنوں سے باقیوں سے الگ تھدک رہتے رکھا تھا۔ اور صرف اب اس نے باریں سیاسی مباحثوں، سوتھنگ پول میں ڈنگ اور فیضی بال میں پوسٹ میں بننے کے مشاغل ترک کر دیے تھے۔ اور کھلے کار کا قیص اور خالی بیکر چھوڑ کر اب باقاعدہ سوٹ پہننا شروع کر دیا تھا۔ مسنجر جیکیس نے کہیں بواٹ کو پلڑا اور بلکہ کوچھیں کیوں کہنا بند کر دیا۔ کیونکہ اب اس کی ملکت قریب آرہی تھی جس میں اس کا خاوند پور سے ضلع کا حاکم اعلیٰ تھا۔ اس ضلع کی آبادی ناروے کی آبادی کے برابر اور رقبہ ڈنمارک کے ملک سے زیاد تھا۔ یہ اعداؤ نہایت مسنجر جیکیس کے نوک زبان تھے اور وہ انھیں پرستا ہم اور نکلا شائر کے کارخانوں میں کام کرنے والی چیزوں، خالائق اور ہننوں کو ستائیا کر جیران دپر پیشان کر دیا کرتی تھی۔ کل شام سے سردار جسونت نگہ بھی نہ باریا تھا، نہ فلیش میں اور نہ ہی اس نے ڈز کے بعد ماہیا کے دردناک دہ ہے کا گا کہ ہندوستانی میموں کو رکنے اور گوری میموں کو ہنسانے کی گوشش کی تھی۔ یہاں تک اور انسانیت کا خوال جو سمندر کی وسعتوں نے جہاز کے مسافروں پر چڑھا دیا تھا، اب ان وسعتوں کو عبور کرنے کے بعد برف کے تودے کی طرح پچھلتا جا رہا تھا اور جب سر شام دور ساحل پر روشنی کے

نشان اُبھرنے لگے، تو ہر مسافر کا دائرہ انسانیت محدود ہو کر اجتماعیت اور صفاتیت کے اسی نکتے پر آگیا، جس پر وہ پورٹش ماڈل تھے سے روانہ ہوتے تھے۔ یعنی سمندر کے راز سمندر ہری میں ڈوب گئے اور ساحل کی آنکھ کبھی ان سے اشناز ہو سکیں گی۔

ڈیک پر ایک نفسانی فسی کا عالم تھا۔ ہر شخص کی خواہش تھی، کہ ساحل پر جو نئی وہنی پڑھیں۔ جملہ لاتے اس پر سب سے پہلے اسی کی نظر ٹوپے۔ اور ہر روز شنی کے ساتھ دلول میں تصویرات کی ایک نئی دنیا آباد ہو جاتی تھی۔ کسی کو اس میں مالا باریں نظر آتا تھا۔ کسی کو تاج محل ہو ٹوپی یا مجسٹر۔ یا گورنمنٹ ہاؤس۔ یا کانگرس ہجوم۔ یا محمد علی جنگ ہاں۔ یا کیونسٹ پارٹی کا دفتر۔ یا بخہ کی ہاگہ میں افشاں۔ یادیں افزود باتیں کہیں۔ پڑھیں۔

جان میکفرسن سوچ رہا تھا کہ اگر جھاگلپور کی کشنتری کا ناظرا درہ بیڈار دلی اس کی پیشوائی کے بیٹے بیٹی نہ پہنچے ہوئے، تو آئی بسی۔ ایس کی بائیس سالہ ملازمت میں یہ اس کے دل پر تیسرا چڑکا ہو گا۔ پہلا چڑکا اس کے دیرینہ خادم افضل کے ہاتھوں لگا تھا۔ افضل کوئی سولہ برس سے اس کا پیرا تھا۔ جس طرح جان میکفرسن کو آئی بی بی ایس کی ملازمت میں ایک بے تابع قسم کی بادشاہی کا چسکا پڑ گیا تھا۔ اسی طرح افضل کو بھی سعید آقا قافل کی خدمت کی چاٹ تھی۔ یہ شوق اسے سینہ پر سینہ اپنے دادا سے دراثت میں ملا تھا۔ اور کہنی ہے اور کے زمانے سے اس خاندان کے کسی فرد نے انگریزوں کے سوا اکسی ہندوستانی گھرانے میں خدمت گذاری کی ذلت برداشت نہیں کی تھی۔ اسی وجہ سے افضل کے ضمیر میں ایک ایسی دو غلی مرشدت کی آمیزش تھی، جو اسے ہیرو اور خانسماوں کی عام برادری سے کچھ درجہ ممتاز اور ہندوستانی عیسیائیوں کے پچھے طبقہ کے ساتھ کسی حد تک ہدوث کرتی تھی۔ چنانچہ وہ لباس میں قیص، پتوں اور نیپے کمر بندوالی سفید اچھن کا نہایت شدت سے پابند تھا اور زبان میں چرچ مشنری مولیٰ

کے پادریوں ایسی انگریزی نہ اُردو استعمال کرتا تھا۔ یہ سلیقہ اس نے ابتداء میں مختص فیشن کے طور پر اختیار کیا تھا۔ لیکن امتداد زمانہ نے اسے اس کی نظرت کا ایک جزو بنایا۔ یہاں تک جوں جوں اس کے آفاجان میکفرسن کی اُردو مخصوصی اور سنوارتی گئی، افضل کی زبان اپنے مرکز سے عصسل کر عجیب و غریب تراکیب، بند شون، اور اسالیب کی دلدل میں پھنسنی گئی۔ یوں تو جان میکفرسن ہر چوتھے پانچویں سال باقاعدگی سے طویل رخصت پر انگلستان جایا کرتا تھا۔ لیکن اس بار جب وہ روان ہونے لگا، تو بہت کچھ سچکچا ہٹ اور تشویش کے بعد افضل نے ڈرتے ڈرتے اس سے پوچھا ہے:-

اگر آپ گسہ نہیں کھاتا، تو ہم کچھ بولنا مانگتا۔“

”ہاں، افضل، تم بولنے سکتا۔ مگر یاد رکھو ہم بلایت سے تم کے واسطے اور کوٹ نہیں لانا سکتا۔ ادھر یہ جنس باہوت کم تی اور باہوت ہونا گا ملتا۔“

”اور کوٹ کا بات نہیں، صاحب۔“

”ہم سمجھتا ہے کہ جنگ ختم ہو گیا ہے۔ لیکن ابھی تک بلایت میں شاید سگرٹ لائٹر آنسانی سے ملنے نہیں مانگتا۔ لذت ہم تھمارا یہ پورا ناخواہش پُورا کرتا تھا۔“

”پروانہیں صاحب۔ ہم آپنا ڈینا ٹینا نہیں بولنا مانگتا۔“

جان میکفرسن نے کن انگریزوں سے افضل کی طرف دیکھا۔ ہر بار ولایت جاتے وقت افضل اسے اپنی فرمائشوں کی فہرست دیا کرتا تھا۔ جس میں مختلف النوع کی چیزیں شامل ہوتی تھیں۔ رستہ وارچ۔ سگرٹ کیس۔ اور کوٹ۔ پرانے سوٹ۔ فونٹن ٹین۔ سینٹھی ریزر۔ اور ایک بار اس نے دبے لفظوں میں یہ ناخواہش بھی۔ بیان کی تھی، کہ اگر ولایت میں تیس اور چالیس سال کی عمر والی کوئی نیم صاحب خالی ہو، تو افضل برصاویرغبت اسے قبول کرنے کے لیے تیار ہو گا۔ کیونکہ صاحب، آپ جانتا ہے، کہ جارا کچھ اس کنٹری کے نیٹووگ سے بہت ہائی ہے۔ نیٹووگ عورت سے

چاراً گند ہونا نہیں مانگتا۔ وہ چارا لینگو یعنی نہیں سمجھتا۔ کاشٹا چھری نہیں جانتا۔ کوڑا نہیں کرتا۔ ہم ان کے ساتھ سک ہوتا صاحب، ہم ان کے ساتھ مر جاتے گا،“ اس فرماںش پر جان میکفرسن نے اُسے ذرا سختی سے ٹانٹ دیا تھا اور بڑی بلے دھی ستے اس پرانکشافت کیا تھا، کہ ولایتہ کی میم صاحب افضل جیسے جاہل، غیر مذکوب اور کینے انسان پر مجسے سے لمبا پاتپ لگا کر تھوکنا بھی پسند نہیں کر سے گی۔ آج افضل کی گفتگو سے اُسے شک ہوا کہ کہیں اس کی یہ پرانی خواہش قواعد کرنے کی آئی؟ چنانچہ حفظ ما تقدم کے طور پر جان میکفرسن کی پیشیاں پر تیوریوں کی بہت سے جھریاں معمودا رہ گئیں۔ افضل اپنے آقا کی رگ رگ کو خوب پچانتا تھا۔ اس بیہ دہ اس کے دل میں سراٹھانے والے شہمات کو سمجھا پ گیا۔

”نہیں صاحب۔ نکر نہیں۔ وہ بات بھی نہیں ہے۔“

”دکون بات؟“

”میم صاحب والا بات، صاحب۔ ہم اپنا پوزیشن خوب جانتا ہے، صاحب۔ ہم وہ خیال ڈسمس کر دیا۔“

جان میکفرسن کے ماتھے کی جھریاں مدهم پڑ گئیں۔ اور اس نے رومن نکال کر اس میں بڑے زور سے ناک صاف کی۔

”صاحب، ہم یہ معلوم کرنا ملکھتا کر کیا اب صاحب اس کوئی بھی میں واپس آئے گا؟“ جان میکفرسن کے تن بدن میں ایک زبردست بھٹکا لگا جیسے اس نے اچانک بر قی روکو چھو لیا ہو۔ اس نے رومن نکال اس میں اور بھی زور سے دوبارہ ناک صاف کی۔ ”صاحب، آج مارٹنگ جب ہم بازار کرنے کیا، تو وہ وہ راشکل رام پر شاد فوٹ والا بولتا کہ مشر افضل، اب تمہارا صاحب والا پس آئے نہیں سکتا۔ ہم سب انگریز لوگ کو خلاص کرنا مانگتا۔“

جان میکفرسن نے تیسرا بار دو ماں نکال کر اپنے داش میں سراستے ہوئے بو جھ کو نہ کاکیا۔ اگر رونا خلاف شان نہ ہوتا، تو یقیناً اس کی آنکھیں بھی اسی شدت سے اس کی ناک کا ساتھ دیتیں۔

مود صاب، علی بخش پوچھ دبھی یہی ڈرٹی بات بولتا۔ اور زائی دھوپی بھی مخفی کرتا کہ میرا افضل اب برشش راج ایک دم خلاص ہونا مانگتا۔ صاب، اگر بریک فاٹ لیٹ نہیں ہوتا تھا۔ تو ہم ان سب ڈیم سواتن کو باری باری سے منراچھتا تھا۔ لیکن صاب صرف اپنا الفریش کے واسطے ہم پوچھنا مانگتا کہ کیا اب صاب اس کی تحری میں واپس آئے گا؟

جان میکفرسن کے دل پر دوسرا چکاراں دن میں اس وقت لگا۔ جب وہ برکلے اسٹریٹ میں ڈامس گاک کے ہاں آیں۔ ایس سیستر تھوڑا مور میں اپنا بر تھریز و کروانے لگا تھا۔ جان میکفرسن، اسکو اتر اور بی۔ اسی۔ سی۔ آئی۔ اسی۔ سی۔ ایس۔ کمشنر بھاگلو۔ بھار۔ انڈیا۔ رجسٹریشن سیشن والی رٹکی اس کا پتہ لکھتے لکھتے اچانک رک گئی۔ اس نے رجسٹر پر جھکا ہوا سراٹھا کر لپٹے موٹے شیشے والی عینک کے پیچے سے جان میکفرسن کی طرف یوں دیکھا، جیسے وہ اس کے پاس چاند کی طرف سفر کرنے کا لخت خریدنے آیا ہو پھر رٹکی کے لمبوتر سے سے چھرے پر ادا سی چھاگئی۔ اور اس نے ایک سر داہ بھر کر جان میکفرسن پر ٹکھا اور رحم سے بھر پور بگاہ ڈالی۔

GOING TO COLLECT YOUR THINGS SIR

گھنٹو کا آغاز کیا۔ اور جان میکفرسن کو کاؤنٹر کے سامنے کھڑے کھڑے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی ریڑھ کی ٹپی چور چور ہو کر ٹپوں میں گر گئی ہو۔

اب اگر بھاگلو کی کمشنری کا ناظر اور ہمیڈ اردنی اس کے استقبال کے لیے بھی نہ پیچھے ہوئے، تو یہ اس کے ضعیف دل پر تیسرا جدید ضرب ہو گی۔ اگر وہ نہ

اکتے ہو۔۔۔۔۔ اگر وہ نہ آئتے۔۔۔۔۔ نہ آئیں۔ اپنی بلاسے۔ جان میکفرسن نے صرف دو ہی روز تو بدبی میں ٹھہرنا تھا۔ اور گورنمنٹ ہاؤس کا دعویٰ رقعہ اس کو لندن بھی میں مل گیا تھا۔

ادھر ہجھی اگر وہ نہ آئتے؟ یہ بھی انک خیال رہ کر اس کے سینے پر سندھ کی تند بھروں کی طرح ٹھکرایا تھا۔ اور دو بدبی کے ساحل پر یکے بعد دیگرے ابھرنے والے روشنی کے نشان تاریک دھبیوں میں بدل جاتے تھے۔ اگر جان میکفرسن کو یہ یقین ہوتا کہ بدبی کے ساحل پر اُترتے کوئی اس کی ٹوپی اچھاں کر سمندر میں چینیک دے گا، یا زبردستی اس کی پتلون اتار کر بھاگ جائے گا، تو بھی غالباً اس کے دل میں اس سے زیادہ پریشانی کا احساس نہ پیدا ہوتا جتنا کہ اب ناظراً درہ بیڑا ردی غردب نہ ہو۔ اس فرض کی انجام دہی میں اس نے دن اور رات، خون اور سیپیہ ایک کر دیتے تھے۔ اس نے بھروں کی پرواکی تھی نہ ملیر بیک۔ سانپوں کا خیال کیا تھا نہ پچھوؤں کا۔ سن بڑوں کے ڈر تھا نہ ہیضے یا طاعون یا کالا آزار تھے۔ اس نے اپنی جوانی کا رس، اپنے دماغ کا جو ہر، اپنے قلب کا سکون بے رینے قریان کیا تھا، تاکہ بہ طایہ کے تاج میں کوہ نور کی چک ماند نہ ہونے پاتے۔ لیکن اب جب کہ اس کے آرام کے دن قریب اُر ہے تھے، قدم قدم پر اُسے ایک نیا دھکا لگ رہا تھا۔ بات بات پر اس کے دل پر نئے نشانے پڑتے تھے۔ اب اس کو آنکھوں میں وہ پڑانا نور باقی نہ تھا، جس سے وہ تاج کی دھنڈھلانی ہوتی تباہی کو جلا بخشن سکتا۔ نہ ہی اب اس کے کندھوں میں وہ سکت تھی جس کے سماں وہ اپنی سلطنت کو کبھی غرب ہونے والے آفتاب کے رُخ پر سہارا دیتے رہتا۔

جان میکفرسن کے سینے میں خلش یوں جوش مارہی تھی جیسے سوٹا والٹکی بدل کادھاز بھاگ سے چھٹ گیا ہو۔ اس کی کن پیسوں میں خون کی گردش اُبلنے لگی۔ لگے میں محمل کے کانٹے پھنس گئے۔ اور آنکھوں پر قوریں لگائی۔

وہیلو جان۔ کہو یا رہ، آج جاتی ہمارکی بازی لگے گی ہے؟ سردار جسونت سنگھنے پیچھے سے اگر اس کے کندھے پر تھکی دی۔ اور دوسرا ہاتھ سے تاش کی گدھی کو عین اس کی ناک کے نیچے زندسے پھٹ پھڑایا۔

جان میکفرسن کو یہ حرکت بہت ناگوار گز رہی۔ یکیکاں اس کی آنکھوں میں اُترے ہوئے آنسو شکا ہو گئے۔ اس کی خوبیہ گردن میں تناذ اگیا۔ سردار جسونت سنگھ کو کوئی جواب دیے بغیر اس نے منہ دوسرا طرف پھر لیا۔ اور غصے سے دہاں سے چلایا۔ لمحہ بھر کے ریلے سردار جسونت سنگھ دم خود کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ پھر اس نے جلدی جلدی اور اُدھر دیکھ کر جائزہ لیا۔ کہ کسی اور نے تو اس کی یہ گفتگت نہیں دیکھ لی؟ سامنے کچھ دُر مسنجیکیں کھڑی سکرا ابھی تھی۔ ایک زہریلی، کاٹنے والی سکرا ہٹ جس میں

لغت، حقارت، اور ظریف کی نظر سانپوں کے ڈنگنوں کی طرح لہار ہے تھے۔ جب سردار جسونت سنگھ کی آنکھیں اس سے چارہ ہوئیں، تو مسنجیکیں نے بڑے وقار، بڑے غدر سے اپنے سر کو کمی با جنبش دی، کہ ماؤں، ذرا اپنی اوقات تو پھانفو۔ تم صد سے زیادہ بڑھ گئے تھے۔ تمہارے صاحبہ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا..... سردار

جسونت سنگھ کے سینے میں گالیوں کا ایک غبار سائٹھا۔ وہ دیستک ڈیک پر کھڑا زیریں گالیاں نکال کر اپنا سینہ ہلا کر تارہ لیکن اس کے دل میں غصے کا جوش عمدہ بیڑک رہا تھا، وہ کسی پہلو ٹھنڈا نہ ہوتا تھا۔ پھر اس کے قدم اُسے بلے اختیار بارہوں میں سے گئے۔ بارہوں میں لگے ہوئے آئینے میں دیکھ کر وہ یہ ران ہو گیا، کہ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ایک باریک سی لہر بھری ہوئی تھی۔ کیا یہ وطن پنچھے پونخوی کے آنسو

ہیں؟ لیکن اس کے دل کا چور پکار پکار کر اسے جھبھوڑ رہا تھا، کہ سردار جسونت سنگھ، تم اپنے آپ کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ یہ خوشی کے آنسو نہیں۔ بلکہ وہ اصل تم رو رہے ہو۔ کیونکہ جان میکفرسن نے تمہارے منہ پر خشک دیا ہے۔ اور سر جیکس تمہاری درگت پر جی کھول کے تسلک رہی تھی.....

”بوستہ، ایک پیگ و مکی؟“ اس نے گلا پیاڑ کر پکارا۔

”لندن پیگ صاحب، یا پٹیالہ پیگ؟“ باریں نے حسبِ محول دریافت کیا۔ سردار جسونت سنگھ نے خود اسے مختلف پیگوں کے پہلو نے سکھاتے تھے۔ لندن پیگ سب سے چھوٹا تھا، فرنچ پیگ اس سے زیادہ، امریکن پیگ اُس سے بھی زیادہ، اور پٹیالہ پیگ سب سے بڑا، کوئی نصف گلاس کے قریب۔

سردار جسونت سنگھ اپنے دل کی دھقتوں گمراہیوں میں کھو رہا تھا۔ اس نے باریں کی بات نہ سنی۔

”لندن پیگ صاحب، یا پٹیالہ پیگ؟“ باریں نے دوبارہ پوچھا۔

”لندن پیگ کی ماں کو.....،“ سردار جسونت سنگھ نے چونکہ کرایک بھدی سی گالی دی۔ دل تین پٹیالہ پیگ پنی کراس کا دل کچھ بلکا سا ہو گیا۔ اور اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ جو گالی اُس نے لندن پیگ کی ماں کو دھی تھی، وہ اصل میں جان میکفرسن، سر جیکس بلکہ جزیرہ انگلستان کی ساری ماڈل کویکس طور پر لگتی تھی۔ اس خوشنگوار احساس سے اس کے قلب اور دماغ پر کچھ آسودگی، کچھ سکون، کچھ سر درجھا گیا۔ اور وہ باریں بیٹھا جھووم جھووم کر لندن پیگ کی ماں، بہن اور بیٹی کو نئی نئی اچھوٹی گالیوں سے نوازتا رہا اور پٹیالہ پیگ پٹیالہ پیگ پیتا رہا۔

آدمی رات کے قریب جب رابرٹ لانگ جنیویا کل پوسٹ کے نامہ بگاڑھی کی حیثیت سے ہندوستان آ رہا تھا، اپنی روزانہ ڈائری لکھنے بیٹھا۔ تو اس نے یہ قلم بند کیا:

”جہاز بیٹی کے ساحل کے عین سامنے لگ راندا ہے۔ کل صبح دس بجے یہی ڈپٹی  
میں داخل ہو کر اپنے مسافروں کو بندگاہ پر اگل دے گا۔ جیسے محصلی نے حضرت  
یونس علیہ السلام کو اگل دیا تھا! یہ تشبیہ میری اپنی نہیں۔ بلکہ میں شاہد کے خیال کا استعمال  
کر رہا ہوں۔ جب کبھی وہ جہاز کی زندگی سے اکتا جاتا ہے، تو کہا کرتا ہے کہ رابرٹ  
پڑھو، کہ اسے خدا تیرے سوا اور کوئی نہیں۔ تیری ذات پاک ہے۔ بے شک میں بہت  
بھی پڑا گناہ کار ہوں۔ شاہد کرتا ہے، کہ جب حضرت یونس نے محصلی کے پیش میں یہ دعا  
ماں بھی تھی تو اُس نے انھیں ساحل پر اگل دیا تھا۔ شاید اس دعا کی مدد سے ہمیں بھی اس گنجھے  
جیسے جہاز سے جلد سختات مل جائے؟“

”رات کے اندھیرے میں بیٹی میں بھلی کے قوموں اور میمون ڈرائیور چلتی ہوئی  
مورکاروں کی روشنیوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اس وقت اس شہر میں کوئی خصوصیت  
دکھانی نہیں دیتی۔ یہ امر کہ یا یورپ یا انگلستان کا کوئی بھی شہر ہو سکتا ہے۔ اس وقت اسے  
دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں لگاسکتا، کہ یہ شہر یوگیوں، مہاراجوں، بگاندھی، اور جناح کی سرزینیں پر  
واقع ہے؟“

”آج رات میں نے ایک عجیب واقع دیکھا۔ ڈنر کے بعد جب میں سب سے اوپر  
والے ڈیک پر حسب معمول چل قدمی کے لیے گیا تو ایک کونے سے سکیوں کی کھاتا  
آواز اگرہی تھی۔ مجھے حیران ہوتی۔ کیونکہ عموماً اس وقت اس ڈیک پر میرے سوا اور کوئی  
نہیں ہوا کرتا۔ میں نے دیکھا، کہ جان میکفرسن ڈیک کے جنگلے پر جھکا ہوا بے اختیار بلکہ  
بانک کر رہا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد منزہ حکیم شاید اس کی تلاش میں اوپر آئی، تو وہ بھی  
اس کے ساتھ مل کر رونے لگی۔ سردار جسون سنگھ ساری شام بار میں بیٹھا جھوا شراب  
پیتا، گاہیں بیکھا، گاتا اور دھاڑیں مار مار کر روتا رہا۔ سارا دن شاہد مجھے نظر نہیں آیا۔  
رات کو ڈنر پر بھی وہ موجود نہیں تھا۔ میرے دریافت کرنے پر کہیں بوائے نے بتایا کہ

وہ بھی اپنے برخیر پر منہ ڈھانپے ڈار ہے۔ شاید وہ بھی رورا ہو۔ حیرت۔ شاید یا اس پُر اسرار ملک کی خاصیت ہے۔ نہ معلوم اس کی فضائیں کتنی المناک صدیاں لپکا رہی ہیں۔ میں اپنے دل پر بھی ایک عجیب سا بوجھ محسوس کر رہا ہوں۔ اس کی کوئی خاص وجہ بھی نہیں۔ لیکن ہر لمحہ یہ بوجھ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ شاید دو چار خاموشیں نسو ہمانے سے یہم سی خلش مٹ جاتے۔ لیکن میں ابھی اس ماحول کا شکار نہیں ہوا.....؟“

## آپ ملتی

میرا پناکوئی نام نہیں بلکن مجھے ہر روز سینکڑوں نام عطا ہوتے ہیں۔ میرا کوئی گھر  
نہیں، لیکن مجھے حالی شان محلوں سے لے کر غلیظ سے غلیظ جبوپیزوں میں رہنے پر مجبو  
کیا جاتا ہے۔ مجھیں غیرت اور خوداری ہے لیکن ہمیشہ ہر قسم کے اشاروں پر کھوٹلی کی  
طرح سچایا جاتا ہوں۔ مجھے شہرت سے شدید نفرت ہے لیکن کوئی دن ایسا نہیں گزتا  
جب مجھے قصاص کی دکان پر لٹکے ہوئے گشت کی طرح بربر عالم نگانہ کیا جاتا ہو۔ آخر  
انسان ہوں۔ اپنے بھائیوں کی طرح مرنے کی تمناجی رکھتا ہوں۔ لیکن کوئی آخری بار  
قطعی طور پر مرنے نہیں دیتا، رفتا چاہوں تو ہنسنا پڑتا ہے۔ ہنسوں تو روٹا لازم خدا کی  
ساری خدائی نیں مجھ سامنہ معلوم کوئی دوسرا نہیں ہے۔ ایک اندا اور سو یہماروا الامقولہ  
میرے سامنے آیج ہے۔ میری حالت اس سے بھی خستہ ہے۔ ایک ناک ہے درہ زار  
نکیلیں جس طرف جھٹکا لگے بے اختیار کھینچا چلا جاتا ہوں۔

نظر آنے کو تو بہت کچھ ہوں، لیکن میری حقیقت اس سے زیادہ نہیں کو اردہ

افسانے کا ایک کردار ہوں۔ افسانہ نگار رات دن میری تلاش میں سرگردان رہتے ہیں اور جب ایک دفعہ ان کے ہاتھ آجائوں تو خدا کی پیاہ انجات بلنا محال ہے۔ بہر دیوں کی طرح میرا نگ رونگ ناک نقش بدلتے جس طرح استعمال کیا جاتا ہے اگر اس کی تفصیل بیان کرنے بیٹھ جاؤں تو یہ خود ایک افسانہ بن جلتے۔

صبح و شام گلی کو چوپیں کی خاک چھانتے بھیجا جانا ہوں۔ اس ہیرا پھری میں بہت سی جگہ ہوتے کھاتا ہوں۔ لیکن اس کا ذکر کسی کہانی میں نہیں ہوتا۔ راہ چلتی عورتوں کو گھوٹتا ہوں۔ ریشمی بر قعوں کا تعاقب کرتا ہوں۔ جلوسوں اور جلوسوں، قبرتاوں، کارخانوں، شہروں، دیہاتوں، دفتروں، مسجدوں اور پورا باناروں کا مستقل طواف کرتا ہوں۔ لیکن جو دیکھتا ہوں وہ زبان پر نہیں لاسکتا۔ کیونکہ زبان میرے اختیار میں نہیں۔ بلکہ افسانہ نگار کے قابو میں ہے۔ البتہ اگر اس گھوما گھومی میں کسی بھی ایک خوبصورت عورت کا دوپٹہ ہاتھیں آجائے تو گالیاں افسانہ نویس کو نہیں، مجھے پڑتی ہیں۔ کسی کا ناک یا گدن کی پر دیٹھوں تو فوجداری کا خطہ افسانہ نگار کو نہیں مجھے لاحظ ہوتا ہے کہیں کسی کی ریشم مبارک پر ہاتھ جا پڑے تو کفر کافتولی بھی میرے ہر سر دائیں طرف بھٹک نکلوں تو رجست پسند باتیں طاف جھکلوں تو ترقی پسند۔ دوچار بہتے حجامت نہ بواوں تو کیوں نہ۔ دھوپیں کے ڈھنے کپڑے پہن توں توں سرمایہ دار افسانہ نگار تو فقط افسانہ نگار ہی رہتا ہے۔ اس کھینچا تاں میں میری تکمبلوں ہو جاتی ہے۔

پچھلے دنوں جب ہندوستان اور پاکستان پر آزادی کا نزول ہوا تو میرے دل میں ٹرے ٹرے ارمانوں نے سراٹھیا کر شایدیہ انقلاب عظیم مجھے ایک ایسی زندگی جاہزاں عطا فرمائے گا جس کے سامنے انقلاب فرانس اور انقلابِ روس کے پیر و بھی ماند پہنچائیں۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ دراصل ہوا کیا ہے۔۔۔۔۔ اُردو کے افسانہ نگاروں نے مجھے ڈھونڈ دھونڈ کر نکالا اور پکڑ کر کبھی ہندوؤں سے زندہ اگر میں جلوایا بھی

ستھوں کی کرپانوں سے کٹوایا۔ کبھی مسلمانوں کے ہاتھوں ذبح کرایا۔ کبھی پنجاب کی ریلوے میں قتل ہوا۔ کبھی ملکتے کے بازاروں میں مارا گیا اور جب اس خون کی جوی سے افسانہ نگاروں کا بھی پوری طرح بھر گیا تو انھوں نے میرے کپڑے پھاڑ کر بال نوج کر حال تے بے حال کر کے دھا جر کا جامہ پہنا دیا۔ اور آج تک اسی چکر میں مارا مارا پھر ہائیوں۔ سنجات کا کوئی راستہ نہیں آتا۔ کیونکہ افسانہ نگاروں نے مجھے اس طوفان میں دھکیل تو دیا۔ لیکن اب باہر نکالنے سے قادر ہیں بیس اپنی اس نئی زندگی کے بے پایاں سمندر میں کبھی ڈوبتا ہوں کہ جی ابھرنا ہوں۔ اور میرے آتائے نامدار افسانہ نگار بے دست و پاسا حل پر کھڑے میرا منتظر کر رہے ہیں..... سچ لوچھیے تو یہ دھا جز زندگی بھی ٹہی کہ اسی زندگی ہے جس کو ایک روز اس کی لوت پڑ گئی وہ بس ہمیشہ کے لیے اسی زندگی کا حل قدم بگوش ہو کے رہ گیا۔ استادِ ذوق کے قول کے مطابق:

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر گئی ہوئی

یہ اسی نئے گی شش ہے کہ جن حضرات کو بھرت کی سعادت نصیب نہیں ہوئی، وہ بھی جو ق در جو ق دھا جرین کے زمرے میں شامل ہونے کے لیے بے قرار میں۔ چنانچہ اب خدا کے فضل و کرم سے یہ حالت ہے کہ اصل دھا جرین کے مقابلے میں ان حضرات کی تعداد کہیں زیادہ ہے جو محض تبرگا اس سنت نبوی کو پورا کر رہے ہیں..... خیریہ ایک دوسرا قصد ہے۔ دراصل جو بات میں عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ ایک دھا جر لڑکی کے متعلق ہے۔ اپ صرف ناک بھوں چڑھائیں گے کہ یہ کیا یہ مردہ بکواس ہے۔ دھا جر لڑکیوں کے قصتے تو ہم روز سنتے ہیں۔ اب یہضمون بند ہونا چاہیے بندہ پردا! آپ کا ارشاد سر نکھوں پر دراصل مجھ سے چوک ہوئی۔ میرا مطلب یہ تھا کہ جو چیزیں یہاں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ ایک دھا جر لڑکی کے متعلق ہی نہیں بلکہ اس میں دین اور ایمان کی بھی بہت سی لا جواب باتیں ہیں۔ کچھ عجیب نہیں کہ آپ مذہب، کے نامہ

بھی چیز بھیں ہوں۔ اگر ایسی بات ہے تو بے شک آپ کا بھکانا جہنم میں ہے اور آپ  
میری کہانی کو ادھورا چھوڑ کر ٹرے شوق سے اپنی منزالِ مقصود کی راہ سے سکتے ہیں.....  
.... جن لوگوں کے ایمان سلامت ہیں اور جن کے دلوں سے ابھی تک مہاجر کیوں  
کی یاد فراموش نہیں ہوتی۔ ان کے لیے اس قسم ہیں ٹرے سے ثواب اور بڑی حکمت کی  
نشانیاں ہیں۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ گاندھی گارڈن میں مرنے سے گھاس پلیٹا ہوا اونچا رہا۔  
باتھیں ایک اخبار تھا جس میں ایک نئی مسجد کی تعمیر کے لیے چندے کی اپیل تھی۔  
ساختمانی ایک ہوٹل کا اشتہار تھا کہ آج رات کی ساری آمدنی اس مسجد کی تعمیر کے لیے  
وقفت کردی جاتے گی۔ یوں بھی آج کل میری گرد ہوٹلوں میں ہوتی ہے اور اگلے دلائل  
کا فضل شامل حال رہا تو سردن گا بھی ضرور سپتال جا کر..... خیر اس کا رثواب  
میں حصہ لینے کے لیے اس شام سیدھا اشتہار دا لے ہوٹل پہنچا۔ دہان شراب، ڈنار اور  
ڈالنس کا معقول انتظام تھا اور بیخ صاحب کے کاؤنٹری پر ایک نورانی چہرے والے باشیں  
بزرگ بھی موجود تھے۔ تاکہ حساب کتاب پر کڑی نگاہ رکھیں۔ شام کی کارروائی قرآن خوانی  
کی بجائے شمپین سے شروع ہوئی۔ میں نے جی بھر کے شراب پی۔ ڈنر کھایا اور نائم دیکھا جس  
میں ایک فرانسیسی رفاسدا پہنچے جسم اور لباس کی آنکھ مچولی کا بڑا کمال دکھار بھی تھی، کوئی  
آدھی رات کے قریب جب نہیں ہوٹل سے باہر کلا تو ہم خرا وہم ثواب کے احساس  
سے میرا دل شادا در روح منور تھی۔ یہ بھی آزادی کی برکت ہے کہ پہلے شراب نوشی  
پر کفر کا فتویٰ لگنے کا احتمال تھا۔ لیکن اب اس لال پری کے اشਾروں پر مسجد کے بینار  
بلند ہوتے ہیں اور سینوں ہیں ایمان کی شمع فروزان روشن ہوتی ہے۔ قریب مقاکب میں حساس  
تشکر سے اندھیاں کی بارگاہ دیں مسجد، بجالا قلن کر لیا کیک طرک کے عین درمیان ایک  
رکشا دا لے نے مجھے تھام لیا اور میرے قدموں کی شدید لڑکھڑا ہست دیکھ کر مجھے اپنے

رکشا میں بیٹھنے کی دعوت دی۔ رکشا والے کے انداز تبارہ ہے تھے کہ وہ ہر روز آدمی و می رات کے وقت خلق خدا کی خدمت کرنے کا عادی ہے اور خاص طور پر اسے ان حضرات کی نگہداشت کا خاص ملکہ ہے جو عموماً اس ہوٹ میں تعمیر مساجد کے ساتھ میں حاضر ہوا کرتے ہیں پچانچ رکشا پر بیٹھتے ہی موقعد محل کی رعایت سے اس نے روحانیت کا ذکر چھپیر دیا۔ خدا نخواستہ یہ بات نہیں کہ اس نے کسی دلخیف یا درد و یا کلمہ کا درد شروع کیا۔ بلکہ حقیقت میں اس نے مہاجر چھوکریوں کے قصے چھپیر دیے۔ جو پاچھ روپے سے لے کر چاہس روپے تک فوراً دستیاب ہو سکتی تھیں۔ یہ بھی افسانہ نگاروں کی صحبت کا فیض ہے کہ میں عورت ذات کو روحانیت کا جو ہر سمح تھا ہوں کہ جس کے بغیر بجز بموت اور کوئی زندگی ممکن نہیں ہے۔ صیغہ! ”رکشا والے نے مجھے بشارت دی اگر تم بیس روپے صرف کرو تو مجیس ابھی جنت کی سیکر لاوں .....

میں نے اس دعوتِ بخیر کو سخوشنی قبل کر لیا۔ ہوٹ میں تعمیر مسجد کے نام پڑھنے کا کے شراب پی کے اور رُوح کو گرانے والے ناقچ دیکھ کر میں نے اپنا نام جنت کے غریدارہ میں لکھوا ہی دیا تھا۔ اب اگر صرف بیس روپے مزید صرف کر کے رہیں سمی منزل بھی طے ہو سکتی ہے۔

”تو چشم مارو شن دل ماشاد“

چنانچہ میں نے رکشا والے کو پاچھ روپے انعام کا مژد دبھی ستایا تاکہ وہ اس کا بخیر گلیکل میں کوئی تاخیر نہ کرے۔ ان پاچھ روپوں نے جادو کا اثر دکھایا اور رکشا والہ گیروں سے ابھتی سورتوں سے بچتی بچاتی سر پت بھاگنے لگی پہلے سڑک کے دونوں جانب ٹبری ڈری عمارتیں تھیں۔ پھر تنگ گلیوں میں ٹاک اور چیتاویں کے چھوٹے چھوٹے چھوٹے چھوٹے چھوٹے۔ ایک مقام پر ایک مسجد بھی نظر آئی مگر مجھے خیال آیا کہ لے لاخوں وضو بھی کرتا چلے۔ لیکن رکشا والے نے مجھے اس نیک ارادے سے باز رکھا .....

”سیدھا! رکشا والانجی سے ہنس کر بولا معلوم ہوتا ہے کہ تم بہت پی گئے ہو۔ اگر کسی نے تم کو اس حالت میں پھر لیا، تو مارے جو تیوں کے کھوپڑی کنجی ہو جاتے گی...“  
مجھے اس بات پر بے حد غصہ آنا چاہیے تھا، لیکن نہ آیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ بچارا کشہ والا شخص نوا قفت اور نادان ہے۔ اسے کیا خبر کہ بہت جلد اس شہر میں ایک عالی شان سجدہ تعمیر ہونے والی ہے جس کی بہت اینٹوں پر میراثام بھی لکھا ہوا ہو گا...“  
خیر تاریکی، غلافت اور بدبو کے ایک لامتناہی سلسلے میں چلتے چلتے ہم ایک جگہ جھوپڑوں کی درودیہ قطاؤوں کے درمیان رُک گئے۔ یہاں جنت کے بہت سے اور متلاشیوں کی رکشائیں، گھوڑا گاڑیاں، موڑیں اور ٹیکیاں بھی کیتوں بلکہ اس کھڑی تھیں۔ میرا خضرراہ پانچ روپے کے انعام کی گرمی نے بھی بہت پھرتی میں تھا۔ وہ حکمت سے بہت کے ایک دروازے میں داخل ہوا اور ایک درسرے دروازے سے ایک سور کو برآمد کر کے لے آیا۔ مجھے افسوس ہے کہ افسانہ نگاروں کے فیضانِ صحبت سے میری زبان بگڑ چکی ہے اور یہیں استعاروں اور تشبیہوں کے بغیر اپنا مفہوم ادا نہیں کر سکتا۔ دراصل میرا مطلب یہ ہے کہ رکشہ والا ایک جھوپڑے میں گیا اور یہاں سے اپنے ساتھ ایسا لٹک لے آیا۔ اندھیرے کی وجہ سے میں اس کی صورت کا جائزہ تو نہ لے سکا۔ لیکن جب وہ رکشہ میں میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی تو میری چھٹی ہس سے نبے ساختہ گواہی دی کلگر

### زدگی بروئے زمین است

بہیں است وہیں است

رکشہ والا بھی اب مزے میں تھا۔ جھوپڑے سے وہ ایک خوشبو دار پان کھل کے ٹھلا سختا منہ میں پیڑی تھی اور وہ سیٹیاں، بجا تماں، گاتا اور لگاؤ کاراہ گیروں پر پان کی پیک سخوکتا تیر رفتاری سے چلا جا رہا تھا۔ کلفٹن بیچ کے ایک تاراکیس حصے میں پہنچ کر وہ رُک گیا اور رکشہ ہمارے سپرد کر کے کچھ دُور پرے ریت پر منہ کے بل بیٹ کر سو گیا۔“  
...

میں نے اپنے ساتھی سے اس کا نام پوچھ کر گفتگو کی ابتدائی..... براحت دیگم:

اُس نے جواب دیا۔ ”کہاں ہے؟“..... امانت پور ضلع مراد آباد.....

”یہاں کیسے پہنچ گئی ہو؟“ میں نے پوچھا..... اس سوال پر وہ یہ ران سی ہوئی اور میری طرف یوں دیکھنے لگی جیسے میں نے یہ سوال پوچھ کر کوئی سمجھیب و غریب احتمانہ حرکت کی ہو،..... لیکن مجھے بھی افسانہ نگاروں کی ٹریننگ حاصل تھی۔ اس لیے میں نے اپنا سوال پھرہ ہرایا۔

”صاحب؟“ اس نے کہا۔ ”یہاں کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے جہلا؟ نہ جان کا خیال، زمال کا خیال، نزعوت و آبرو کا خیال۔ تو ہر، اس سے توموت ہی اچھی۔“

”عجہت خوب؟“ میں نے چھپڑا۔ ”یہاں پر تو بڑی عزت و آبرو کے دن گزار رہی ہو!“

”یہاں کی دوسری بات ہے صاحب؟“ اس نے سادگی سے جواب دیا۔

”آخر یہاں پر اپنا دین تو سلامت ہے؟“

اس بات پر میری رُوح پھر کل اُٹھی اور میں نے دل ہی دل میں خدا نے ذوالجلال کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے آج شام مجھے تعمیر مسجد میں ہاتھ بٹانے کی سعادت عطا فرمائی۔ اسلام کا بول بالا ہو۔ دین سلامت ہے تو سب کچھ ہے۔ دین ہی ایک دوست ہے جسے زوال نہیں۔ ایک طرف سمندر کی لمدوں کی آہ و لبقا تھی..... دوسری طرف ریت پر رکشہ والا زور سے خرائٹے لے رہا تھا اور وہ لڑکی کہہ رہی تھی صاحب میری چھوٹی بہن اور میں ابھی تک امانت پور ضلع مراد آباد میں ہیں۔ جب میرے پاس دوسروں پے جمع ہو جائیں گے تو میں انھیں بھی اس دوزخ سے نکال لاؤں گی۔ میں نے اب تک ایک سو چالیس روپے پچار کھتھے ہیں اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا، اور اس طرح کی چیز راتیں اور لگ گئیں تو صاحب دوسروں پے ہونے میں کوئی دیر لگتی ہے؟ میں

دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا، کہ آج میں اسے بیس کی جگہ پورے ساتھ روپے دے دوں گا۔ وہ بھی کیا یاد کرے گی کہ سی مسلمان سے پالا پڑا تھا! آخر انسان کی مدد کرنا بھی تو مسجد کی تعمیر سے کچھ کم درجے کا ثواب نہیں۔ شاید اس کا درجہ تعمیر مسجد سے بھی کچھ بلند ہو۔.... میں ابھی اسی حساب کتاب میں الجھا ہوا تھا کہ یک شریف آدمی یعنی میں نمودار ہوئے اور بڑی مستعدی سے ہمارے آگے پیچے کھڑے ہو گئے۔ پہلے انھوں نے رکشہ والے کو زور سے چھوڑا اور پھر ہم دونوں کے خاندانوں کی کئی پیشوں کے متعلق اپنی وہیں معلومات کا انہمار فراہم کیا۔ اس تہیید کے بعد انھوں نے ہمیں باری بار گھسیت کر کشہ سے باہر نکلا اور بڑی تفصیل کے ساتھ ہماری تلاشی لی۔ میری پیشان کی جیب میں ایک بٹوہ تھا۔ جس میں وہ ساتھ روپے بھی تھے، جنھیں میں نے ابھی ابھی ایک نیک کامیں لگانے کا رادہ کیا تھا۔ لڑکی کی چولی سے وہ پوٹلی برآمد ہوئی جس میں اُس نے ایک سوچا لیس روپے پھاپچا کر رکھے تھے۔ ایک شریف آدمی نے ہٹوے کو اور دوسرے شریف آدمی نے پوٹلی کو اپنی اپنی جیب میں ڈال لیا۔ پھر انھوں نے ٹھوکر مار کر رکشہ والے کو جگایا وہ انھیں ملتا ہوا، خاموشی سے اپنی سیٹ پر آبیٹھا میرا جیا تھا کہ اب یہ لوگ ہمیں سیدھا تھانے لے جائیں گے۔ میں تھانے یا کچھ یا جیل سے مطلقاً نہیں گھبرا کیوں کہ اگر یہی راج میں افسادہ نکال رکھنے ان مقامات پر بیٹھنے کے بہت شوقین تھے۔ لیکن صدحیف! کہ ان شریف آدمیوں نے میری طرف اسکھتک اٹھا کر نہ دیکھا۔ کیونکہ اب وہ رکشا والے کی جیب سے پانچ روپے کا نوٹ برآمد کرنے میں مصروف تھے۔ اس عمل کے بعد وہ دونوں راحت بیکم کو گود میں لے کر رکشہ میں بیٹھ گئے۔ رکشہ اور ہموڑے سانپ کی طرح آہستہ آہستہ ریت پر رینگتے لگی۔ اور پھر گھنی بیچ کے ایک اور دیوان حصے کے اندر ہمیں نے اُسے نگلیا۔.....

## اور عالشہ سے گئی

کھوکھا پار کے مقام پر سرحد عبور کرتے ہوتے ہندوستانی مکشم چوک والوں نے عبد الکریم اور اس کی بیوی کو توجہ نہ دیا۔ لیکن ان کی تین چیزوں کو مزید تحقیق کے لیے پہنچے پاس رکھ لیا۔ یہ تین چیزوں میں سانگ سونگ مشین، ہر کو لویں کا باعیسکل اور عبد الکریم کی جواں سال بڑی عائشہ پر مشتمل تھیں۔ دو دن اور ایک رات کی منت و سماجت کے بعد بہزار وقت جب بیچھے میں واپس ملیں تو سلامی کی مشین کے کنی کل پُر ز سے غائب تھے۔ باعیسکل کی گدی، ٹماڑا اور ٹیوبیں ندار تھیں اور عائشہ ..... خیر، بھی غیمت تھا، کہ اگر انہوں نے چاہا تو سلامی کی مشین کے کل پُر ز سے بھی نئے ڈلوالیے جائیں گے۔ باعیسکل کی گدی، ٹماڑا اور ٹیوبیں بھی آف آ جاتیں گی اور عائشہ ..... ہ عائشہ کا بھی اللہ مالک ہے۔ عبد الکریم کو جو ایمان غیب کی پراسرار طاقتول پر تھا۔ اس میں آج معمول سے بہت زیادہ کشف کی کیفیت جھلک رہی تھی۔

جب وہ ریلوے اسٹیشن پر پہنچے، تو مقامی والینٹروں نے انھیں گوشت

کے سالیں کا ایک پیارا اور چار تانہ تازہ نان کھانے کو دیے۔ سفید سفید، نرم نرم، سوندھے سوندھے نان دیکھ کر عبدالکریم نے اپنی بیوی کی ران پر چوری سے چلکی بھری اور سرگوشی میں کھا دیئے نے کہا عالیشہ کی ماں دیکھتی ہو، کیا خالص اور کرائے نان ہیں۔ اس سالی بیبی میں کیا پڑا تھا؟ چار برس سے سختے آئے کی صورت کوئی گئے تھے۔ واد، کیا کھن کے پیڑے پیدا کیے ہیں میرے مولائے؟

جب وہ گاڑی کے ڈبلے میں سوار ہوتے تو کچھ مسافراپنے جان پہچان لوگوں کے ساتھ علیک سلیک میں مشغول تھے۔ "اسلام علیکم" "وعلیکم سلام" "اسلام علیکم رحمۃ اللہ و برکاتہ" ..... عبدالکریم نے پھر اپنی بیوی کو چھنجھوڑا عالیشہ مل، سنتی ہوئی کیا دھوم دھوڑ کے کے ساتھ دعا سلام ہو رہی ہے۔ واد، اسلام کی تو شان ہی اور ہے۔ سالی بیبی میں قوبنے ماتر مبتداے ماتر متنبنتے کا ان پاک گئے تھے۔ خدا کی قسم آج تو میرا سینہ بھی جاری ہو رہے۔ واد، کیا بات ہے میرے مولاکی؟ اور عبدالکریم نے اپنے اغل بغل بیٹھے ہوئے مسافروں کے ساتھ بڑے جوش و خروش سے باختہ ملانا اور گورنگوئی کر اسلام علیکم کہنا شروع کر دیا۔ اگر اس کی بیوی اسے پکڑ کر والپس نہ جا بیتی تو رہ جانے وہ کب تک اس کا روانی میں لگا رہتا۔

جب گاڑی چلی تو عبدالکریم نے بڑے انہاں کے ساتھ اس کے پیسوں کی گڑگڑا ہٹ کوستا۔ باہر تار کے کھمبوں سے حساب لگا کر بڑیں کی رفتار کا جائزہ لیا۔ "واد" اس نے اپنی بیوی کو پھر چھنجھوڑا بٹھو فان میں کیا چیز ہے اس کے سامنے۔ مزہ الگیا گاڑی میں بیٹھ کر عالیشہ کی ماں، تم بھی اپنی تسبیح نکال لو اور کھلمنڈلا اطمینان سے بیٹھ کر افسہ کا نام لو۔ کیا مجال ہے کہ لوئی پیچھے سے آکر تمہاری گردان کاٹ لے؟

ایک اسٹیشن کے بعد دوسرا اسٹیشن آتا گیا۔ گاڑی رکھتی اور جلتی رہی، مسافر اترے اور سوار ہوتے گئے۔ عبدالکریم کھڑکی سے منہ باہر لٹکاتے اپنے ماحول کو اپنے

دل، سینے اور انگلیوں میں جذب کر رہا تھا۔ صاف سُتھری وردی والا گارڈ جس کے سر پر جنما کیے، باختہ میں سبز اور سرخ جھنڈیاں اور رُمہ میں سیٹی تھیں پیش فارموں چیلیں کی طرح جھپٹتے ہوتے تھیں۔ جھنڈتائی ہوئی لکھیوں سے لدے ہوئے مٹھائیوں اور کھلنے کے خواصے۔ باہر حصہ نگاہ ہمچیلے ہوتے میدان، اکاؤنٹکا گاؤں کے کچے کچے مکانوں سے نکلتا ہوا دھنوں، جو ہڑوں پر پانی بھرتی ہوئی، کپڑے دھوتی ہوئی عورتیں۔ گرد و غبار میں اٹھتے ہوتے شنگ دھنگاں پتھے آسمان کی طرف منہ اٹھا اٹھا کر روتے ہوتے گئے۔ پلیال، گدھ، کھیں کھیں کسی گاۓ یا بیل یا بھینس کی طریقی ہوئی متعفن لاش.....

جب جید آباد کا اٹیش آیا تو سب سے پہلے عبدالکریم کی نگاہ ایک رنگین بورڈ پر پڑی ہجس پر ایک دل بلادی نے والی مارکٹانی سے بھرپور فلم کا اشتھار تھا۔ یہ ویکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اسی پیشیت فارم پر کچھ سپاہی دس بارہ ملزموں کو گھیرے میں لیے کھڑے رکھتے اور ایک بھرپور صاحب کری پڑتے بر سر عام عدالت لگاتے بلیخے نکھنے اور بغیر میکٹ سفر کرنے والوں کو دھڑا دھڑ جملے کی سزا استوار ہے تھے۔ سرکار کا پیر رُعب واب دیکھ کر عبدالکریم بڑا متاثر ہوا اور اس نے حسبِ معمول اپنی بیوی کی توجہ، اس طرف منعطف کرنے کے لیے اس کی ران پر بچکی لی۔ عاششہ کی ماں انتظام جو تو ایسا ہو سالی بیوی میں کسی میکٹ بالدوں کی مجال ہے کہ بغیر میکٹ والوں کی روک روک کرے۔ واہ، حکومت کا سلیقہ بھی مسلمان کے خون میں ہی ہے۔ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ یہ اللہ لوگوں کے لیں کامنیں ہے.....“

عائشہ کی ماں بڑی دلچسپی سے سیدھا پر اکڑوں پر بیٹھی تھی۔ اس نے اپنی لگھڑی سے ایک ہزار ایک منکوں والی تسبیح نکال لی تھی اور اب بڑے انہاں سے اس پر الشدعاں کے تنانوںے ناموں کا ورد کرنے میں مشغول تھی۔

”عائشہ بیٹی، عبد الکریم نے اپنی بیٹی کو پکارا ” ویکھتی ہوا پہنی اماں کے مٹاٹھے داد

کیا بات ہے اپنے وطن کی بیشی، اس کا لے صندوق سے میری ٹوپی بھی تو نکال دو ذرا۔  
اب یہاں کیس سالے کا ڈر ہے؟"

عالیشہ نے میکا بھی طور پر صندوق لکھوا، اور ٹوپی نکال کر اپنے باپ کے جولے  
کی۔ یہ ایک پرانی سرمنی رنگ کی جناح کیپ تھی، جسے پہن کر عبدالکریم کبھی وقت بھیندھی  
بازار کے پُر جوش جلسوں میں شامل ہوا کرتا تھا۔ لیکن اب چار سال سے یہ ٹوپی صندوق  
میں بند تھی۔ اور اس پل گاہ ہوا نکل کا چاند تاراز نگ آ کر ہو کر ٹوپی کی زنگت کے ساتھ  
مل جعل گیا تھا۔

ٹوپی اور ڈر کر عبدالکریم سینہ تان کر بیٹھ گیا۔ اور کھڑکی سے باہر اڑتی ہوئی گرد کو  
دیکھنے لگا۔ عالیشہ بھی باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک اتنا تی ہوئی بیزار تھا، جس کے سامنے  
کسی منزل کا نشان نہ ہوا۔ وہ بار بار گوشش کرتی تھی کہ دل میں قلعے کنج العرش  
کا درود کرے۔ اس دعائے اس کی بہت سی مشکلیں حل کر دی تھیں۔ لیکن آج اس قعا  
کے الفاظ اس کے ہوتھوں پر لرز کر رہ جاتے تھے اور زبان تک رہ پنچتھے تھے۔ اس کا  
دل بھی اندر بھاکار رہا تھا کہ اب یعنی ظیم الاثر دھا بھی اس کی مشکل آسان نہ کر سکے  
گی۔ اب وہ ایک ایسی منزل پر پہنچ چکی تھی۔ جہاں خدا کی خدائی بھی چارہ ساز نہیں ہوتا۔  
تو بہ، یہ تو بڑا کفر ہے۔ خدا کی ذات تو قادرِ مطلق ہے۔ اگر وہ چاہے تو گردش ایام کا فخر  
پیچھے کی طرف موڑے اور زمانے کو از سر نواں لمحے شروع کرے۔ جب عالیشہ بھی  
لکھوکھا پار کے قریب ہندوستانی کشمپوکی پر نہ پہنچی تھی.....

کراجی پہنچ کر سب سے پہلا مسئلہ سرچھپا نے کی جگہ تلاش کرنے کا تھا۔ کچھ دوسرے  
لوگوں کی دیکھادیکھی عبدالکریم نے اپنا سامان اشیش کے باہر ایک فٹ پاٹھ پر جا دیا اور  
عالیشہ اور اس کی ماں کو وہاں بھٹاک رہا کی تلاش میں نکل گیا۔ کچھ برات گئے جب  
وہ لوٹا، تو دین بھر کی دوڑ دھوپ سے بہت تھکا بنا گتا تھا۔ لیکن اس کے پر بیٹھا

اور اہلینان کے آنکھ بھلکتے تھے۔

”عالیش کی ماں“ عبدالکریم نے فٹ پا تھوڑا پاؤں پسار کے کہا۔ ہماری کراچی کے سامنے سالی بیبی کی کچھ حقیقت ہی نہیں۔ تمہارے سر کی قسم! ایسے ایسے عالی شان میں کھڑے ہیں کہ نہ کبھی دیکھئے نہ شئے۔ ایک سے ایک بڑھ کے سیدھے بھی موجود پڑا ہے۔ تمہاری قسم ایک ایک سیدھے بیٹی کے چار چار مار والیوں کو اپنی جیب میں ڈال سکتا ہے اور پھر مولی؟ کا ہے کو سالی بیبی نے ایسی لمحے دار موڑیں دیکھی ہوں گی۔ پاس سے گزر جائیں، تو سمجھو جیسے کسی نے راشم کا تھان کھول کر سڑک پر پھاڑ دیا ہے۔ اب دراٹھکانے سے بیٹھ جائیں، تو تھیں بھی گھما پھرالا اؤں گا۔ طبیعت خوش ہو جائے گی کراچی کی ہمارا دیکھ کر دو مکان کا کچھ جواہ ”عالیش کی ماں“ حقیقت کی طرف آئی۔

”اجی ابھی کیا جلدی پڑی ہے۔“ انہوں نے چاہا تو سب انتظام ہو جائے گا۔ اج میں نے گھوم پھر کر پڑھی کے ریٹ دریافت کر لیے ہیں۔ خدا کی قسم، عالیش کی ماں، سالی بیبی کراچی کے سامنے کوئی چیز رہی نہیں۔ پڑھی کے جو گندے دار ریٹ یہاں اٹھتے ہیں۔ بے چارے بیبی والوں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے ہوں گے۔“

عبدالکریم کا اب یہ معمول ہو گیا تھا کہ وہ علی الصبح منہ اندر چیز سے چل کھڑا ہوتا۔ کبھی بس میں بیٹھتا، کبھی ٹرام میں، کبھی رکشہ پر، کبھی پیڈل، کیماڑی، بلکھن۔ بند روڈ، صدر، فریر پارک، اسپلی ہال۔ چیت کورٹ، جیل۔ پیر الہی بخش کالونی۔ خدا داد کالونی۔ ناظم آباد۔ منہ صوبہ۔ قائدِ اعظم کا مزار..... کوئی مقام ایسا نہ تھا جس کا اس نے بننے تھا جائز نہ یا ہو۔ اور کوئی جائزہ ایسا نہ تھا جس نے اس کے خون کی گردش کو تیز اور اس کے دل کو شادرنہ کیا ہو۔ اور عبدالکریم کو کراچی کے فقیر بھی بڑے سنجیب الطفین نظر آتے تھے جو ماچس کی ڈبیاں اور اخبار زیج بیج کر بڑی خوش اسلوبی سے بھیک مانگتے تھے۔ بیبی کی طرح نہیں، کہ ایک سے ایک بڑا مشتملہ الحمد یہی پھرتا ہے اور بھیک یوں

مغلتوں ہے جیسے دھکی دے کر قرض و صول کر رہا ہوا

ایک روز ود جمعہ کی نماز پڑھنے جامع مسجد گیا، نمازوں کا بہتہ ہجوم تھا، مصرا شام، عراق، چخارا اور لیلیں سے بڑے بڑے لوگ ایک کافر فرن کے سلسلے میں کراچی آئے ہوئے تھے۔ نماز کے بعد انہوں نے پاکستان کے متعلق بڑی شاندار تقریبیں کیں۔ اللہ اکبر کے نفر سے بلند ہوتے۔ لوگ اٹھاٹھکر ان کے ہاتھ چومنے لگے۔ مگل ملنے لگے اور چاروں طرف جوش و خروش کا ایک عجیب عالم چھاگیا۔ یہ سماں دیکھ کر عبد الکریم کی انہوں سے بے اختیار خوشی کے آنسو بہنے لگے اور جب سب لوگ چلے گئے تو اس نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں شکرانہ کے درکاعت لفظ ادا کیے۔

بمبئی میں عبد الکریم کے پاس بھنڈی بازار کے عقب میں ایک چھوٹی سی کھول تھی۔ ایک تاریک سا، گھنا، ناساکرہ، نہ کوئی رامدہ، نہ صحمن، نہ تازہ ہوا، نہ دھوپ اور پھر ہر فینے پورے ساڑھے دس روپے کرایہ کے ٹھیک یکم کو ادا نہ ہوں تو سیدھے کے گلشتی کی گھر کیا اور دھمکیاں لگ۔ لیکن اس کے مقابلے میں اب کچھی میں زندگی بڑے منزے سے بسر ہوتی تھی جس فتح پا تھ پر اس نے پہلے روزاڑا جمایا تھا اب وہاں کوئی بارہ فٹ لمبی اور اٹھ چوڑی جگہ گھیر کر اس نے دوسرا سے لوگوں کی دیکھا دیکھی مکٹھی کے تختے جوڑ کر اپڑانی پوری بیوں کے پردے تاں کر ایک چھوٹی سی گلی بنالی تھی جنکی ہبوا تھی۔ دھوپ اور روشنی بے روک ٹوک آتی جاتی تھی۔ پاس ہی بھلی کا ہکھما تھا جس کے باب کی روشنی عین اس کے کمرے پر پڑتی تھی۔ پانی کا نال دودنہ تھا اور پھر نہ کرائے کا بھگڑا، نہ پھر جینے سیدھے کے گلشتی کی تیخ، الفاق سے آس پاس کے ہمسارے بھی شریف لوگ تھے اور ان سب کی آپس میں بڑے اطمینان سے بسر ہوتی تھی۔

بمبئی میں عبد الکریم نے بہت سے کاروبار بدلے تھے۔ اخیر میں جب کانگریسی حکومت نے اتنا عشراب کا حکم لگایا تو عبد الکریم کے لیے ایک مستقل ذریعہ معاش

کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ ایک انز کے عملے، دلی شراب کشید کرنے والوں اور بغیر یہ مٹ کے شراب پینے والوں سے اس کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ اور وہ ان نینوں کی مناسب خدمات کے عوض اپنے لیے دوڑھائی سور و پے ماہوار پیدا کر لیتا تھا لیکن یہ پہنچنے کے بعد اس نے چھان بیں کی تو معلوم ہوا کہ مملکت خدا واد کے وال الخلافہ میں فی الحال حرمت شراب کا حکم نازل نہیں ہوا۔

یہ دیکھ کر اس کے دل میں بہت سی بدگمانیوں نے سراٹھایا۔ اگرچہ وہ چور بازار میں شراب کا کاروبار کیا کرتا تھا لیکن وہ اسے ایک حرام چیز ضرور سمجھتا تھا۔ اور اس نے خود کبھی اس کو منہ نہیں لگایا تھا جب کاشگر س والوں نے شراب پر بندش کا قانون لگایا تو وہ اپنے دوستوں کے سامنے بڑی بڑی ڈینگیں مارا کرتا تھا کہ ہندوؤں نے یہ کام کی بات مسلمانوں کے ذمہ سے سکھی ہے۔ لیکن اب کہ اچھی میں یہ وگر گوں حالت دیکھ کر اسے بڑا ہمنی صدمہ پہنچا اس نے بہت سے لوگوں سے اس کے بارے میں گردی کریں کر پوچھا، لیکن کوئی اس کی خاطر خواہ تشغیذ کر سکا۔ آخر ایک روز جب وہ حکیم محیب اللہ تعالیٰ کے مطب میں بیٹھا گیا پیسہ ہاتھ اپنے باتوں میں شراب کا مستند بھی چھڑکیا۔ حکیم صاحب اپنے محلے میں بڑے جید عالم تصویر کیے جاتے تھے اور وہ دوا داروں کے علاوہ مستانہ مسائل سے بھی خلقِ خدا کی خدمت کیا کرتے تھے۔ عمر قبول میں ہر شریا کے منہ کو دوا کے بغیر محض روحانی وسائل سے رفع کر دینا ان کا خیال کمال تھا۔ عبد الکریم کے شکوہ سن کر حکیم صاحب مسکراتے، اور عقلی، برمانی اور قرآنی زادیوں سے شراب پر بڑی فضاحت و بلاحقت سے روشنی ڈالنے لگے۔ ہر امر میں نیکی اور بدی دلوں کے لئے واجوتے میں، انسان کا کمال یہ ہے، کہ وہ بدی سے منہ موڑے اور نیکی کو اختیار کرے۔ اسی طرح شراب کے فائدے اور کنایہ بھی اس کے سامنے ہیں۔ یہاں بھی انسانی قوت اختیار کا امتحان ہے۔ شراب پر قانونی بندش لگا کر انسان کو اس امتحان سے

محمد کرنا سارے مشیتی اہنگی کے خلاف ہے۔

عبدالکریم پر ان تفسیرات کا بہت اثر ہوا اور اسلام، ایمان اور قرآن کے نئے نئے اسرار اس پر منکشافت ہونے لگے جو عائشہ کی ماں، اس نے کہا "غلامی کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے جلا ہے بچا سرس ہو گئے سالی بمبی میں رہتے۔ نمازیں پڑھیں۔ قرآن شریف بھی سیکھا۔ لیکن کیا مجال جو کبھی سینے میں ایمان کی روشنی پیدا ہوئی۔ اب یہاں اگر نہ نہ نہ راذھلنے لگے ہیں۔ سچ کہتے ہیں کہ ایمان کا مزہ بھی آزادی کے ساتھ ہے۔" دوسری یہی توحیدیث شریف میں آیا ہے کہ غلام ملک میں جمود کی نماز تک جائز نہیں ہے۔

شراب کی طرف سے مطمئن ہو کر عبدالکریم نے کتنی دوسرے کاروباروں کی طرف رجوع کیا۔ لیکن اسے اپنے چور بازار کے تجربات کا مریض لانے کی کہیں کوئی صورت نظر نہ آئی۔ شراب ہے تو حکم حکمل پاک رہی ہے۔ آٹا ہے تو بر سر عام چار آنے سیئر کے حساب ڈھیر ڈھیر مل رہا ہے۔ کپڑے کی بھی نفلت نہیں۔ جیونی عامر ہے۔ اب چور بازاری چلے تو کبھی چیز کے سماں سے چلے ہے پلے اس نے پان بیڑی بیچنے کی گوشش کی۔ پھر اس کریم اور چکلوں کے ٹھیکیوں پر قسمت کو آزایا۔ اس کے بعد کپڑے کی ایک چھوٹی سی دکان کھولی۔ گزار کے یہی پیسے تو ہر جگہ سے مکمل آتے تھے۔ لیکن زندگی عزیز کی چاشنی ختم ہو گئی تھی۔ اور سیدھی طرح دکان پر ڈھیٹے ڈھیٹے عبدالکریم کو جو بیزار ہو جاتا تھا۔ وہ کبھی پرخطر نیز زیاد قسم کے ہیوپار کا متلاشی تھا جس کا تجربہ اس نے زندگی کے بہترین سال صرف کرکے حاصل کیا تھا۔ لیکن فی الحال اس کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس یہی اس کے دل اور دماغ پر ہمیشہ ایک مستقل اکتا بھٹ جھائی رہتی۔

بمبی میں اگر کسی وجہ سے اس پر بیزاری یا اکٹھاٹ کا حملہ ہوتا تھا تو وہ جو بھائے کے رہیے..... کے کسی چوبارے پر گاناٹنے چلا جایا کرتا تھا۔ کراچی میں آنے ہوئے

اسے کئی مہینے ہو گئے تھے اور اس نے یہاں کا چیپچیپ دیکھ دالا تھا۔ لیکن اب تک اسے کوئی ایسے بازار کا نشان نظر نہ آیا تھا، جہاں وہ گھٹری دیکھ دالا تھا۔ لیکن اسے کہیں ہو آیا کہ سے۔ اس نے چجان بیس کی تو معلوم ہوا کہ چکلوں پر قانونی بندش لگی ہوئی ہے۔ اور جس طرح بسی میں شراب بند ہے۔ اسی طرح کوئی بھی میں رندیلوں کا پیشہ منع ہے۔ عبداللکریم نے یہ خبر ٹڑی صفائی تلب کے ساتھ عائشہ کی ماں کو سنائی اور وہ دنوں دیر تک فٹ پاٹھ پر اپنی جھونپٹری کے سامنے چارپائی پر بیٹھتے قرآن اور ایمان کی صفحہ پر درباتیں کرتے رہے۔

چکلوں کے سلسلے میں جو تحقیقات عبداللکریم نے کی تھی اس کے دوران اس پر یہ حقیقت کھل گئی تھی، کہ اس میدان میں بیکاریکیٹ کے دیسیع امکانات ہیں۔ اس کی کچھ ایسے لوگوں سے شناسائی بھی ہو گئی تھی جو اس بیوپاریں ٹڑی وستز سکھتے تھے اور عبداللکریم کے پرانے تجربات کی پناہ پاس سے معقول کیشن پر اپنا شرکیٹ کار بنانے کے لیے آمادہ تھے۔ ایک کانے والانے شاید عائشہ کو بھی کہیں دیکھ سیا تھا۔ پھر اس نے رائے دی کہ اگر عبداللکریم اس کی رفاقت کرے تو وہ بہت جلد چڑار دن نہیں بلکہ لاکھوں کے ملاک بن جائیں گے۔ جب عبداللکریم کو اس کی نیت کا علم ہوا تو اس نے اپنا جوتا کھول کر اس کا نہ کی بر سر عام خوب مررت کی اور مسجد میں جا کر ساری راتِ مسجد سے میں پڑا دو تارہ، کہ اس کے دل میں ایسے ذلیل کار کا خیال بھی آیا یا غفوڑا۔ یہ اسی سیاہ کارانہ خیال کی سزا ہے کہ اب لوگ اس کی عائشہ کی طرف بھی نظریں اٹھانے لگے ہیں۔ یا اللہ توبہ۔ یا اللہ توبہ.....

رات بھر خوش و خضرع کے ساتھ استغفار کر کے عبداللکریم کا دل پھول کی طرح بالکل توبیا۔ یا اللہ توبہ من اندر یہ جب وہ گھروالیں لوٹا، تو اس کی ہیوی انتظار کرتے کرنے پڑتا ہے پرسوگتی تھی۔ عائشہ فجر کی نماز سے ناسخ ہو کر تلاadt قرآن میں صرف

حقی۔ اس کی آواز میں بڑا سوز حزین ہے تھا۔ اور جب وہ آہستہ آہستہ قرأت کے ساتھ خدا کا کلام پڑھتی تھی تو فضایں ایک عجیب عرفان چھا جاتا تھا۔ عبد الکریم خاموشی سے ایک کرنے میں بیٹھا مستار ہا اور سوچتا ہا کہ کیا یہی وہ حصوصیت کا فرشتہ ہے جس کے متعلق ایک بدمعاش دلال نے سیاہ کاری کی جو س کی تھی۔

عبد الکریم کی توبہ اور عالیشہ کی دعاؤں نے بڑا اندر لکھایا۔ کپڑے کی دکان خوب پہل نکلی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے عبد الکریم نے پیر الہی بخش کا نونی میں ساڑھے چار ہزار روپے میں دو کمرے کا پختہ مکان خرید لیا۔ زندگی میں پہلی بار عالیشہ کی ماں کو اپنی ملکیت کا مکان نصیب ہوا تھا۔ وہ اسے شیشے کی طرح صاف رکھنے لگی۔ دن میں کئی کئی بار سینٹ کا فرش دھویا جاتا۔ دیواریں جھاڑی جاتیں اور صبح شام اندر باہر فینائل کا چھپر کا ذہوتا۔ تاکہ کھیاں اندر نہ آنے پائیں۔ علی الصبح منہ اندر ہیرے عبد الکریم کی بیوی تو مکان کی غفاری میں مصروف ہوتی۔ اور عالیشہ دلان میں بیٹھ کر دکان پڑھتی۔ عبد الکریم دیر تک بستر پر اپنے ماہول کے عرفان میں سرشار پڑا رہتا۔ انہوں، پڑھوں اور چاہئے کا ناشتہ کر کے جب وہ دکان کھولتا تو اس کا ظاہر اور باطن برے سطح تھا اور آسودہ ہوتے تھے۔

رفتہ رفتہ عالیشہ کے لیے پیام بھی آنے لگے۔ جس روز اس کی منگنی ہوئی۔ وہ بے اختیار ساری رات مصلتے پر پڑی روتی رہی۔ رخصتی کے رذو وہ کئی بار روتے روتے ہے ہوش ہوئی۔ عبد الکریم اور عالیشہ کی ماں کا بھی بڑا حال تھا۔ عالیشہ کا خادم بجنور کا ہماری تھا اور ٹنڈو آدمی تھا میں آڑھتی کی دکان کرتا تھا۔ جس روز وہ سمساراں سدھاری تو گویا عبد الکریم کا گھر سنان ہو گیا۔ دوسرے روز حسبِ معمول اس کی آنکھ منہ اندر ھیرے لکھی۔ لیکن دلان میں عالیشہ کی آواز نہ پا کر دہ کر دہ بدل کر چھرسو گیا۔ جب وہ دن پڑھتے اٹھا، تو اس کے بدن میں، ٹسی آنکھ سخنی۔ جیسے افیون کی افیون یا شرابی کو شراب سے ناغہ ہو گیا ہو۔ اس نے طو عاً و کرہا منہ ہاتھ دھویا۔ ناشستہ کیا اور کپڑے بدل

کو دکان پر چلا گیا۔ دکان میں بھی اس کی طبیعت کچھ اچاٹ سی رہی۔ اس لیے دکان کو معمول سے پہلے بند کر کے وہ جی بھلانے کے لیے گھومنے نکل گیا۔ رات کو دیر سے لوٹا اور بغیر کھانا کھائے سو گیا۔

اب اس کا معمول ہو گیا تھا، کہ صبح دیر سے اٹھتا۔ بہت دیر سے ناشستہ کرتا۔ کوئی فتنہ ڈھنے دکان پر جاتا اور آدھی آدھی رات گئے گھر رہتا۔ رفتہ رفتہ اس نے دکان کے لیے ایک ملازم رکھ لیا اور سارا سارا دن سونے اور رات رات بھرا ہر رہنے لگا۔ سر شام اس کے برآمدے میں کئی قسم کے دلابوں کا جنم گئا۔ لگا جاتا تھا۔ ان میں وہ کانا دلال بھی ہوتا تھا۔ عبیدالکریم نے ایک روز برسر عام جرتوں سے پیٹھا تھا۔ ایک دوبار عبدالکریم کی بیوی نے ان لوگوں کے متعلق پوچھ گچھ کی، تو اس نے بڑی صفائی سے ٹال دیا۔

تو عالشہ کی ماں! اب میں نے ایک دوسری بیوی پار بھی کھدل لیے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو بڑی کامیابی ہو گی۔ تم ذرا جلدی سے ان سبھے آدمیوں کے لیے چاہے پائی بھجوادو۔ عبدالکریم کے نئے بیوپار بھی چمک اکٹھے۔ چھ سات مہینوں میں اس نے پیرانگی خش کا بونی والا مکان جھپوڑ کر بند روڑ پر ایک دو منزلہ کوٹھی خرید لی۔ صدر دروازے پر سیخہ عبدالکریم بیوی والا بہماں کا بورڈ لگا گیا۔ سواری کے لیے سوراگتی اور گھریلوں کام کا ج کے لیے نوکر چاکر مفترز ہو گئے۔ اب عالشہ کی ماں کو بھی ذرست نصیب ہوئی۔ اور وہ آدھی آدھی رات اٹھ کر تجھ گزار قی تھی۔ ..... اور اپنی ایک ہزار ایک دالوں دالی تسبیح پر اللہ کے ایک سوننا نوے ناموں کا اور گر کے اپنے شوہر کی لکھائی میں برکت اور کشاں لاثر کی دعائیں کیا کرتی تھی۔

ایک رات جب عبدالکریم گھر آیا، تو عالشہ کی ماں نے اس نے اپنی دباستے ہوتے کہا: "اسے جسی ..... میں نے کہا۔ بد کچھ سنتے ہو؟"

مدکیا بات ہے، عالشہ کی ماں ہے عبدالکریم نے بے توجی سے پوچھا۔ دن بھر کی ریاست سے وہ بہت تحفہ کا ہوا اور کسل مند تھا۔

”خیر سے شند و آدم خاں سے آدمی آیا تھا۔ اللہ کے تھماری بیٹی پر خدا نے اپنی رحمت کی ہے۔ اگلے مہینے تم بھی نانا آبا کہلانے لگو گے ہا۔“

”اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ عالشہ کی ماں الگی جھوڑات کو تیم خانہ کے پتوں کو بلا کر کھانا کھلا دینا۔ مجھے کام میں یاد رہے نہ رہے، تم ضرور یاد رکھنا اور ملائیں ..... عالشہ کی ماں، پچھلے زیورات اور کپڑے بھی بنوار کھو جب تم گھنی کھجوری لے کر جاؤ گی، تو غالباً ہاتھ تو زجاڑ گی۔ اللہ کے اب دوپیسے آئے ہیں تو اپنی بیٹی پر بھی ارمان نکال لو؟“

”اے ہے،“ عالشہ کی ماں نے تنک کر کھا۔ ”یہ تم لکیسی باتیں کرتے ہو۔ میں بحدا گھنی کھجوری لے کر کھاں جاؤں گی۔ میری بچی، اللہ کے بڑی المڑا و راجحان ہے ..... میں نے اسے دن پورے کرنے یہاں بلا لیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو پرسوں دوپر کی گاڑی سے آجائے گی۔ تم بھی موڑ لے کر چلنا۔ ہم عالشہ کو اٹیش پر لینے جائیں گے۔“

یہ خبر سن کر عبدالکریم اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں پر پکاری کے جال سے تن گئے اور اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے گھر کے درود یوار اس کا منہ جڑا چڑا کر پکار رہے ہوں، کہا ب عالشہ اُبھی ہے۔ عالشہ اُبھی ہے، عالشہ اُبھی ہے ..... وہ ساری رات بستر پر اٹا کر دیں بدلتارہما صبح معمول سے پہلے آئھ بیٹھا۔ ہنادھو

کر کپڑے بدھے، ناشتہ کیا اور سیدھا اپنے کپڑے کی دکان پر جا بیٹھا۔ اس کا ملاز جو چھپے آٹھ ماہ سے تن تھما اس دکان کو اپنے من ملنے طریقے پر چلا رہا تھا، مالک کو اسے دیکھ کر گھبرا گیا۔ لیکن عبدالکریم نے حساب کتاب کے متعلق کوتی باز پرس نہ کی۔ وہ سارا دن کا پرکھوایا کھوایا سا بیٹھا رہا۔ اس کے بہت سے یار دوست اس کی تلاش میں ملائیں گی۔ اپنی بچے لیکن وہ کام کا ہماز کر کے سب کو رکھا تھا سے مالتارہما تیسرے پروہ کا نادلal

بھی حسبِ معمول اس کی تلاش میں وہاں آیا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی عبد الکریم آپ سے باہر ہو گیا۔ اور لوہے کا گزٹاٹا کر دیوانہ وار اس کی طرف لپکا۔  
”خبردار اگر تم سیری دکان پر چڑھتے تو تھاری ٹھانگیں توڑ والوں کا۔ سلے عرامی نے ساری کلیجی میں گندگی پھیلائی رکھی ہے ..... جاؤ جہاگو یہاں سے، ورنہ ابھی پوتھیں کو نجرب کرتا ہوں، سالا دل .....؟“

سرہ شام دکان بند کر کے عبد الکریم سیدھا مسجد میں چلا گیا، اور دیر تک مسجد میں پڑا پلک پلک کر روتا رہا۔ دعا کے کلمات رہ رہ کر اس کی زبان پر آتے تھے۔ لیکن ہن ٹھوں پر لرز کر رہ جاتے تھے۔ جیسے کوئی کہوتا پسند آشیانے پر بار بار آتے اور اسے بیان پا کر پھر طیپھڑتا ہوا دیپس چلا جاتے۔

شاید عبد الکریم مسجد میں پڑے پڑے ہی سو گیا۔ کیونکہ جب کسی نے اس کو بلکر جگایا تو فخر کا وقت تھا۔ مئذن صبح کی اذان دے رہا تھا۔ نیند کے خمار میں عبد الکریم کوئی محسوس ہو رہا تھا کہ یہ اذان کی آواز نہیں، بلکہ دُور کیں بہت دُور کوئی پیچھے چیخ کر پکار رہا ہے، کہ اب عائشہ آرہی ہے۔ عائشہ آرہی ہے، عائشہ آرہی ہے .....؟

## غم جانال

شاعر: کیا لکھ رہے ہو؟  
افسانہ نگار: خاک

شاعر: بڑا پچسپ موضع ہے۔ میں بھی کوشش کر رہا ہوں کہ اس زمین میں کچھ فکر سخن کروں۔

مصور: اپنا بھی یہی ارادہ ہے جب تک خاک کا تصور نہ کیا جائے۔ طبیعت کسی رنگ پر نہ نہیں ہی نہیں پاتی۔

شاعر: آؤ مل کر خاک کی باتیں کریں  
یا خس و خاشک کی باتیں کریں

افسانہ نگار: تسلیمات اصحابو، آپ دونوں گدھے ہیں۔

شاعر: واشد! خوب یاد دلایا۔ بھی کل میں نے ”نوائے خر“ کے نام سے ایک شاندار نظم کی ہے۔ بند عرض کیا ہے۔

مجھ سے پہلی سی مشقت مرے مزدور نہ مانگ  
 اور بھی کام ہیں دنیا میں مشقت کے سوا  
 راحتیں اور بھی ہیں بو جھ کی راحت کے سوا  
 تو جو مل جائے اکسیں لائق دلتی جھاڑوں  
 خال میں تجھ کوٹا کے تیرے کپڑے چھاؤں  
 مجھ سے پہلی سی مشقت مرے مزدور نہ مانگ

تصویر: میرا اگلا شاہر کار بھی اسی حسین و جمیل چوپاتے پر ہو گا۔ گیوب ازم کے نظریات  
 کے مطابق جو فنی صلاحیتیں گدھتے ہیں پاپی جاتی ہیں، وہ کسی دوسرا سے جاندار ہیں  
 نہیں ہیں۔

افسانہ نگار: میرا خیال ہے کہ گدھتے کے بعد آپ حضرات بندپر طبع آزمائی فرمائیں گے۔  
 تصویر: بے شک۔ سریل زم میں آرٹ کا مکالم یہ ہے، کہ ہر سکھ کو اس کی مرکزی حقیقت  
 کے قریب ترین لایا جاتے۔ حضرت انسان کی مرکزی اصلاحیت کے نزدیک پہنچ  
 کر رہت واضح ہو جاتی ہے۔

شاعر: رسول کے ہر سے کھیت میں اٹھلائے بندریا  
 بیلوں کو مجھتے دیکھ کے اڑائے بس نریا  
 مسکائے بندریا

شریائے بندریا

بل کھائے بندریا .. . . .

تصویر: ہیں تو یہی راستے دوں گا کہ آپ اپنے فن کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو اپنے انسانوں  
 میں بندر کو اس کا مناسب منصب ضرور دیجیے۔

افسانہ نگار: زد احباب مجھے بخشیئے۔ ہیں ابھی اتنے کل نعمتوں سے اس درجہ محدود نہیں تھوا

کہ بندر کی طرف رجوع کروں۔

تصویر، خیر، آپ کی مرضی۔ صحیح راستے دینا میر افرض تھا۔ اگر آپ کو بندروں سے دچپی نہیں تو میشک اور صرع بھی بڑے شاداب موضوع ہیں۔

شاعر: صرع پر اس خاکسار نے ایک مسدس کہا تھا۔ ٹیپ کا بندرا حظوظ فرماتے۔

صحیح دم خواب سے دنیا کو جگائیں تو ہم  
غیند کے ماتلوں کو تبکیر سنائیں تو ہم  
تیرے گھر بار کی رونق کو بڑھائیں تو ہم  
تیرے والان کو بیشتوں سے سجاویں تو ہم  
چھ بھی اُستھتے ہی چھری ہم پوچلنے تو نے  
حیف یہ رسم و فاختہ نبھائی تو نے

افسانہ نگار: صاحبو، یہ بندر، گدھے، بینڈک اور صرع آپ کو مبارک ہوں۔ مجھے ان حسین و جیلِ موضوعات سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

شاعر: غالباً آپ نے داستان طرازی کا مشغله ترک کر دیا ہے؟

افسانہ نگار: جی نہیں۔ میں خدا کے فضل سے اب تک افسانے لکھتا ہوں اور خوب لکھتا ہوں۔

تصویر: اگر آپ کو زندگی کے ان بخوبیں سخالت سے دلچسپی نہیں، تو شاید آپ الف بیبل کے شہزادوں، جتوں کے باڈشاہ اور کوہ قاف کی پریوں کی کہانیاں لکھنے کے شوقیں ہوں گے۔

افسانہ نگار: جی نہیں، خدامیری جیلے کو سلامت رکھتے۔ اس کے ہوتے ہوئے مجھے جتوں کے باڈشاہ یا کوہ قاف کی پریوں کا سہارا لبنتے کی مطلقاً حاجت نہیں۔

شاعر: ہمارے کیا نام لے لیا ظالم نے!

تصویر: زندگی کے خوابیدہ نار جننجھوڑ داے اس نام نے۔

شاعر: ہاتے، گیا بات ہے جمیلہ کی۔ ایک زمانہ تھا کہ اس کی زنگ برناگ چوریوں کی ٹھنک سے شعربیت کے طوفان اپلتے تھے۔

تصویر: اس کے جسم کے اقلیہ میں خطوط اور ان کی گھنیری بھوقوں کی سیاہ جمالوں پر یہ شاہکاروں کی معراج تھیں۔

شاعر: اس کی لانبی لانبی کتاب بل کھاتی ہوئی زلف کا تصویر میری شاعری کی جان تھا۔  
تصویر: میں نے ان کی آنکھوں میں کاجل کی تحریر ابھارنے کی خاطر اپنے فن کو کمال بنا کر پنچا دیا۔

شاعر: لیکن ہاتے اجب سے جمیلہ نے اپنی زلف دوتاکٹو اکر بودھیر کھلیے میں۔  
میری شاعری مرگتی ہے۔

تصویر: اب وہ اپنی جمالدار بھوپیں استرے سے موڈ کر ان کی جگہ ترمی کی تھی ہوئی لکبیریں کھینچتی ہے۔ میرے شاعر میرافن برباد ہو گیا۔

شاعر: میرے پیاسے افسانہ نویس، تم اس لند منڈ جمیلہ پر جتنی کہا بیاں چاہو لکھتے رہو۔ اب اس میں میرے عیسے کوئی کشش باقی نہیں رہی۔

افسانہ نگار: تم دونوں بڑے کو زدوق عاشق ہو۔ جس نکتے پر آگ تھارا فن مر گیا ہے جہاں سے میرے آرٹ کی ابتداء ہوتی ہے۔ اگر تم کو جمیلہ کی رعنایتوں کو ایک نظر دیکھا ہے، تو اُو میرے ساتھ چلو۔ میں تھیں طلسیم ہوش رہا کے نظارے دکھاؤں گا.....

شاعر: کہاں چلو گے؟  
افسانہ نگار: بلوٹ کلب۔

تصویر: نہیں! مجھے دہاں جا کر لا بھائیاں آتی ہیں۔ میں نے کتنی مہینے دہاں کی خاک چھانی ہے۔ اور جب کبھی دہاں جاتا ہوں، تو میراجی چاہتا ہے کہ قصاص کی دکان پر لکھی ہوئی

گوشت کی ننگی رانوں کی تصویر کشی کروں۔

افسانہ نگار: اگر تمھیں کچھے گوشت سے اس قدر نفرت ہے تو کوئی بات نہیں۔ میں تمھیں میرٹر دپول کی رقص گاہ میں لے چلوں گا۔ دہان جمیلہ کے لچکیے بدل کو لوگین غباروں کی طرح رقصان دیکھ کر تھا را دل شادا در رُوح منور ہو جاتے گی۔

شاعر: میرے دوست! خدا کے لیے مجھے دہان کی یاد نہ دلاو۔ وجدان کی تلاش میں وہاں کتنی کتنی راتیں جا گا ہوں۔ لیکن ہر بار دہان جا کر میری شاعری کا جو ہر خاک ہو جاتا ہے۔ جب میں جمیلہ کو ہنسی خوشی ہر دوست اور ہر شمس کے ساتھ باری باری ددش بد و ش، بازو بہ باز، سینہ پر سینہ رقص کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو میری دشائی میں رقیب رو سیاہ کا لطیف تجھل قنا ہو جاتا ہے۔

مصطفدر: اب وہ میرے اسٹوڈیو میں ماٹل بننے بھی نہیں آتی بلکہ فوٹوگرافوں کے پیچھے پیچھے بھاگتی ہے، تاکہ اس کی تصویریں اخباروں کے پیچھے صفحات پر شائع ہوں۔ شاعر: اس کے فلیٹ میں بھل کی گھنٹی لگی ہوئی ہے۔ اور مجھے بھی دربان کی جھڑکیاں سینے اور اس کی منت سماجت کرنے کا موقع نصیب نہیں ہوتا۔

مصطفور: میرے نزدیک جمیلہ کا وجود نیست و نابود ہو چکا ہے۔ اب میں اس کی یاد میں اپنے آرٹ کونسی نئی شاہرا ہوں پر چلا رہا ہوں۔ جب مجھے جمیلہ کی خوبصورت اور شدول مانگوں کا خیال آتا ہے تو انگوں کی آمیزش سے چرف اور سینٹ کے مضبوط ستون بناتا ہوں۔ جب مجھے اس کے حسین چہرے کی یاد تاتی ہے تو میں ایکسرے کے فوٹو کی طرح ہڈیوں کے ڈھانچے کی تخلیق کرتا ہوں۔ افسانہ نگار: صاحبو! مجھتم دونوں کی حالت پر رحم آتا ہے۔ میرے سانحہ آدمی تھیں جمیلہ کی ایک بالکل نئی اور اچھوٹی جھلک دکھاؤں گا۔

شاعر: میں خوب جانتا ہوں کہ اب تم ہمیں کسی ریفیو جو کافی چلنے کی دعوت دو گے۔

مصور: میں وہاں ہر گز نہ جاؤں گا۔ بیرے ڈبوں کے سارے رنگ ختم ہو گئے ہیں۔ لیکن  
ہندوستان سے آئے والے رفیعو جیوں کی تعداد میں کمی نہیں ہونے پاتی۔ میرا  
اگر اس رفتار کا ساتھ دینے سے بالکل قاصر ہے۔ میں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں۔  
شاعر: میں نے بھی اس کوچے کی سیرا پھیری کی ہے اور کتنی بار اسی تانک جھانک میں پٹا  
بھی ہوں۔ ناصاحب، اب وہاں جانے سے میری توہہ ہی جعلی۔

افسانہ نگار: تم ہر سے بزرگ انسان ہو۔ میری طرف دیکھو۔ کتنی بار میں نے خود جو تکھانے  
ہیں، لیکن میں ابھی تک رفیعو جیوں پر افسانے لکھنے سے باز نہیں آیا۔

شاعر: تمھارا کیا ہے۔ تم تو بے حیا ہو۔ ہر روز جوتے کھاتے ہو اور پھر کپڑے جھاٹ کر افسانہ  
لکھنے بیٹھ جاتے ہو۔ لیکن شاعر کا دل بڑا ناک ہوتا ہے میرے یادِ دراسی میں  
لگنے سے یہ آگینہ ٹوٹ جاتا ہے۔ تم شوق سے جا کر جوتے کھاؤ اور افسانے لکھو  
میں یہاں بیٹھ کر اُونٹ گاڑی پر اپنی نظم مکتمل کروں گا اور میرا دوست مصور  
لنگوڑ کی لہرقی ہموئی باشکی زلف دقتا۔۔۔۔۔۔ تو بہ معاف کیجیے گا، لنگوڑ کی لہرقی  
ہموئی باشکی دم کی نقاشی کرے گا۔ آکواہ، سبحان اللہ کیا غصب کے شعر ہیں بعض  
کیا ہے:

اُونٹ پھر آیا دل رازِ انہیں اُونٹ نہیں  
یہ تو گاڑی ہے کہیں اور جعلی جاتے گی!  
ڈھنل چکی رات بکھرنے دکاپا وڈر کاغبار  
پھر پھر اسے لگے شانوں پتلا شیدہ بال

## ریلوے جنکشن

”کتنی چھپی پڑتے ہوئے نثار نے چھوٹتے ہی بغير کسی علیک سلیک کے پوچھا۔

”پندرہ دن کی؟“ میں نے جواب دیا۔

”بہت خوب۔ چلو اس بار تھیں لاہور کی زمین دوزمال کامیاب و کھانیں گے“ نثار

نے فیصلہ صادر کیا۔

”میں سیر کر دیں گا۔“ وہ کچھ دیر سوچ کر مشفقاتہ انداز سے کتابہ۔ متم

کھانیاں لکھتا۔“

یہ لاکھ عمل ہم دونوں کے حسب بنشا ہے۔ چنانچہ شام ہوتے ہی نثار مجھے  
مال روڈ پر ایک ہوٹل میں لے گیا۔ ہوٹل کے لان پر ہم کمال بے حیاتی سے ایک ایسی لگنے  
پر جا ڈٹے، جہاں پہلے سے ایک دو ایڈیٹر، چند نامہ نگار، کچھ ریڈیو اسٹیٹ، کچھ ادیب  
اور چند گرگ باراں دیدہ صورت کے سیاسی حضرات براہماں تھے۔ چلتے کافہ پہل  
رہا تھا۔ ایک صاحب کو لڑائی نوش جان فرمائی ہے۔ یہ کوئی لڑائی اس گرم چاٹے

سے مختلف ہے جو گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے اور جسے معمولی ذہانت کے انسان پیا کرتے ہیں۔ یہ مشروب خاص لاہور کی ایجاد ہے اور دستور کے مطابق اس ایجاد کی ماں بھی ضرورت ہے۔ وہ ضرورت پر و پیش کی وجہ سے اکثر حضرات کو پوشیدہ امراض کی طرح لاحق ہو گئی ہے۔

دانشوروں کی اس محفل پر پوسٹ مارٹم کے کمرے کی فضای بڑی شدت سے چھاپی ہوتی ہے۔ قوم کی لاش سامنے ٹیبل پر دھری ہے اور ہر شخص اس کا کوئی نہ کوئی عضو ہاتھ میں لیں یہ بڑی چاکب دستی کے ساتھ پوسٹ مارٹم کرنے میں منہماں ہے، وحاظی جسمانی، ایمانی اور سیاسی امراض سے لے کر خودکشی کے نفسیاتی اساب ہنک بڑی تند ہی سے تشخیص ہو رہی ہے۔ علاج تجویز ہوتے ہیں۔ ناخون پر گرام ہجث ہو رہی ہے۔ میزورڈ مکتے پڑتے ہیں۔ کر سیاں الٹتے الٹتے پختی ہیں۔۔۔۔۔ لیکن اس وقت کی ساری بیماریوں کا واحد علاج صرف اس چاٹے دانی میں ہے۔ جس میں کوئی بڑی احتیاط سے محفوظ ہے۔ کوئی لٹنی والے صاحب پیالی سے منڈ لگاتے مزے کی چسکیاں لے رہے ہیں اور اپنے ارگر کفت در وہیں سیحاوں کے طوفان بد تکمیری کے باوجود بڑی لاتعلقی سے دانع کی ایک عشقیہ غول گنگا رہے ہیں۔

دعاچ سینا کا پر گرام ہے جو کوئی لٹنی صاحب نثار سے پوچھتے ہیں۔

”بھی نہیں آج دوسرے پر گرام میں“ شارمیری طرف اشارہ کر کے دوسرے کے لفظ پر خاصاً دردیتا ہے۔

”سہوں!“ کوئی لٹنی صاحب عینک اتار کر مجھے سر سے پاؤں تک بڑے غور سے گھوستے ہیں۔ ”شارتم نے ابھی ان کی کیا تعریف کی تھی؟ کس جگہ کے میونسپل کمشنر میں یہ؟“

شارق مقہرہ لگا کر ان کی تصحیح کرتا ہے۔ ”میونسپل کمشنر نہیں، بھائی یہ برخوردار ڈیشی

ہے، ڈپٹی کمشنر"

کوولدیٰ صاحب قطعی مروع نہیں ہوتے۔ ٹھیک ہے؟ وہ بڑے مریزا نہ انداز سے فرماتے ہیں میاس نازک زمانے میں ایک آدھ ڈپٹی کمشنر کو ہاتھ میں رکھنا کئی عیزت بات نہیں ہے۔"

پھر وہ کمال شفقت کے ساتھ میری ڈھارس بندھاتے ہیں۔ ڈبرخور دارتم بے فکر رہو، میں لاہور میں تھماری موجودگی سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی گوشش کروں گا۔ انشاء اللہ۔"

"یہ بچھ لا ہو رکی زمین دوزمال گاڑیاں بھی دیکھنا چاہتا ہے؟" تشارمنوہ بانگ کراش کرتا ہے۔ "یہ ان پر کہانیاں لکھے گا۔"  
وہ تم کہانیاں بھی لکھتے ہو؟" کوولدیٰ صاحب اس انداز سے پوچھتے ہیں، جیسے کہانیاں لکھنا کوئی بہت بڑا اخلاقی جرم ہو۔ "کہاں لکھتے ہو؟"  
میں خجالت سے منہنا کہ "نقوش" "وسویرا" "ساق" "ہمایوں" "ادبی دُنیا" وغیرہ کے نام لیتا چوں۔

"یہ رسالے کہاں چھپتے ہیں؟ میں نے تو نہیں دیکھے۔" کوولدیٰ صاحب کی نظر میں میری ادبی پوزیشن گرجاتی ہے۔ وہ اپنی عینک دوبارہ آنکھوں پر لگا لیتے ہیں اور مشققانہ انداز میں مجھے یہ رائے دیتے ہیں کہ اگر مجھے کہانیاں لکھنے کا اتنا ہی شوق ہے تو شمع، ڈارکر اور چنگاری میں لکھا کروں۔ کوولدیٰ کا آخری پیالہ حلق میں اٹھیل کرو وہ ان رسالوں پر اپنی گرائیں۔

اس مختصر سی علمی و ادبی بحث کے بعد جب ہم ہوٹل سے نکل کر ایک تانگے میں ہو رہے ہیں تو شارا در کوولدیٰ صاحب کا تانگے والے سے تبادلہ خیالات شروع ہو جاتا ہے۔ تانگے والا بڑی مشتناقی سے اپنے فتوں نظیفہ کا پرچار کرتا ہے۔

زمیندار اخبار کے عقب میں رہنے والی جوان گیری بولتی ہے ..... چوبی  
والی، جس کا زنگ گورا اور بال سنہری ہیں ..... میو گارڈن والی، جو اسی سال میک  
میں فیل ہوئی ہے ..... گھوڑا ہسپتال کے پاس فامی جو لٹا منگیشکر کی طرح کا قی ہے۔  
..... ماڈل ٹاؤن والی جو ایک ہسپتال میں نوس ہے ..... لیکن نثار اور کولٹنی  
صاحب تلگے والے کے پار گینڈ سے با انکل متاثر نہیں ہوئے۔

”تم سلے باسی کوئی کا باال ہو،“ کوولدی صاحب خفا ہوتے ہیں۔ ”تم سے تو منگ  
کے اڈے کے تانگے والے ہزار درجہ اچھے ہیں“

تلگے والا منگ کے اڈے والوں کو فیض و بلیغ گابیاں دے کر ڈرامائی انداز  
سے اپنا تازہ ترین شاہکار برآمد کرتا ہے۔ ڈرلوکی کیا ہے صاحب، بڑا آلو بخا را ہے۔ ابھی  
کالج میں پڑھتی تھی۔ فقط دو جیسے سے اس لائن میں آئی ہے۔ اب تک صرف چار  
مرتبہ باہر گئی ہے۔ کالے خاں پیٹھان نے پورے سات سور و پے دیے تھے۔ تمہاری  
خاطر سے وسیعیں منالوں گا۔ چلوں؟“

اکو بخارا کے نام سے نثار اور کوولدی صاحب کی رال بھی شکنے لگتی ہے لیکن دد  
سور و پے کا ذکر سن کر ان کے جبڑے لٹک جاتے ہیں۔ وہ دونوں اسیدا فزان نظروں سے  
مجھے گھوڑتے ہیں۔ خاص طور پر کوولدی صاحب کے انداز بڑی شدت سے لکھا رہے  
ہیں۔ بخوردار دیکھوئیں تمھیں اپنی خدمت کا سنہری موقع دے رہا ہوں۔ اگر تم اس  
وقت کام نہ آسکے تو ڈپٹی کمشنر نہیں گھیارے جو۔ لیکن میرے انداز میں کر انھیں تلکا تک  
جواب دیتے اور وہ مایوس ہو کر پھر اپنا جیڑا لٹکا کر بیٹھ جاتے ہیں۔

اس خاموش کوولدی والے بعد صفرع سخن بدل جاتا ہے۔ تلگے والا گھوڑے  
کو مخاطب کر کے ہیں، بڑی تینگیں اور یقین دار گابیاں سنتا ہے۔ نثار اپنے جگری دوستوں کی  
تعریف کرتا ہے جو ضرورت کے وقت اس پر کتنی ہزار روپیہ تک خرچ کرنے سے بھی دریغ

نہیں کرتے۔ اور کوولدی صاحب پاکستان کے جلد افسروں کی لینگی، نالائقی اور بد دنیا تی پر جسی کھول کر بصرہ فرماتے ہیں۔ یوں بھی رفتہ رفتہ کوولدی اپنارنگ دکھارہی ہے اور جب تلنگے والا ٹھڈڑے کی وساطت سے ہیں چندالوداعی گالیاں سنائے ہیں امندھی ہیں تو نوگزے کی قبر کے پاس اتار دیتا ہے۔ تو کوولدی صاحب کے پاؤں بڑی شدت سے لڑکھڑا رہے ہوتے ہیں اور وہ "سوندوش" میں بدل کر بڑی خوش سگلی سے چوک میں کھڑے ہوتے پولیس کافیشیبل کو مخاطب کرتے ہیں۔ "شوپائی جی شلام جیتے رہو" پاہی تھنے پھیلا کر کوولدی کے مذکوہ قریب سے زور لگا کر سونگھتا ہے؟ اچھا جج بھی خوب چڑھا کر ہے صاحب۔ پرمٹ کہاں ہیں؟

کوولدی صاحب فتح مندر غن کی طرح چھاتی نکال کر اپنا ہاتھ میری گدن کی طرف بڑھاتے ہیں۔ غالباً وہ مجھے پرمٹ کے طور پر سپاہی کی خدمت میں پیش کرنے والے ہیں بلکہ میں نظر پچاکر ٹھسک جاتا ہوں اور نوگزے کی قبر کی ادائی میں جا چھتا ہوں۔ مجھے غیر موجود پاک کوولدی صاحب کی چھاتی کا تار ڈھیلا پڑ جاتا ہے اور وہ اپنی شرط کی جیبیں ٹھوٹ کر پائیں روپے کانوٹ کافیشیبل کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ کافیشیبل اس پرمٹ سے مطمئن ہو کر چلا جاتا ہے۔ نثار اور کوولدی صاحب کی گئی لفڑتہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت ان کے درمیان میری ذات کا مستلزم زیر یہ سخور ہے۔ وہ کچھ دیر میرا استھنار کرتے ہیں اور پھر غصے سے ایک طرف چل پڑتے ہیں۔

نوگزے کی قبر کے پاس زیادہ دیر ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں ہے کیونکہ وہی پرمٹ والا سپاہی اب مشتبہ نگاہوں سے بار بار میرا جائزہ سے رہا ہے ہیں واپس لوٹنے کے لیے کوئی ایسا راستہ اختیار کرنا چاہتا ہوں جہاں نثار کوولدی صاحب اور پرمٹ والے کافیشیبل سے میرا سامنا نہ ہو۔ اس تلاش میں میں ہیں ہر امندھی کی بے شمار پیچ دریچ گلیوں کے تانے بننے میں البحث جاتا ہوں۔ اس حمام میں سب

ننگے ہیں۔ گلکیوں اور مٹرکوں پر مٹرگشت کرتے ہوئے شاکنین قدم قدم پر چیل کی طرح جھپٹتے ہوئے دلال۔ دروازوں اور درتپوں میں گلکیوں کی طرح سمجھی ہوئی ہوئیں۔ ..... اپنے رنگ برنگ ملبوسات کے باوجود ساری مخلوق الٹ ننگی ہے اور ان کے جسم اور افراد ان ایک جی بے آواز سر پڑی ہم آہنگی کے ساتھ رقص کر رہے ہیں۔ فضنا میں پچھے گوشت کی بیساند روچی ہوئی ہے۔ اور پڑی پڑی پا اور کے مقاموں کا جنمائی نور گلکیوں اور مٹرکوں پر برص کے داغوں کی طرح پھسیلا ہوا ہے۔ مجھے رہ کر خیال کاتا ہے کہ یہ عورتیں جو دروازوں اور کھڑکیوں میں گردیں لٹکاتے ہیں۔ یہاں کیس پھر سے اڑ جائیں گی۔ اور اب ابیلوں کی طرح اپنی چونپوں میں سکنریاں اٹھا کر ساری دنیا کو اپنے نرغے میں لے لیں گی ..... لیکن عملی طور پر کنکریوں کی جگہ میری گردن پر جھپاک سے بلغم کا ایک بڑا غلغٹا گرتا ہے۔ جو ایک ادھ موئی سی عورت درتبجے میں بیٹھی پڑے اطمینان سے کھنکار کھنکار کرنے پھر خوف رہی ہے۔ میں اپنی گردن کو اس علاقت سے پاک کرنے کی فکر کرتا ہوں۔ تو خدا کی خاص رحمت میری دست گیری فرماتی ہے اور ایک گلی میں مجھے مسجد نظر پڑتی ہے جس کے ایک دروازے پر کالی سیاہی سے "یا ائمہ" اور دوسرے دروازے پر "یا محمد" لکھا ہوا ہے۔ یہ چھوٹی سی مسجد دبلند بالا عمارتوں کے درمیان پڑی ہے کسی سے بکڑی کھڑی ہے۔ اندر پیشایاب اور پاخانے کا تعفن ہے۔ ایک طرف نالی میں یہی کی چند خالی اور شکستہ بو تلیں اونٹھی پڑی ہیں۔ وضو کے لیے ایک پلانا حمام ہے جس کا پانی نوابہ دہن کی طرح کثیفت ہے۔ باسی اور پڑنے نے دروازے سے ہمک مارتا ہے۔ نجلتے اس مسجد کو دیکھ کر میرے دل میں ریل کے انخن کا خیال کیوں آتا ہے، جو تیرفتاری سے چلتا چلتا اچانک پڑھتی سے اتر گیا ہو۔

میرا منڈی سے بھکلتا بھکلتا آفرینشای سی مسجد میں آپنچھتا ہوں۔ اور خدا کی محل فضنا میں اطمینان سے زور زور سے سانس لینے لگتا ہوں۔ رات کے بارہ بجے بھی

مسجد کے آس پاس کئی شاندار کاربین کھڑی ہیں اور ان کے ڈرائیور اور حارڈ صوبے دلی سے بیٹھے اور گھر ہے ہیں۔ یہ شرفاں کی موڑیں ہیں جو اپنی بیگمات سے اجازت لے کر شاہی مسجد میں آہنیمی بھی یا اقبال کے مزار پر ہدایت عقیدت پیش کرنے یہاں آیا کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مسجد کی چکنی سیڑھیوں پر اکثر ان کا پاؤں پھیسل جاتا ہے۔ اور رطحکتے رطحکتے بے اختیار ہیرامندی کے نہاد خانوں میں جاگرتے ہیں۔ اگر اقبال زندہ ہوتا تو سن لجڑا قدر کی ایک نئی تفسیر منظوم کر سکتا تھا۔

شاہی مسجد کے عین مقابل پرانے قلعے کی وہ اونٹھتی ہوئی عمارت ہے جس کے صدر دروازے پر پاکستان کا جہنمذ اسلامنڈی سے لہرا رہا ہے۔ اقبال کے مزار میں ایک چھوٹا سا بلب روشن ہے۔ ٹرالب کچھ عرصہ ہوا چوری ہو گیا تھا۔ لاہور میں بھلی کے نتے بلب آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے۔ کیونکہ ان کی مانگ ہیرامندی میں بہت زیادہ ہے چنانچہ اقبال کے مزار کو ایک چھوٹے سے بلب پر ہی قناعت شعاع ہونا چاہیے۔ مزار کے دروازے پر ایک آہنی قفل لگا ہوا ہے تاکہ عقیدت مند اندر گھس کر سوچ بور ڈن چڑا سکیں..... باہر لان میں ہیرامندی کے اکاڈمکا دلال بھروسے بھلکے را ہیوں کے لیے خفیہ راہ کا کام دینے کے منتظر بیٹھے ہیں۔ ایک تانگے والا دو آنے میں داتا کے دربار پہنچانے کا اعلان کرتا ہے اور میں ایک ک اس میں سوار ہو جاتا ہوں۔ تانگے میں ضلع جملہ کے دو مقدمہ باز بھی بیٹھے ہوتے تھے۔ دن بھر مقدموں اور کچھ بیویں کی زحمت کے بعد وہ گھڑی دو گھڑی دل بھلانے کے لیے ہیرامندی آگئے تھے اور اب حضرت داتا نجف بخش رحمۃ اللہ علیہ کے آستانہ پر سلام کرنے جا رہے ہیں۔

”دکرتا تو سب کچھ اللہ ہی تھے“، ایک مقدمہ بازاپنے ساتھی سے کہدا رہا ہے۔ ”لیکن یزرگوں کا سہارا بھی بڑی چیز ہوتی ہے“

دوسرے مقدمہ باز بھی اس نظرتی کی تائید کرتا ہے۔ اور اس رو حان گفتگو کے بعد وہ دونوں سرگوشیوں میں ہیرا منڈی کے ذاتی تجربات پر تبادلہ خیالات کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

جماعات کی وجہ سے داتا صاحب کے دربار میں عورتوں، مردوں اور بچوں کا بے پناہ ہجوم ہے۔ کھوئے سے کھوا چھلتا ہے اور دربار کے صدر دروازے میں نثار اور کولدٹی صاحبہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چست کھڑے ہیں۔ ہجوم کے ہر بیٹے کے ساتھ وہ خس و خاشاک کی طرح بنتے ہوئے چلے جاتے ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے والپس اگر صدر دروازے کے عین بیچ اپنی جگہ سنپھال لیتے ہیں۔ میں ہر چند گوشش کرتا ہوں کہ ان کی نظر بچا کر ادھر ادھر ہو جاؤں، لیکن نثار مجھے دیکھ لیتا ہے اور زبردستی کیسین کراپنے پاس کھڑا کر لیتا ہے۔ کولدٹی صاحبہ بھی ہیری و چھپلی غرزوں کو فراموش کر کے بڑے اخلاق سے بیش آتے ہیں اور داتا دربار کے ساتھ مسلمان عورتوں کی عقیدت مندی کے جملہ فوائد پر عارف اور دشنی ڈالتے ہیں۔ اپنے پروگرام کے مطابق یہ لوگ اب یہاں سے مزگان کے اڈے پر جائیں گے اور دہاں سے زین دوز کاڑیوں کی دوسرا منزل شروع ہوگی۔ لاہور تارکو ولیسٹرن ریلوے کا بہت ہمکشن ہے۔ یہاں کی زین دوز مال گاڑیاں، ہر طرک، ہر لگلی، ہر کوچے میں چلتی ہیں۔ جگہ جگہ سرخ بیتوں کے نشان ٹھٹھاتے ہیں۔ لیکن ان بیتوں کے باوجود کتنی گاڑیاں کا نٹا بدلتے بدلتے چڑک جاتی ہیں۔ اور اکثر تصادم کے حادثات و قوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی تیز رفتار انجن چلتے چلتے پری سے اُڑ جائے تو اسے چینک نہیں دیا جاتا بلکہ اس کی پیسانی پر اٹھا اور رسول کا نام لکھ کر اسے مسجد کے کام پر لگایا جاتا ہے۔

## سردار جسونت سنگھر

سردار جسونت سنگھر کے بیٹے حسن ابدال کی سرداری آئندگوکی بڑی لڑکی کے متعلق نامہ پر یام شروع ہونے والا تھا۔ لیکن جسونت سنگھر نہ مان کرتا تھا انہاں اس کی وجہ سے بڑی نازک اور بیچیدہ صورت حال پریسا ہو گئی تھی۔ لہر کے علاوہ ساری اہل داری برادری میں اس پرکاری اضطراب تھا۔

سردار جسونت سنگھر اور پر اپنے کمرے میں بیٹھا انگریزی موسیقی کے چند نئے ریکارڈ بچا رہا تھا۔ نیچے والان میں سردار گور و یال سنگھر و نامہ گور و لکھنال کے مطاعمہ میں مشغول تھے۔ سردار جسونت سنگھر کی ماں اپنے بڑے بچے کی اس بے راہ روی پر بڑا خشکیں تبصرہ کر دیتی تھیں اور کوشلیا نہایت ہبہت سے کام لے کر بھائی کی وکالت کر رہی تھی۔

”بھا بوجی!“ کوشلیا نے اپنی ماں سے شکایت کی وہ آپ تو یونہی غصتے میں آجاتی ہیں۔ بھرا تاجی نے آخر کوں سا ایسا جرم کر دیا ہے۔ کہ آپ اتنے دنوں سے ہاتھ و دھوکا راس

کے پیچھے پڑی جوئی ہیں؟"

"ہاں، ہاں جوی۔ میں تو اس کی دشمن ہوں نا۔" بھابو جی نے ڈانٹ پلانی یہ ایک ستم  
ہی دگنی ہوا س کی ہمدرد۔ وہ جھوٹے لگاؤں گی کہ مزاج درست ہو جاتے گا کامے متنہ  
داںے کا"

"ہمئے بھابو جی۔ کچھ تو خیال کیجیے۔ پڑھا کھا جوان بیٹا ہے؟"

"اگلے، ایسی پڑھائی لکھائی گو۔ خبر نہیں ولایت میں کیا کیا کا لاعلم سیکھ کر آیا ہے۔  
میں نے تو سپلے کہا تھا کہ اتنے پاؤں نہ پسلاو۔ لیکن تمہارے بھائیا جی پر تو ولایت کا  
بھروسہ چڑھا ہوا ہے۔ اب روتنے رہو، انکھوں پر ہاتھ روک کے، ہاں؟"

"بھابو جی، آخر کوئی ایسی آفت آگئی ہے۔ شادی بیاہ کی بات ہے۔ بھرا تاجی  
کی بات منسٹنے میں آخر ہرج ہی کیا ہے؟"

"میں نہیں جانتی کہ کیا ہرج ہے اور کیا نہیں۔ اب کل کو تمہاری بات چیت  
ہو گی تو تم بھی بات کرنے بیٹھنا۔ بے شرم کہیں کے؟"

"اوہ، بس بھی کرو۔ سروار گور دیال سنگھنہ رج ہو کر لے۔ مجھے ذرا اخبار تو

پڑھنے دو۔"

"بس تم اخبار ہی پڑھتے رہنا۔ جیسے ہڈی سردار نی بیٹھ کر تمہارا انتظار ہی تو کتنی  
رسہے گی؟"

"نہیں انتظار کرتی، نہ کرے۔ میں کب ہاتھ جوڑ کر اس کے پاس گیا تھا۔"

"اے ہے، واگو رو جہاراج سے ڈو۔ لڑکیوں والوں کے متعلق ایسی بات  
نہیں کیا کرتے۔ ذرا اپنی طرف بھی دیکھ۔ لاثکی لاثک جوان بیٹی بیٹھی ہے۔ واگو رو جہاراج  
سے ڈر کے رہو۔"

"تم تو یونہی مفرکھاتی رہتی ہو۔"

”میں مغرب نہ کھا دل تو کیا کروں آخیر کیا کھوٹ ہے، بڑی سرداری کی بیٹھی میں؟“  
میموں جیسی زنگت ہے۔ ناک ہے۔ نقشہ ہے۔ روپ ہے۔ جب ملتی ہے پاؤں جھپٹوں  
کر ملتی ہے۔ پڑھی لکھتی ہے اور پھر سن ابدال میں آموں کے دو باغ اور تین چار ہی مرٹے  
بھی اس کے نام لگے ہوئے ہیں۔“

”لیکن شاید وہ بھرا تاجی کو پسند نہ ہو۔ کوئی زبردستی سخنواری ہے،“ کوشلیا  
نے احتیاج کیا۔

”پسند کیوں نہ ہو؟ یہ لاث صاحب کا بچہ اور کیا مانگتا ہے؟ کوئی نیم بھی نہ  
لے آیا دلایت سے، ہاں“ بھابلو جی بڑے غصے میں تھیں۔  
بھابلو جی واگھرو کا شنکر کرو، کہ کوئی نیم دینہ نہیں اگتی۔ اگر آجاتی تو ساری عمر کا  
رفنا پہنچنا پڑا رہتا گھر میں،“ کوشلیا نے کہا۔

”اب کو نسیہتی خوشی ہے یہاں۔ میرے تو جاگ جی ایسے ہیں۔ بڑی سرطانی  
سے ناط ٹوٹے گا تو میرا، برادری میں حقد و تھوٹھی تھی ہو گی تو میری۔ یہ تمہارے بھائیوں  
تو جیسے نہیں میں ہیں نہ دیسے میں،“ بھابلو جی نے اب سردار گور دیال سنگھ کی طرف  
توجه مبذول کر لی۔ وہ بستور روز نامہ دگور و گھنٹاں“ کے مطالعہ میں مشتمل تھے۔ آج کے  
پہچے میں شرمی اکالی دل، گور دوارے پر بندھا کیمیشی اور..... کی سیاسی  
کارروائیوں پر بڑی گرامکم سخت تھی۔

سردار جسونت سنگھ کی یاں نے جب دیکھا کہ اس کے الفاظ کی سختی یا نرمی سے  
سردار گور دیال سنگھ کے کان پر جوں تک جھی نہیں رینگی۔ تو اس نے حسب معمول اپنا  
آخری حریز استعمال کرنا شروع کر دیا جو خاص ایسے نازک موقعوں کے لیے محفوظ رہتا تھا۔  
اپنی قسمت کی خرابی، اولاد کی ناخلفی اور خاوند کی ظالمانہ بے توجی پہنچانی زبان کے  
مخصوص محاوروں، بندشوں اور تکیبوں کے ساتھ اس کی آنکھوں سے موٹے

سوٹے آنسو بھی گرنے لگے۔

سردار گور دیال سنگھ بدستور اخبار "گور و گھنٹاں" کے مطابع میں مصروف رہے۔ اور جب ان کی بیوی کی گیریدزاری نے ایک مستقل پنجی کارنگ اختیار کر لیا تو اپنے معمول کے مطابق انھوں نے اخبار کو تہہ کر کے تلکیے کے نیچے رکھا۔ عینک آثار کر چھپے کے کیس میں حفاظت سے بند کی۔ اور چار پانی پر اکٹوں پیچھے کلپنی زوجہ محترم کی طرف متوجہ ہوتے۔

"میں نے کہا جہا گوان یہ کیا ٹھنڈا ہے؟"

"ہاں بھی، میری تو ہربات ٹھنڈا ہوتی ہے؟" بھابوچی نے تنک کر کہا "تم اخبار پڑھتے رہو۔ تھیں کیا واسطہ گھر بار سے؟"  
سردار گور دیال سنگھ مسکرائے۔ جہا گوان، گھر پار تو سب تمھارا ہے، مجھے اس کی فکر کیوں ہو۔ ہاں، اب بتاؤ بات کیا ہے؟"

مہلتے ہاتے۔ ابھی تنک کوئی بات ہی نہیں ہوئی؟ جیسے کچھ سنا ہی نہیں تھا نے؟  
دشمن تو لیا۔ لیکن اگر لڑکا راضی نہ ہو تو جہا گوان تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کر سکتا ہوں؟  
ہماستے جی، تم کچھ نہیں کر سکتے؟ پاؤں سے کھوں کر دس جو تے لگا د تو د کارے  
منہ والا اپنے آپ سیدھا ہو جائے گا؟"

کوشلیا اب تنک خاموش بیٹھی تھی۔ جسونت سنگھ کے بارے میں یہ تجویز من کر دے گھر اگئی اور سردار گور دیال سنگھ سے کھنے لگی۔ دیکھونا بھائیا جی! یہ بھابوچی کیا کیا باتیں کرتی ہے۔ جہا ہجڑا تھا کو مارتے آپ اچھے لگتے ہیں؟

سردار گور دیال سنگھ کو یہ منتظر نہ تھا کسی وقت ان کی اولاد کو خیال بھی آتے کہ وہ اپنے والد بزرگوار کے جو توں کی زرد سے باہر ہیں۔ اس لیے انھوں نے کوشلیا کو ذرا سختی سے جھپڑک دیا۔ دیکھلیا یہی۔ ٹھنڈا استاد ہے جگڑیاں بیٹھو یاں دا! دیکھنا

کہیں تھا راجہ اس خیال میں نہ رہے، کہ اس کے منہ پر دو بال اگ آئے ہیں، تو میرے مجتوں کے تلے بھی بے کار ہو گئے ہیں۔“

”ہاں جی، ذرا دیکھو، سجا بوجی نے لقہ دیا۔“ اب یہ بھی زیج میں بولنے لگی ہے، بڑی آئی ہے بھائی کی وکیل بن کر۔ میں کہتی ہوں اس کا نام بھی کارچ سے کٹوا لو۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں سرپرکٹر روتا پڑے، ہاں؟“

”اجی چھوڑو اس باک کو،“ سردار گور دیال سنگ تعلیم کے سلسلے میں بڑے دش خیال باپ تھے ”تم بھی کیا گنواروں ایسی ؟ تم کرنے لگتی ہو۔ آخر کچھ بتاؤ تو سہی، کہ جسونت کہتا کیا ہے؟“

”ویس کیا بتاؤں؟ میں تو گنوار ہوتی نا،“ سجا بوجی نے سخہ کیا۔

”و تمہارے سامنے بیٹھی ہے پڑھی لامبی لاٹلی۔ اسی سے کیوں نہ پوچھ لو؟“

”و کوشلیا بیٹی تھماری چابو کا تو سرپرگیا ہے۔ تمہیں کچھ معلوم ہے کہ آخر جسونت

ٹکھے کا خیال کیا ہے؟“

”سجا تیا جی،“ کوشلیا نے اپنے خشک ہونشوں پر زبان بھیر کے، ڈرتے ڈرتے ہچکاتے ہچکپاتے کہا۔ ”بھرا تاجی کہتے ہیں کہ نہ میں لڑکی کو اچھی طرح جانتا ہوں نہ لڑکی مجھ سے پوری طرح واقف ہے۔ میں اس شادی کی حامی کیسے بھروں؟“

اس ناظر صورخان کے سلے کو ایسی لڑکی کہاں سملے گی جسے وہ اندر باہر

سے خوب جانتا ہو۔ سنتی ہو کوشلیا کی سجا بو۔ یہ تمہارا لال کیسی منطق بکھارنے لگا۔“

سردار گور دیال کو اپنے بیٹے کی اس بات پر بڑا غصہ آیا۔

”میں تو کب سے اپنا سرپیٹ رہی ہوں۔ میکین تم چوک کوئی بات مزاج میں ہی نہیں لاتے۔ میں کہتی ہوں کہ دس جوستے لگا دو تو سارے ملن تکل جائیں گے۔“

”سجا تیا جی،“ کوشلیا نے صفائی پیش کرنے کی گوشش کی۔ ”اس میں غصہ کھانے

کی کیا بات ہے بھلا ہ بھر تاجی لکھتے ہیں کر دلایت میں کورٹ شپ کا سورواج .....!!  
 یکایک فضائیں ایک پٹا خدا سا چھٹا۔ اور سوداگر گور دیال سنگھ سانپ کی طرح پھنکا  
 کر کھڑے ہو گئے۔ یہ انداز اس بات کی تہیید تھے کہ اب سردار گور دیال سنگھ اپنے ایام  
 تھیں بیلداری کے تجربات کا سچوڑ کام میں لانے والے ہیں۔ پہلے انھوں نے کھڑے ہو  
 کر دلایت اور دلایت والوں کے متعلق بڑے شدید خیالات کا اظہار کیا۔ پھر جسونت  
 سنگھ کی ماں کی سات پشتوں کو بڑے دیس پیمانہ پر گالیاں دیں اور اس کے بعد جوتا  
 ہاتھ میں لے کر وہ جسونت سنگھ کے کرے کی طرف لپکے۔ صین اس وقت باہر گلی میں  
 موڑ سائیکل کے اسٹارٹ ہونے کی بچٹ پھٹاہٹ سُنائی دی اور جسونت سنگھ جو  
 اور پر اپنے کرے میں بیٹھا ساری کارروائی کا جائزہ لے رہا تھا، موقع کی نزدیک بجانپ  
 کر فرار ہو گیا۔ اب بھائیا جی اور بھابو جی کی مجموعی توجہ غریب کوششیا کی طرف رجوع ہو گئی۔  
 ان دونوں نے مل کر کوششیا کو بڑے آڑ سے ہاتھوں لیا۔ اور ان کے غصے کی تان آخر  
 اس فیصلے پر آکے ٹوٹی کر کوششیا کا نام کاچ سے کٹوا دیا جاتے۔ تاکہ کل کلاں جب اس  
 کے رشتے کی بات چیخت شروع ہو تو کمیں وہ بھی اپنے بھائی کے نقش قدم پر چل کر  
 کورٹ شپ کا سوال نہ اٹھاتے۔

”غربوڑے کو دیکھ کر غربوڑہ رنگ پکڑتا ہے بھاگوان“ سردار گور دیال سنگھ نے  
 اپنی اہمیت محترمہ سے اتفاق کیا۔ میں سے تو تم جیسی گنوار سورت ہی اپنی۔  
 ”ہاں جی، ہاں! میں تو گنوار ہوں نا، میں پیٹھے رہو ڈھکے ہوئے۔ اپنی اوقات  
 سے ٹرصننا اچھا نہیں ہوتا۔ اب دیکھ لو اپنی اولاد کے لمحن۔ ساری اہم وابستہ برادری  
 میں ناک نکٹ گئی۔ تو دیکھنا، ہاں۔“

”بس اب یہ ٹرٹ بند بھی کر دیں نہیں ڈرتا سالی برادری سے۔ رہی جسونت سنگھ  
 کی بات۔ میں جو تے مار مار کر اسے تکلے کی طرح سیدھا کر لوں گا۔ ایک گلاس ٹھنڈی

لستی کا پلاقو برف منگوا لینا بازار سے ۲۴

سردار گور دیاں سنگھ نے لئی پی کر اپنا غصہ بخندنا کیا۔ بھابھوجی نے تازہ مکھن کا پھالا  
تاراں لوپر کھا کو شلیا اپنے کمرے میں بستر پر پڑی ساری رات روئی رہی۔ جسونت سنگھ  
گورڈن کالج کے چوشل میں تلوچن سنگھ کے کمرے میں بیٹھا اپنی کورٹ شپ کالائخ محل  
مرتب کرتا رہا۔

سردار جسونت سنگھ کو حسن ابدال کی سرداری کی بڑی لڑکی کوئی خاص ناپسند نہ تھی۔  
ولایت جلنے سے پہلے اگر یہ پیام آتا تو غالباً وہ خوشی سے پاگل ہو جاتا اور اپنے ساتھیوں  
کے ساتھ مل کر گور دوارے کے صحن میں سر کے بل کھڑا ہو کر بکرے بلتا..... لیکن  
اب اصولی طور پر وہ اس رشتے کو ایک بے زبان جانور کی طرح چپ چاپ قبول کرنے  
کے لیے تیار تھا۔ ولایت میں کورٹ شپ کی رسم نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ اسی  
اش کے تحت اسی نے اپنی بہن کو شدیا اور تریجھن سنگھ کے عشق میں ٹہامہ بنا دخل دینا  
شروع کر دیا تھا۔ اور اپنے لیے بھی وہ اس بات کا ممتنی تھا کہ شادی سے پہلے وہ پنی  
منتخب لڑکی کے ساتھ کچھ عرصہ کورٹ شپ کرے۔ آج گھر میں اپنے بھائیا جی اور بھالوچی  
کے ذہنی اور جسمانی انداز دیکھ کر اسے لیکن ہو گیا تھا، کہ چاہے وہ سیدھی طرح مانے یا اکٹی  
طرح، اگر اس کی شادی ہوگی تو حسن ابدال کی بڑی سرداری کے گھر ہو کر رہے گی۔ بھائیا جی  
کو اگر کورٹ شپ والی شرط معلوم نہ ہوتی، شاید وہ اس شادی پر زیادہ زور نہ دیتے لیکن  
بھائیا جی کے سر پر جو آموں کے دو باغات اور تین چاہی سربیوں کا سمجھوت سوار تھا۔  
اس کے اترے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔

اپنی مجبوریوں کے اس ماحول میں سردار جسونت سنگھ کو رہشنی کی صرف ایک کرن نظر آتی تھی۔ وہ یہ تھی کہ حسن ابدال کی بڑی سرداری کے ہاتھ پار لڑکیاں ہونے کی وجہ سے اس کا فائزہ انتخاب کافی وسیع ہونے کے امکانات تھے۔ اگرچہ ابھی

بات چیت صرف بڑی لڑکی کے متعلق چلی تھی۔ لیکن اسے لقینِ تھا کہ اگر اس کی نظر انھا  
چھسلنے پر آمادہ ہوئی تو پہلی سے دوسری، دوسری سے تیسرا اور تیسرا سے چوتھی  
لڑکی پر کہیں زکمیں ضرور اٹھ جاتے گی۔ اسے انگریزی کا ایک مقولہ یاد آیا جو اس  
نے لندن میں سو ہو کے ایک ریستوران میں کسی سے سنا تھا۔ . . . . . وہ اگر تھا سے  
سامنے ایک لڑکی ہے تو تم اپنا دل ھٹوٹھو گے۔ اگر تھا سے سامنے دو لڑکیاں ہیں تو  
تمھا سے دل اور دماغ دونوں ھٹو جائیں گے۔ اگر تین لڑکیاں میں تو جان کی بھی خیر نہیں۔  
”میرے بارہ سو دار جسونت سنگھ نے تلوچن سنگھ کے کندھے پر ہاتھ مار کے  
کہا۔ ”یہاں پر تو ایک ساتھ چار رچار ہیں۔ بس یہ سمجھو کہ اب میرے دل و دماغ،  
کلیچی، پھیپھڑے اور گردوں کی بھی خیر نہیں۔“

ان سب CALCULATION کے بعد سو دار جسونت سنگھ نے حسن اہمال کی بڑی  
سرداری کی بڑی لڑکی کے نام انگریزی میں ایک FORMER خط لکھا:

محترم خاقوں!

”آپ کے اور بہرے خاندانوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ نظامِ عالم کو برقرار  
رکھنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ ان کا رابطہ ایک شادی سے مستحکم کیا جائے۔  
اس خدمت کے لیے انھوں نے آپ کو اور مجھے منتخب کیا ہے اصولی  
طور پر میں ARRANGED شادیوں کے حق میں نہیں۔ اگر اعلیٰ تعالیٰ نے  
آپ پر کچھ اثر کیا ہے تو غالباً آپ کا بھی بھی خیال ہو گا۔

کورٹ شپ کے ایک لفظ نے ہمارے گھرانے میں کھرام مجاہدیا  
ہے۔ یہ آپ کو یہ لفظ دہرانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ میباہ اک آپ  
کی والدہ محترمہ پر بھی وہی فہمنی اور اعصابی رو عمل ہو جو میرے بزرگ  
والدین پر گزر چکا ہے۔

اگر آپ اسے نامناسب رسمجیس تو ہم کچھ عرصہ آپس میں خط و کتابت کر کے کوئٹ شپ کانعم البدل پاسکتے ہیں۔ اگر میں آپ کی دائمی زناقت کا انداز حاصل نہ کر سکوں تو براہ مہربانی مجھے اپنی حضوری ہنسوں کے ساتھ قسمت آزمائی کا موقع عطا فرمائیے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا تھا۔ نظامِ عالم کی سلامتی کے لیے یہ نہایت ضروری نظر آتا ہے کہ ہمارے معذز خاندان آپس میں شادی کی زنجیر کے ذریعے مستحکم ہو جائیں۔ اس زنجیر کی ایک کڑی یہ خاکسار ہے۔ دوسری کڑی فراہم کرنے کے لیے آپ چاروں میں سے ایک کو اپنی قربانی دینا ہوگی：“

خدا حافظ

آپ کا وفادار

جسونت سنگھ

## سُرخِ فَلِيْتَه

سیکرٹری :- میرے خیال میں کارروائی شروع ہونی چاہتی ہے۔ دل، سپرنٹنڈنٹ صاحب آپ کیس کو وضاحت سے بیان فرمائیں۔

سپرنٹنڈنٹ :- یہ سریں سراج جناب کو غالباً یاد ہو گا کہ جب ٹائم پسٹ ملکہ سلبہ کی تقریب زیریغور تھی، تو خاک سار نے بصد ادب و احترام عرض کیا تھا کہ شاید یہ تجربہ منگلا پڑے۔ ذاتی طور پر یہ تا بعد از آزادی نسوان کا مخالف نہیں بلکہ میں نے ہفتہ وار مجلہ نگاہ "اور ماہنامہ پروانہ" میں حقوق نسوان پر بڑے معزکر کے مضامین لکھتے ہیں۔ اگر جناب والا ارشاد فرمائیں تو ان کے تراشے پیش کروں۔ اتفاق سے میری جیب میں چلے آتے ہیں۔

جاہنست سیکرٹری :- یہ بات موضوع سے دور ہے۔ آپ محض کیس بیان کیجیے۔ سپرنٹنڈنٹ :- یہ سری جی بان میں گزارش کر رہا تھا کہ ذاتی طور پر خاک سار آزاد نسوان کا مخالف نہیں۔ لیکن اصولی طور پر دولت خداداد پاکستان میں.....

سیکرٹری: آپ اصولی بحثوں سے پرکنار رہنے کی گوشش کیجیے۔ ہم صرف کیس سنتا چاہتے ہیں۔

اس سندھ سیکرٹری: اور جناب اس کے علاوہ سرکاری ملازمتوں میں عوتوں کا تناسب بحوالہ سرکلنر ۲۵۲ الف مومنہ ۱۹ دسمبر ۱۹۴۷ء مقرر ہو چکا ہے۔ اب اس موضوع پر کسی قسم کی اصولی بحث کرنا غیر مناسب ہے۔ اگر جناب ضروری خیال فرمائیں تو سرکلنر کو رہ پیش کیا جائے۔

انڈر سیکرٹری: میرے خیال میں سرکلنر پیش کرنے کی چند اس ضرورت نہیں۔ ایسا اہم سرکلنر تو سب کو از بہونا چاہئے۔ افسوس تو یہ ہے کہ حکومت کے احکام پر مناسب عمل نہیں کیا جاتا۔ ورنہ اب تک دفتروں میں حسین چروں ..... میرا مطلب ہے، صنفِ نازک کو اپنا جائز حصہ مل چکا ہوتا۔ جناب یہیں سمجھتا ہوں کہ پیشِ نظر کیس کی ساعت کے وقت میں سلیمانی کو بھی اس میٹنگ میں موجود ہونا چاہیے۔ اگر کوئی اعتراض نہ ہو تو اسے بلا بھیجا جائے؟

ڈپٹی سیکرٹری: انڈر سیکرٹری کی راستے نہایت معقول ہے۔ قانونی لحاظ سے اس کیس سے متعلقہ سب لوگوں کو یہاں موجود ہونے کا حق پہنچتا ہے۔

جانش سیکرٹری: یہ دلیل بعید از موضوع ہے ہم ایک محکما نہ معاملے پر غور کر رہے ہیں اور محکمانہ کارروائیاں عدالتی اصولوں کی پابند نہیں ہیں۔

سیکرٹری: میرا روحان بھی جائز سیکرٹری کی راستے سے متفق ہونے کی طرف آمادہ ہے۔ ویل سپرینٹنڈنٹ صاحب بیان جاری رکھیے۔

سپرینٹنڈنٹ، جناب! غلام گزارش کر رہا ہے کہ خاکسار کی موقباً گزارشات کے باوجود جب مس سلیمانی تقریبی منظور ہو گئی، تو یہیں نے عرض کی تھی کہ کم از کم اسے میرے سیکشن میں تعینات نکیا جائے۔ حضور جانتے ہیں کہ میرے سیکشن میں پہلے ہی سے عجیب

مخلوق العناصر بھرے ہوتے ہیں جو کام کی نسبت ہائیں اور سمجھا جائے زیادہ کرتے ہیں۔  
مثلاً ناصر علی میر، جو ہونے کو قبول کرکے ہے لیکن اندر ہی اندر شاعر بھی ہے۔ اور فائدہ  
پہنچنے تکمیل کی مشق کرنے کا عادی ہے کبھی ہر تھوڑے پر نظم کبھی درانی پر غزل،  
کبھی ستر کو طینے والے انجن کی شان میں قصیدہ۔ اللہ اللہ! یہ بھی کیا زمانہ آیا،  
حضور! درنہ شاعری جیسی صنف لطیف کو ان بخوبیوں مصنایں سے کیا  
واسطہ؟ وہ مرزا اسد اشخاں غالب نے فرمایا ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مصنایں خیال میں.....

جانش سیکرٹری: براہ مر ربانی آپ شاعری سے ہٹ کر کیس پر رہیے۔  
سیکرٹری: مجھے اس بات سے قطعی الفاق ہے، دیں؟

سپرینڈنٹ: اور جناب میرے سیکشن میں ناصر علی میر کے علاوہ وہ خبطی سودائی  
نصرت الشخیال بھی ہے جو اپنے آپ کو دور حاضرہ کا بہترین نظر نگار سمجھتا  
ہے۔ اور.....

انڈر سیکرٹری: میرے خیال میں آپ اپنے سیکشن کا تحریر کرنے کی کجاتے میں سلیمانی کے متعلق  
ہائی کرے جائیں تو بہتر ہو گا۔

ڈپٹی سیکرٹری: انڈر سیکرٹری کا مطلب ہے کہ آپ اپنی گفتگو کیسیں کے موضوع سے  
ہست دو رہ جانے دیجیے۔ مجھے اس خیال سے پورا الفاق ہے۔

سپرینڈنٹ: بھی ہاں۔ بے شک، میں عرض کر رہا تھا کہ میرے سیکشن میں پہنچنے ہی سے  
مخلوق العناصر مخلوق کی کھجڑی پکی ہجوں تھی۔ اس پر طریقہ یہ کہ میں سلیمانی پرست  
ہوئی تو اسی سیکشن میں میرے ناجائز خیال میں میتھی لحاظ سے یہ ایک غلطی تھی۔

اسٹنٹ سیکرٹری: حکومت کے منظور شدہ احکامات پر نکتہ چینی کرنے سے سپرینڈنٹ  
کو باز رہنا چاہیے۔

سپرٹمنڈنٹ: جی ہاں بہت خوب۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ چنانچہ جناب عالیٰ سسٹم کے آئندہ پر میرے سیکشن میں گڑبڑا اور بھی زیادہ بڑھ گئی اور باوجود یہ کہ.....  
اسٹینٹ سیکرٹری: کیا مطلب ہے کہ آپ کے سیکشن میں ہمیشہ کچھ نہ چھوڑ دیا جائے۔

حقیقی: تنظیمی لحاظ سے یہ احوال غائب ہے۔

انڈسیکرٹری: میرے خیال میں سپرٹمنڈنٹ صاحب کو ایڈمنسٹریشن کا خاطر خواہ تجربہ نہیں۔ کسی سیکشن میں گڑبڑ کا احتمال تک قابل گرفت ہونا چاہیے۔ چہ جایکہ گڑبڑ ہوا اور پھر سیکھی سے ہو۔

ڈپٹی سیکرٹری: سپرٹمنڈنٹ صاحب، یہ فرمائیے کہ آپ اس پوسٹ پر کب مدت مقرر ہیں؟ اور آپ کی سروں اوزن کچھ تجربات کیا ہیں؟

سپرٹمنڈنٹ: جی حضور، میں معافی کا خواستگار ہوں۔ دراصل میری گزارش کا مطلب یہ تھا، کہ.....

ڈپٹی سیکرٹری: آپ اپنا مطلب چھوڑ دیئے اور فی الحال میرے سوالوں کا جواب دیجیے۔

سپرٹمنڈنٹ: جناب عالیٰ، خاکسار نے ۱۹۲۵ء میں اگرہ یونیورسٹی سے میرٹ کا امتحان پاس کیا تھا۔ حسن اتفاق سے اسی سال مسٹر جان ایٹھن صاحب بھادر سپرٹمنڈنٹ ہوم دیپارٹمنٹ حکومتِ ہندوستانی یعنی صاحبہ کے ہمراہ تاج محل کی زیارت کرنے اگرہ تشریف لاتے۔ خدا تے ذوالجلال دونوں کو غریبِ رحمت کرے۔ بڑی خوبیوں کے لوگ بھتے۔ حسن سیرت سے بالا مل رحم دل، غریب پور، تاج محل کے باہر ان کے تانگے کا گھوڑا بد کئے لگائیں۔ ٹکوپتوواڑی کی دکان کے سامنے بیٹھا بڑی سلکار ہاتھا۔ ان دنوں ٹکوپتوواڑی کی دکان تاج محل کے عین سامنے والے.....

جانش سیکرٹری: مجھے شکر ہے کہ انتظامی ناہلیت کے علاوہ اس سپرنٹنڈنٹ کو ضرورت سے زیادہ ہاتھیں کرنے کا بھی مرض ہے۔ یہ دونوں نہایت سنگین نقصانص ہیں اگر ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی بنیادوں کو اس قسم کی ناہلیت اور بالتویت پر استوار کیا جاسکتا ہے تو یقیناً ہم جنت الحمقایں رہتے ہیں۔ میرے خیال میں اس سپرنٹنڈنٹ کی اہلیت کا جائزہ لینے کے لیے مکمل انکو اتری کی ضرورت ہے۔

سیکرٹری: مجھے اس راستے سے حرف بحر الفاق ہے۔ ناہلیت کو دیدہ دعا برداشت کرنا قومی غداری کے متtradف ہے۔ ویل، سپرنٹنڈنٹ صاحب آپ جا سکتے ہیں، یہ فائل ہمیں چھوڑ جائیے۔

(سپرنٹنڈنٹ جاتا ہے)

سیکرٹری: میرے خیال میں اس سپرنٹنڈنٹ کے کام، تجزیے اور دیگر کوالي فیکشنز کا جائزہ لینے کے بعد میرے پاس ایک مفصل نوٹ پیش ہونا چاہیے۔

جانش سیکرٹری: (ڈپٹی سیکرٹری سے) آپ اس کام پر اپنی خاص توجہ صرف کیجیے۔

ڈپٹی سیکرٹری: (اندر سیکرٹری سے) آپ اس انکو اتری کو اپنی ذاتی نگرانی میں نہایت احتیاط کے ساتھ منعقد کریں۔

اندر سیکرٹری: (اسٹنٹ سیکرٹری سے) اگر اس معاملے میں آپ کو میری مدد کی ضرورت پڑے تو بلا تکلف مجھے بتا دیجیے گا۔

اسٹنٹ سیکرٹری: بہت خوب کیا اب مس سلیمان کا کیس آگے بیان کیا جائے؟ اندر سیکرٹری: شاید یہ بہتر ہو گا کہ سپرنٹنڈنٹ کی غیر موجودگی میں کیس پر روشنی ڈالنے کے لیے مس سلیمان کو بیان بلا لیا جائے؟

جانش سیکرٹری: جیسا کہ فیصلہ ہو چکا ہے: مس سلیمان کو اس پیٹنگ میں بلا نسکے لیے کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ اسٹنٹ سیکرٹری فائل سے کیس پر روشنی

ڈال سکتا ہے۔

سیکرٹری: میں جائزت سیکرٹری کی رائے کے ساتھ اپنے اتفاق کو دہراتا ہوں۔ ویل ویل۔  
کیس بیان ہو۔

اسٹنٹ سیکرٹری: جناب، شکایت کا مطلب بنا ب یہ ہے کہ بل کلک ناصر علی میر،  
جو اندر ہی اندر شاعر بھی ہے، دفتر میں بیٹھ کر اپنی نظمیں لگانے کا عادی ہے۔  
اس کی ایک نظم پر پہنچنے والا صاحب کو شدید اعتراض ہے۔ ان کا خیال ہے  
کہ اس نظم کے پہلے حصے میں سلیمان کی طرف رومانی اشارات ہیں اور یہ ایک اخلاقی  
جرائم ہے، دوسرا حصہ میں حکومت پر حملہ ہے، جو ایک قانونی جرم ہے۔ اور  
اس کے علاوہ ایک ادبی جرم یہ ہے کہ نظم سر سے پاؤں تک بے تفہیم اور بے دلیل  
ہے۔

ڈیمی سیکرٹری: جہاں تک پہنچنے والا صاحب کے ادبی اعتراضات کا تعلق ہے۔ انھیں  
موضوع بحث سے الگ رکھنا چاہیے۔

اندر سیکرٹری: میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ مس سلیمان کے متعلق رومانی اشارات منظوم کرنا بھی کوئی  
جرائم نہیں۔ البتہ اگر مس سلیمان کو خود کوئی وجہ شکایت ہو تو دوسری بات ہے۔ اس لیے  
شروع ہی سے میرا یہ خیال رہا ہے کہ مس سلیمان کی رائے معلوم کرنے کے لیے اسے  
اس میٹنگ میں بلاناحد درجہ مناسب ہو گا۔

جازیت سیکرٹری: مجھے افسوس ہے کہ ہم پیش از مرگ وا دیا کر رہے ہیں۔ نظم متنے  
سے پہلے اس کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا ایک محل سی بات ہے۔

سیکرٹری: بالکل ٹھیک۔ میری رائے کا پہلہ بھی اسی طرف چھکنے کی طرف مائل ہے۔  
ویل اسٹنٹ سیکرٹری صاحب، آپ نظم بیان فرمائیے۔

اسٹنٹ سیکرٹری: جناب نظم کا عنوان ہے "مرخ فیتہ"۔

عرض کیا ہے :

تو نے جب کھایا پان !

تیرے ہنڈوں پر لگا فیتھہ سرخ !

جانِ جان

جانِ جہاں

تیری آنکھوں میں گلابی ڈورے

تیرے گاندوں پر وہ غازے کی بہار

تیرے حلقوم کی شدگ میں مچلتا سا، چمکلتا سا، لمکتا سا ہوا گرم ہو

تیری شلوار پر رشیم کاربن

تیرے پر پیچ غرارے پر گلابی سی عنابی سی کشیدہ کاری سیہات !

تجھ پر موقوف ہے کیا ؟

جانِ جان — جانِ جہاں

سرخ فیتھے میں بندھی رہتی ہے سرکار میری ا

اس میں حاکم بھی محکوم بھی میں۔

اس کے پر پیچ میں پوشیدہ ہے اک دار درس۔

اس کے پہنچے میں لٹکتی ہے، ملکتی ہے، چمکتی ہے ادا چھانسی کی جس میں

سرڑال کے، آہ

مرگتی فائل میری !

انڈر سیکرٹری : واہ وا، واہ وا، سماں اللہ کیا خوب کہا ہے ظالم نے واہ وا،

ڈپٹی سیکرٹری : بہت خوب، بہت خوب، جیسے ان مم راشد کا کلام۔

انڈر سیکرٹری : میرے خیال میں فیض کا زمگ بھی غالب ہے۔ تیری آنکھوں میں گلابی ڈوکے۔

تیری گالوں پر وہ غازے کی بسار۔ وادا، وادا، وادا۔  
ٹپٹی سیکرٹری : کچھ کچھ میراجی کا اثر بھی نمایاں ہے۔

ترسے حلقوم کی شہر رگ میں محلہ تاسا، چکلاتاسا، لمکتاتسا، ہماگم ہوا اور اشکرنے  
زور قلم اور زیادہ!

جانش سیکرٹری : کیا آپ صاحبان داد دے چکے ہیں؟  
انڈر سیکرٹری : اجی صاحب، ہم کیا اور ہماری داد کیا۔ میں نے کہا آپ نے غور فراہم کرنا ہے  
وفاق کی گذڑیوں میں کیسے کیسے لال پوشیدہ ہیں؟ مجھے یقین ہے کہ جب تک  
حکومت خود ان گنج ہاتے گا نامایک تلاش کر کے .....  
جانش سیکرٹری : مجھے ڈھنہ ہے کہ یہ ملکمانہ کارروائی مجلس مشاعرہ کی صورت اختیار کرتی  
جا رہی ہے۔

سیکرٹری : میں خود یہی محسوس کرنے کی گوشش کر رہا ہوں صاحبان، ہمیں سمجھیگی  
کا دامن پکڑنا چاہیے۔ اس کے بغیر امور سلطنت بعنوان شافتے طے نہیں  
سکتے جاسکتے۔

انڈر سیکرٹری : ٹپٹی سیکرٹری! بہت خوب، جناب۔

سیکرٹری : ولی، اسٹینٹ سیکرٹری صاحب۔

اسٹینٹ سیکرٹری : جناب! سپرینڈنٹ صاحب کو شکایت ہے کہ اس نظم کے  
پہلے آٹھ مرصوروں میں مس سلیمہ پاشارات ہیں۔ اور باقی حصے میں سرکار والامدار  
کے نظامِ کارکردگی کی شان میں گستاخی ہے۔

انڈر سیکرٹری : کیا اس نظم میں کسی جگہ مس سلیمہ کا نام آیا ہے؟

اسٹینٹ سیکرٹری : جی نہیں تو،

انڈر سیکرٹری : اس صورت میں یہ شکایات بے بنیاد ہیں۔

ڈپٹی سیکرٹری: اور اگر مس سلیمہ کو یہ خوش فہمی ہے کہ نظموں میں اس کے سروادار کسی خوبصورت لٹکی کا ذکر نہیں ہو سکتا تو اس وہم کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں۔

اندھ سیکرٹری: اس کے علاوہ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ اشارہ مس سلیمہ کی طرف ہے تو ہمیں ان امور پر تحقیقات کرنا ہو گی کہ کیا وہ پان کھاتی ہے؟ کیا پان کھانے کے بعد اس کے ہونٹوں پر سرخ رفتی سے امرانے لگتے ہیں؟ کیا اس کی آنکھوں میں گلابی ڈورے ہیں؟ کیا اس کے گالوں پر غازے کی بھار ہوتی ہے؟ کیا وہ ایسی شلوار پہنتی ہے جس کے پانچوں پر سرخ رین لگا ہو؟ کیا اس کے غرار سے پر سرخ رشیم کے پھول ہوتے ہیں؟ جناب عالی، میں بعد ادب لاحتراف گزارش کروں گا، کہ جب تک ہم مس سلیمہ کو سامنے بٹھا کے ان امور کا مفصل جائزہ نہیں۔ ہماری انکوائری پایہ تکمیل ہمیں پہنچ سکتی۔ کم از کم انصاف کا تقاضہ تو یہی ہے۔

ڈپٹی سیکرٹری: بالکل درست۔ لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ ہمارے دفاتر میں مس سلیمہ کے علاوہ اور بھی ایسی لڑکیاں ہوں جو پان کھاتی ہوں۔ جن کے گالوں پر غازے کی بھار ہو جائیں۔

جانشٹ سیکرٹری: مجھے اس نکتے سے معقولیت کی بُوآتی ہے۔

سیکرٹری: میرا خیال ہے کہ میں بھی میں شومنگھر رہا ہوں۔

اندھ سیکرٹری: جناب! اس صورت میں میں یہ سجنیہ پیش کرنے کی جرأت کر دیں گا کہ مزید انکوائری کے لیے ایک بین الوزارتی میٹنگ منعقد کی جائے اور اس میں سب محکموں میں کام کرنے والی لوگوں کو بھی طلب کیا جائے۔

جانشٹ سیکرٹری: میں سمجھتا ہوں کہ اس کی ابھی چند اس ضرورت نہیں، لیکن جناب، جو خیال مجھے دق کر رہا ہے، وہ یہ ہے کہ اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ یہ نظم

میں سلیمانیا کسی اور فترتی لڑکی کے متعلق ہے تو کیا ہم کسی قسم کا ایکشن یعنی کے مجاز ہوں گے؟

**اسٹنشٹ سیکرٹری :** جناب ایکس کے اس پہلو پر فی الحال غور نہیں کیا گیا۔ میرا خیال ہے کہ الحکومتی بکمل ہونے کے بعد ایکشن تجویز کرنا کوئی کام نہ ہو گا۔

**سیکرٹری :** بہت خوب! آپ کا ذریعہ گھوڑے کے آگے باندھنے کے شوقین نظر آتے ہیں۔ کیا یہ دیافت کر سکتا ہوں کہ اس کیس پر ابتدائی کارروائی کا ذمہ دار کون ہے؟

**اسٹنشٹ سیکرٹری :** جناب، ابتدائی کارروائی اس خاکسار نے بکمل کی تھی۔ سیکرٹری، مجھے نہایت افسوس سے یہ اعلان کرنا پڑتا ہے کہ آپ نے اس قسم کا ہم اور ناپسخت کیس ایجمنڈ پر رکھ کر ہم سب کا وقت صنائع کیا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ حکومت کے قیمتی وقت کو یوں صنائع کر کے آپ ملک اور قوم کی خدمت سرخاجم فرار ہے ہیں تو یہ شک آپ کسی شدید مجرمانہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ مجھے ڈھنے کہ ہمیں آپ کی صلاحیتوں کا از سر نوجائزہ لیتا ہو گا۔ **اسٹنشٹ سیکرٹری :** صاحب، آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ یہ فائل ہمیں چھپوڑ جائیے۔

**اسٹنشٹ سیکرٹری جاتا ہے:**

**سیکرٹری :** (جاہنڑ سیکرٹری سے) آپ اسٹنشٹ سیکرٹری کی صلاحیتوں کا بغور جائزہ لے کر مجھے ایک تفصیلی نوٹ عطا فرمائیں تو مشکور ہوں گا۔ **جاہنڑ سیکرٹری :-** (ڈپٹی سیکرٹری سے) آپ اس کام پر اپنی خاص توجہ صرف کیجیے۔

**ڈپٹی سیکرٹری :** (اندر سیکرٹری سے) اگر آپ کو کسی پوائنٹ پر میری مدد کی فرستہ محسوس ہو تو بلا تکلف فرمادیجیے گا؟

اندر سیکرٹری :- بہت خوب، جناب اکیا اب مس سلیمان کا کیسیں مزید بیان کیا جائے؟  
 جائزٹ سیکرٹری : میں سمجھتا ہوں کہ یہ ناپخت کیسیں مخفض تضییع اوقات  
 ہے۔ میری راستے میں اسے داخل دفتر کروانا چاہیے۔

سیکرٹری : میں محسوس کرتا ہوں کہ میری راستے کا پتہ بھی اس ستجویز کے حق میں  
 جھکاؤ کی طرف مائل ہونے پر آمادہ ہے..... ۔

## ایک طبقہ

جب رابرٹ لانگ بیتی کے کشم ہاؤس سے باہر نکلا، تو جیکسی ٹڈا یوروں کا ایک غول بیبا فی اس پر چھپتا۔ لیکن وہ اچک کر طرک کے کنارے کھڑی ہوئی ایک خالی وکٹوریہ میں سوار ہو گیا۔ وکٹوریہ کی چھت اتری ہوتی تھتی۔ اور گھوڑا اور کوچبان دونوں منزے میں سوار ہو گیا۔ کچھ بیٹھا ایک کوادیٹھا اس کے دونوں کانوں کے خراٹے لے رہے تھے۔ گھوڑے کے سر پر ایک کوادیٹھا اس کے دونوں کانوں میں باری باری سے ٹھوٹگیں مار رہا تھا۔ لکھیوں کا ایک چھتہ کوچبان کے مٹہ پر منڈل رہا تھا۔ کچھ بیٹھا اس کے نھننوں اور نیم واد ہانے بیس بے تکلفی سے مصروف سیاحت تھیں۔ رابرٹ لانگ کے سوار ہونے پر گاڑی کو دھکاں گا اور گھوڑا اور گھوڑے کا مالک دونوں اپنے خوابوں کے جز بیرون سے اس دنیا سے فانی ہیں لوٹ آتے۔ کوچبان نے اپنی جینگی آنکھیں گھما کر ساف کا جائزہ لیا۔ اپنے مخفی جسم کو موڑ کر ایک پیچیدہ سی انگھٹائی لی۔ اور زور سے کھنکا کر دو تین ادھ موٹی لکھیوں کو باہر مخنوک دیا۔ جو سیر و سیاحت کے شوق ہیں اس کے لئے کے اندر ورنی نہماں خانوں میں پھیلکی تھیں۔ پھر اس نے چاپک ہوا میں گھما کر

دوچار گھوڑے کی بیٹھ پر سید کیے۔ گھوڑے نے احتیاجاً اپنی سچھل ٹانگیں انھا کر کچھ دلتیاں جھاڑیں اور پھر خاموشی سے راہ راست پر چل پڑا۔

چھوں چھوں ٹھک ٹھک ..... چھوں چھوں ٹھک ٹھک ۔۔۔۔۔ وکٹویریہ  
چھر جاتی ہوئی کھشک ٹھاتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ اس کے آگے چیچھے، دائیں بائیں موڑوں،  
ٹھاموں، ٹھانگوں، رکشاً ذؤں، سائیکلوں، گتوں، بکریوں، بیلوں اور انسانوں کا تاثنا سا  
بندھا ہوا تھا۔ اگر کوئی چیز اچانک وکٹویریہ کے راستے میں حائل ہوتی تھی۔ تو کچاباں بڑی  
فصاحت و بلاغت سے اس کے شجرہ نسب پر طویل تبصرہ کرتا تھا۔ اس کے منہ میں  
پان کی پیک بھری ہوئی تھی اور وہ بڑی بے تکلفی سے اُسے راہ چلتے ہوئے انسانوں  
اور جانوروں پر ٹھوکتا جاتا تھا۔ رابرٹ لانگ وکٹویریہ کی سیٹ پر نیم دنار پر اسوج رہا تھا کہ  
کوچباں نے ابھی تک اس سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ کہاں جانا چاہتا ہے۔ نہ معلوم وہ  
اسے خراماں خراماں کس منزل کی طرف یہے جا رہا ہے؟ شاید اس یوگیوں اور جادوگوں کی  
سر زمین پر جہاں لوگ شنگے پاؤں دیکھتے ہوئے انگاروں پر چلتے ہیں۔ بشیشے چباتے ہیں۔  
رسوں پر درختوں کی طرح چڑھ جاتے ہیں۔ سوئیوں اور ٹھنڈوں پر سوتے ہیں۔ شاید کہ  
اس سرزین کے کوچباں اپنے مسافروں کی پیشانی پر ہی ان کی منزل کا نام پڑھ دیتے ہوں؟  
شاید یہ کوچباں کوئی پُرا سارا یوگی ہو جو مستقبل کے آئینے میں نامعلوم قسمتوں کے لازم پڑتا  
ہو۔ شاید اس نے دیکھا ہو کہ نیویارک پوسٹ کا نام نگاہِ خصوصی رابرٹ لانگ کوین میڈیو بجھے  
میں امریکہ سے لندن پہنچا۔ لندن میں اس نے اپنے اخبار کے لیے کہانیاں لکھیں، شراب  
پی اور ہائیڈ پارک میں مٹھلانے والے بے شمار چھوکروں سے معاشرے کیے۔ ایسیں ایں  
سیر ٹھہ موریں اس نے پہلے مسٹر جنکس اور پھر ہلڈ اسے جی بھلایا۔ اور آج صبح جب  
جمائز نے اپنے مسافروں کو بیٹھی کی زمین پر اگل دیا تو یہ پُرا سارا کوچباں اپنے جانے  
پہچانے دوست کو لینے کے لیے پہلے ہی سے طرک پر موجود تھا! شاید اب وہ اپنے

پوشیدہ تر خانے کی طرف لیئے جا رہا ہے۔ جس بیں عودا و رعنبر کی بتیاں سلگ رہی ہوں گی پر یہاں پر کھو پڑیوں اور ٹہیوں کے ڈھانچے لفک رہے ہوں گے۔ ایک کونے میں ایک تھم سی موہن تی جل رہی ہوگی۔ دوسرے میں کوچبائی ہو گا، اپنے ہاتھ میں ال دین کا چراش لیئے..... یہاں ایک رابرٹ لانگ کا سہانا پینا ایک جھکٹے کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ کیونکہ وکٹوریہ کا ایک پہنچ سامنے کی طرف آتی ہوئی بیل گاڑی کے پہنچ سے ملکا کریڈی طرح ابلجھ کیا رہتا۔ بیل کی گدن کھنچ کر وکٹوریہ کے اندر آگئی تھی اور سرخ سرخ جلتی ہوئی آنکھوں والا بیل وکٹوریہ کے اندر رابرٹ لانگ کے عین سامنے ٹڑے خطرناک انداز میں چینکار رہا تھا۔ اس کے نوکیلے سینگ رابرٹ لانگ کی چھاتی سے چند ایج دو ہمیبا نہ طور پر آؤیزاں تھے اور منہ سے کفت ابل کراس کی پتوں پر ٹپک رہی تھی۔ کوچبائی اور گاڑی بان اپنی اپنی جگہ بیٹھے زور زور سے چلا رہے تھے، اور ایک دوسرے کے خاندان کی مستولہ کے چال چلنے کے متعلق ٹڑے گھرے رازوں کے انکشافات کر رہے تھے۔ اور تماش میں کا ایک گردہ نیم بیضوی شکل میں کھڑا اپنی دلچسپی کا انہما کر رہا تھا۔ کبھی کبھی گاڑی بان کے ہاتھ کو اپنی طرف اشارہ کرتے دیکھ کر رابرٹ لانگ کو خیال ہوتا تھا کہ شاید اس کا اپنا شجرہ نسب بھی زیرِ بحث ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ ہر کوئی اپنی بساط کے طلاق صورت حالات پر تبصرہ کر رہا تھا۔ ایک بدھوتی پوش بزرگ نے جو سر پر گاندھی ٹوپی اور جس تھے یہ حل پیش کیا کہ کوچبائی اپنے سفید فام مسافر کو وکٹوریہ سے نیچے اتار دے۔ سلیمان نے سختی سے یہ تجویز ماننے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس عمل سے وکٹوریہ کے پہنچ کا بیل گاڑی کے پہنچ سے لانگ ہوتے کا کوئی عمل پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس انکار پر گاندھی ٹوپی والے بزرگ نے سلیمان کی سرخ ترکی ٹوپی کے متعلق ایک گھناؤنی سی رائے کا انہما کیا۔ سلیمان نے بھی ترکی جواب دیا۔ . اور گاندھی ٹوپی کے متعلق عورت کے جسم کے بعض حصوں کی ساخت کی تشبیہہ پیش کی۔ سہیں

میں کچھ لوگوں نے داد دی۔ بعض لوگ مسکرائے اور بعض بڑی طرح بگڑے۔ رابرٹ لانگ کو اس بحث میں بڑا مرزا آرہا تھا۔ اس کے دل میں ایک بہم سی امید نے کردہ لی کہ شاید اس ملک کی روایات کے مطابق ٹوپیوں کی پیشکار بڑھتے بڑھتے ہندو مسلم فساد کی شکل اختیار کرے۔ اور وکتوریہ میں ایک بھرے ہڈتھیل کے سینگول کے سامنے بیٹھے ہیٹھے اس کا صحافتی دماغ نیویارک پوسٹ کے لیے ایک تاریخی ڈیپیچ تیار کرنے لگا۔ بہی میں ہندو مسلم فساد تین افراد پلاک، بے شمار زخمی، امریکی اخبار نویس کی گھوڑا گاڑی پر بحث، نیویارک پوسٹ کے نمائندہ خصوصی رابرٹ لانگ پر حملہ۔

باقسمتی سے رابرٹ لانگ کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ جب گاڑی بان اور کوچبان کے پاس ایک دوسرے کے خاندانی اسرار و روز ختم ہو گئے تو انہوں نے ناموشی سے اتر کر اپنی اپنی گاڑیوں کے انجھے ہوتے ہیتوں کو ایک دوسرے سے الگ کیا اور چند الوداعی گالیوں کے بعد اپنی اپنی راہ پر چل کھڑے ہوتے۔

وکتوریہ میں بیل کے سینگوں کے سامنے اکڑوں بیٹھے بیٹھے رابرٹ لانگ کی کراور پیٹھ تھک گئی تھی اور اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد تاج محل ہوٹل پینچ کر گرم گرم غسل کرے اور پھر لا فرنس میں بیٹھ کر ان غزالی ایکھوں، سانپ کی طرح اہرلنے والی کالی چوپیوں اور سراتی ہرمنی والغیر بس اڑھیوں کا نظارہ کرے جن کے تختیل نے مدت سے اس کے دل کو آباد کیا ہوا تھا۔ یہ تصویریں الف لیلہ کے قصتوں کی طرح اس کے دماغ پر قش تھیں۔ اور بے شمار عجیب و غریب رو جانی تصویرات نے اس پر ایک طسمی جاں سا بن رکھا تھا۔ رابرٹ لانگ نے سوچا کہ بیل کے ساتھ اس کا پہلا تجربہ کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھا اور اس کے پتوں پر کفت کے گرے ہوئے چھینٹے ہڑے غلیظ ناظر اسے تھے۔ اگر وکتوریہ کا پی اسراریوگی سلیمان اسے یونہی اپنی طسمی دنیا میں لیے پھر تارہا تو نہ معلوم ابھی کتنا او بیلیوں، گھوڑوں اور باختیوں کے ساتھ اسے اختلاط کا شرف نصیب ہوگا۔ یوں تو وہ

ایک سچے نامہ بگار کی طرح ہر قسم کے تجربات کے لیے تیار تھا۔ لیکن یہی کمپلی شام! اگر یہ شام غرماںی آئندھوں اور بل کھانی ہوئی ناگنوں کے بغیر گز رکھتی تو زندگی میں ایک ایسا خلا رہ جاتے گا جسے ہزاروں خوشگوار اور پر کیف شایبیں بھی پڑھ کر سکتیں گی۔ زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ یہ چند اولین تاثرات ہی تو ہوتے ہیں جن میں کچھ اجنبیت، کچھ معاشرت، کچھ قرب، کچھ بعد کا حسین امتزاج ہوتا ہے۔ مجلہ سعد و سی کی پہلی شام! قوبتے ہوتے سورج کی آخری کنیں یہیں پر ادا سی کی طرح چھائی ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں دکانوں کے اندر وی خصوصی میں بجیاں بھی جلنے لگی تھیں۔ یہ تو وہ اچھوتو وقت ہے، جب روشنی اور تاریکی لگے ملتے ہیں۔ آئندوں کے سامنے مرمریں اجسام پر کالی زلفوں کے بادل بکھر جاتے ہیں۔ کائنات کروٹ لیتی ہے۔ گناہ اور ثواب پہلو بدلتے ہیں۔ تاج محل ہوٹل کے بال روم میں قسموں کی ڈپل روش ہوتی ہے اور غرماںی آئندھیں کالمی کالمی، لماتی ہوئی ناگن زلفیں۔

”تاج محل ہوٹل“ رابرٹ لانگ نے نراچلا کر سلیمان کو مخاطب کیا۔ وہ اپنے مستقبل کی عنان اس مشتبہ یوگی کے ہاتھ میں دے کر یہی میں اپنے پہلے دن کے تجربات کو ضائع کرنا ہمیں چاہتا تھا۔

”بہت اچھا صاحب؟“ سلیمان نے اس کی طرف دیکھ لیغیر میکانیکی طور پر جواب دی۔ کچھ دوسرے گے پان اور پیڑی کی دکان تھی۔ وکٹوریہ اس کے سامنے رُک گئی۔ یونچے اُتر کر سلیمان نے کچھ پان اور پیڑیاں خرید کیں۔ داموں پر اس کی دکاندار کے ساتھ کچھ تکرار بھی ہوئی۔ وہ دونوں ایجھی بازار کے بھاؤ پر تباہ از خیالات کر رہے تھے کہ ایک بندروالا وکٹوریہ کے قریب آیا اور ہاتھ بڑھا کر اُس نے رابرٹ لانگ کے کافنوں کے نزویک نور سے ڈگنگی بھائی۔ رابرٹ لانگ گھبرا کر چونک اٹھا۔ بندروالے نے بہت سے زنجیں کا ڈھیلا ڈھالا۔ چند پتھروں تھا۔ اس کے سر پر ایک لمبی تری ٹوپی تھی جس میں جا بجا موڑ کے پر اڑتے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں رسی تھی جو دو ڈبے بندروں کے لگے میں پڑی ہوئی

تھی، اور کوئی چار پانچ چھوٹے چھوٹے بندر کے نیچے اس کے جسم پر جا بجا چھٹے ہوئے تھے۔ کوئی گندھے پر بیٹھا تھا، کوئی گردن پر۔ کوئی عینٹ کے ساتھ لگا ہوا تھا اور ایک نہما متنا سا بچہ اس کی لوپی پرفراوغت سے بیٹھا منگ پھلی ٹھونگ درتا تھا۔ ڈنگل کی آواز سن کر ٹوپی والا بندر نیچے اتر آیا اور جیاؤں چیاؤں کرتا ہوا الپک کر رابرٹ لانگ کے رانقوں پر آبیٹھا۔ اس کے مذہ میں منگ پھلی کا دانہ تھا۔ اور وہ رابرٹ لانگ کا مذہ پڑھا چڑا کا سے گُرنے لگا۔ رابرٹ کو یہ ادا بہت پسند آئی اور اس نے پیار سے بندر کو اپنی گود میں بھالیا۔

”ڈگ ڈگ، ڈگ ڈگ“ بندر والا بڑا کامیاب تھا۔ زور زور سے ڈکڈگ بجا کر اس نے قیمت کا اعلان کیا: ”صاحب بڑا نسلی بندر ہے۔ صرف ایک سور و پیہہ“

انتہے میں سیمان بھی پان اور پیری کا سودا چکار کروالپس آگیا تھا۔ سور و پیہہ سن کر اس کے کان کھڑے ہوئے: ”اپسے سور و پے کے نیچے۔ ڈکھ دلانے کا ارادہ ہے کیا؟“

”ابھی میاں، اپنا راستہ ناپو، تم کیوں ہماری بات میں ٹانگ اڑاتے ہو؟“

”اچھا جی، یہ بات ہے؟ میں کہتا ہوں میا۔ میرے ساتھ معاملہ کرو۔ ابھی بکواؤں گا۔ ماں ایسے صاحبوں کو انگلیوں پر سچاناتور دن کا کام ہے اپنا۔ کیا کہتے ہو؟“

”بکواؤ۔ کیا دلواتے ہو؟“

”قیمیں! بیس تھا رے، دس اپنے۔ کیا کہتے ہو؟“

”کچھ اور دلواؤ استاد۔ تھا رے قدموں کے طفیل ہمارا بھی بھلا جو گا۔ بندر والا خوش ماڈ کرنے لگا۔

”اچھا دیکھتا ہوں، تم بھی کیا دکرو گے بیٹا۔“

بندر والے اور سیمان میں کافی دیر تک چیخ پیچ ہوتی رہی۔ وہ پانچ اڑتا تھا۔ یہ دو بڑھتا تھا۔ اور راجح کا رسودا اپچاس پر اسکے روکا۔ رابرٹ لانگ نے ڈالوں کا

کا حساب لگایا تو پندرہ یا سو روڑا رہتے تھے یعنی نیو یارک کے ہوٹل میں دو اچھے بچوں کی قیمت۔ یا پرس میں کسی نائٹ کلب کی ایک رات۔ اس قیمت پر تھامنا بندروں نے کافی جو اس کی گود سے نکل کر اب اس کے کندھے پر بیٹھا ہوا نہ سے سے منگ پھل کھا رہا تھا۔ نظر پر آئیں میں نے میں روپے اپنی جیب میں ڈال دیے اور تیس بندروں کے پس رکیے۔ رابرٹ لانگ دل ہی دل میں سلیمان کی مدد پر احسان ہند ہوا جس نے کمال محنت سے بندر کی قیمت سو روپے سے بچا س روپے کر دی تھی۔ جیب و کٹوریہ دوبارہ جلی تو گھوڑے کی چال میں پہنے سے زیادہ سبکی تھی اور سلیمان کا چاپک بھی غیر معمولی سرگرمی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے اپنے منزیں بھری ہوئی پیک کو ایک راہ چلتی ہوئی گھنٹے کی پہنچ پر چکاری مار کر تھوک دیا۔ ٹوپی اتار کر اس کی گد کو چھاڑا۔ پھنسنے کو سمجھایا۔ کافنوں میں رومال گھما کر تیل نکالی اور پھر گردون گھما کر اپنی حصینگی انکھ کے تر پچھے زاویے سے رابرٹ کی طرف دیکھا۔ ہلاکلا صاحب ہے؟ اس نے رازدار انداز سے دریافت کیا۔

”ہلاکلا ہے“ رابرٹ لانگ نے سوچا، شاید کسی ہندوستانی مٹھانی کا نام ہو۔ یا شاید یا اس پر اسرار یوگی کے کسی خفیہ تہ خانے کی طرف اشارہ ہو۔ بہ کمی وہ اپنے محسن کا دل توڑنا نہیں چاہتا۔ اگر سلیمان کی رضی ہے کہ وہ اپنے مسافر کو وکٹوریہ میں زیادہ سے زیادہ عرصہ ٹھاکر کر کیا یہیں خاطر خواہ اضافہ کر سکے تو کر سکے تو کرنے دو۔ یہ اس کا حق ہے۔ آخر اس نے بھی تو گوشش کر کے بندر کی قیمت میں بچا س روپیہ کی تخفیف کرائی تھی۔ تاج محل ہوٹل کیا ہے۔ ایک گھنٹہ پہلے پہنچے یا بعد، فرق ہی کیا پڑتا ہے۔ ہاں، استاد سلیمان؛ اگر تھماری خوشی ہلاکلا ہی میں ہے تو ہلاکلا ہی سی۔ یہ کسی ہندوستانی مٹھانی کا نام ہیا کسی یوگی کے پُر اسرار تہ خانے کا۔ ایک بھی بات ہے۔ تم اپنا جی خوش کرلو۔

”آپ کا دل بہت خوش ہو جائے گا۔ صاحب اس کے بغیر بمعتی میں جینا بھی سیکار ہے اور مرتبا بھی بے کار ہے۔“ سلیمان نے اپنا فلسفہ بیان کیا پھر اس نے ایک

بھلی کے کھبے کے نیچے وک کر گاڑی کے دھواں اکلو، میلے لمپوں کو روشن کیا۔ شام کا دھنکہ  
اب تاریکی میں بدل گیا تھا اور گنجان بازاروں کی دلیل پیل سے سکل کروکٹور یہ ایک خاموش ٹرک  
پر چلی جا رہی تھی۔ دونوں طرف کشادہ باغیچوں کے درمیان چھوٹی چھوٹی کوٹھیاں تھیں۔  
اگر ان میں روشنیاں نہ ہوتیں، اور کہیں کہیں برآمدوں سے ہنسنے والے نئے کی آوازیں نہ  
آتیں تو شاید یہ محسوس ہوتا کہ یہ آبادی نہیں قبرستان ہے۔ کوئی آدھ گھنٹہ چلنے کے بعد کٹور یہ  
سینٹ کے ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے لوگ لگتے۔ چنانکہ پر ایک چوکیدار بیٹھا  
چل پر رہا تھا۔ سیلان کو دیکھ کر سلام کیا اور رابرٹ لانگ ایک سحر زدہ انسان کی طرح اس  
کے پیچھے پیچھے اندر چلا آیا۔

ڈرانگ روم میں اور کوئی نہ تھا۔ فرش پر ایک پرانا قالین بچھا تھا۔ جس کا جو  
پامال ہو کر جگہ جگہ سے اٹکا رہا تھا۔ اور اب اس کی صورت میاث ایسی سکل آئی تھی صیہونوں  
کے پر انگ بیٹھے ہوئے تھے اور گدوں پر کہیں تیل کہیں سیاہی، کہیں سالن کے چکنے  
دھیے تھے۔ دروازوں پر موٹے موٹے پردے لٹک رہے تھے، جن کا نگ شاید بھی سترخ  
تھا۔ لیکن اب مرغی ذبح کرنے کے بعدنالی میں جسے ہوئے خون کی طرح سیاہی مائل ہو گیا  
تھا۔ چھت پر مکڑی کے جالے نہ معلوم کہس کہس بھیکی پر دہ پوشاکی کر رہے تھے۔ دیواروں  
کا پلٹر جگہ جگہ سے الکھ کر گر گیا تھا اور کہیں کہیں پکے ہوئے چھوڑے کی جلد کی طرح پیٹنے  
کے قریب تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دیواروں کی چھاتی سالما سال کے راز چھپائے  
تھا کہ گئی ہے۔ اور اب کسی وقت مجبور ہو کر اچانک بھاک سے پھٹ جائے گی۔ فضائیں  
ایک عجیب سی کشافت تھی، اور کمرے کے ایک کونے میں ایک طوطے کا پنجرہ لٹک رہا تھا۔  
طوطے نے رابرٹ لانگ کی آمد پر تو کوئی توجہ نہ دی۔ البتہ اس کے کندھے پر بیٹھے ہوئے  
بند رکنیم باز انگھوں سے بُری طرح گھوڑا بند رنے بھی جوانی کا رد وانی شروع کی اور  
کچھ عرصتہ کے وہ دونوں ایک دوسرے کو گھوڑا گھوڑ کراپنی شدیدناپسندیگی کا انداز کرتے

رہے۔ قریب تھا کہ ان کا اختلاف رائے کوئی اور عمل صورت اختیار کرے کہ کیا کیا ایک پر دے کو جنہیں ہوتی اور ایک ادھیر عمر کی کالی کلوٹی، موٹی سی عورت یوں کرے میں داخل ہوتی جیسے ریل کا انجن بھک بھک کرتا پہیت فارم پر آتا ہے۔ خوش آمدید، خوش آمدید۔ میرے اچھے نوجوان یہ تھماری نیک بختی ہے کہ تم یہاں چلے آئے۔ درنہ اجنبی نوجوان اس غلیظ ناشرہ میں بڑی طرح بھک جلتے ہیں اور پھر پشت ہاپشت تک ان کے خون میں پاکیزگی پیدا نہیں ہوتی۔ سیلماں ٹرا اچھا رہتا ہے۔ میری چھت کے نیچے ابھی بھک کوں جڑا کم پیدا نہیں ہوتے۔ یہاں پر تم اپنے آپ کو یوں محفوظ سمجھو جیسے تم ڈی، ڈی، ٹی کے آپ میں نیٹھے ہو۔ آڈ، آڈ، جوان آڈ۔ بھک بھک کرتا ہوا انجن روانہ ہجوا اور رابرٹ لانگ کیل کے ڈبے کی طرح اس کے ساتھ جتا ہوا نیچھے نیچھے چلنے لگا۔ عورت کے بال کئے ہوتے تھے اور ان میں جا سجا میں کے سفید سفید ذرے ابرک کی طرح چمک رہے تھے۔ اس نے نیل چھینٹ کافراں پہنا ہوا تھا۔ جس کے نیچے اس کی بہنہ پیش لیاں آئیں تو سی مگروں کی طرح بھکی ہوتی تھیں۔ پاؤں میں اُوچی ایڑی والی گرگابی تھی، جس پر مدت سے پالش نہیں ہوا تھا۔ وہ ابھی چند قدم ہی چلے تھے کہ کیا کیا عورت کے مند سے ایک ڈراؤن چیخ نکلی اور وہ اُچھل کر دھرام سے فرش پر گر گئی جیسے ریل کا انجن پڑی سے اُٹک کر لکھ جائے۔ رابرٹ لانگ نے جلدی جلدی اس کافراں درست کیا۔ اور اپنے بانوؤں کا سماں پے کے کام سے اٹھایا۔

”معاف کیجیے، میں بہت شرمند ہوں۔ میرے اس بے وقوف بند نے خواہ مخواہ آپ کے کندھے پر کوکر آپ کو ڈرایا۔ میں بہت شرمند ہوں؟“  
 ”اوہوا! یہ تھارا بند رہے۔ آہا، کیسا پیارا۔ اچھے ہے۔ میں خواہ مخواہ ڈرگئی۔ لکھا سوٹھے ہے۔ یہ عورت نے اپنے سے ہوتے چھرے پر جھوٹی مسکلا ہست پیدا کرنے کی گوشش کی۔ اس کے مند پر پیسٹنے کے قدرے بھرے ہوتے تھے۔ جن میں پوٹر گھل گھل کر برص کے

داغوں کی طرح پھیل رہا تھا۔ اس کے بالائی ہونٹ پر بالوں کی لکیر جو کریم اور پاؤڈر کی تہوں میں دبی ہوئی تھی۔ اب گھبرائی بل کے رونگٹوں کی طرح کھڑی جو گتی تھی۔

ڈانگ رومن سے نکل کر وہ ایک دالان میں آئے۔ دہاں سے وہ بکان کے پچھواڑے میں ایک اور کمرے میں داخل ہوتے۔ یہ کمرہ بڑا خوش نما تھا۔ چھٹ پر کہنی سو کینٹبل پور کے قسم نور بر سار ہے تھے۔ دیواروں پر پھول دان اور گلداستے نیکے ہوئے تھے۔ فرش پر ایک بے داغ سفید چامنی بکھی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں خوبصورت ایرانی غالباً پچھے تھا۔ اس پر راشم کے گاؤں تکیے لگے ہوئے تھے۔ اور ایک تکیے کے سہالے بخوبی ایک تنی ہوئی گان کی طرح نیم دراز تھی۔ اس کی کالی زلفیں زہر تک مانگوں کی طرح اس کے شنازوں پر لامراہی تھیں۔ اس کی غزالی آنکھوں میں مفتان طیس کے ملکھے تھے۔ اس کے جسم کا گلزار گمرے کی فضای میں عودا اور عنبر کی طرح سلاگ رہا تھا۔ رابرٹ لانگ نے حیرت سے آنکھوں میلی۔

بجمہ کے ہونٹوں پر گلاب کی پیاس سی ہیں۔ رابرٹ لانگ نے اپنی آنکھوں کو دوبارہ ملا۔ بجمہ مسلکا نی۔

مکشیری سے آئی نہیں؟ مولیٰ عورت نے طلسہ کو توڑتے ہوئے کہا۔ مکشیری کا نام تو تم نے سُٹا ہو گا، جوان چتماری یہ، ایں، اور داں کا جھگڑا چکاری ہے۔ بڑی اچھی جگہ ہے سیب انگور، ناش پاتیاں اور.....

رابرٹ کے دل کے ساتھ اب اس کے صحافتی دماغ نے بھی ایک شدید کروٹ لی۔ اس نے سوچا کہ شاید اُج کی رات اس پر مسلکہ کشیر کے کچھ راز بھی آشکار ہوں۔ شاید کل صبح وہ اپنے اخبار کو ایک ایسا تاریخی ڈسیج ارسال کر کے جس سے اس زین الاقوامی گلتھی کو سلب چھانے میں ایک نئی شاہراہ کا نشان مل سکے، شاید.....

”پچاس روپے؟“ مولیٰ عورت نے بندی بچنے والے کی طرح قیمت کا اعلان کر کے

اس کمرے کے طلسم کو ایک بار پھر توڑوا لा۔

بچاں روپے

بند!

نجہ!

کشیر!

یوراین، او

اور امریکی نامہ تکارا پنا تاریخی دسیع تیار کرنے میں مشغول ہو گیا۔